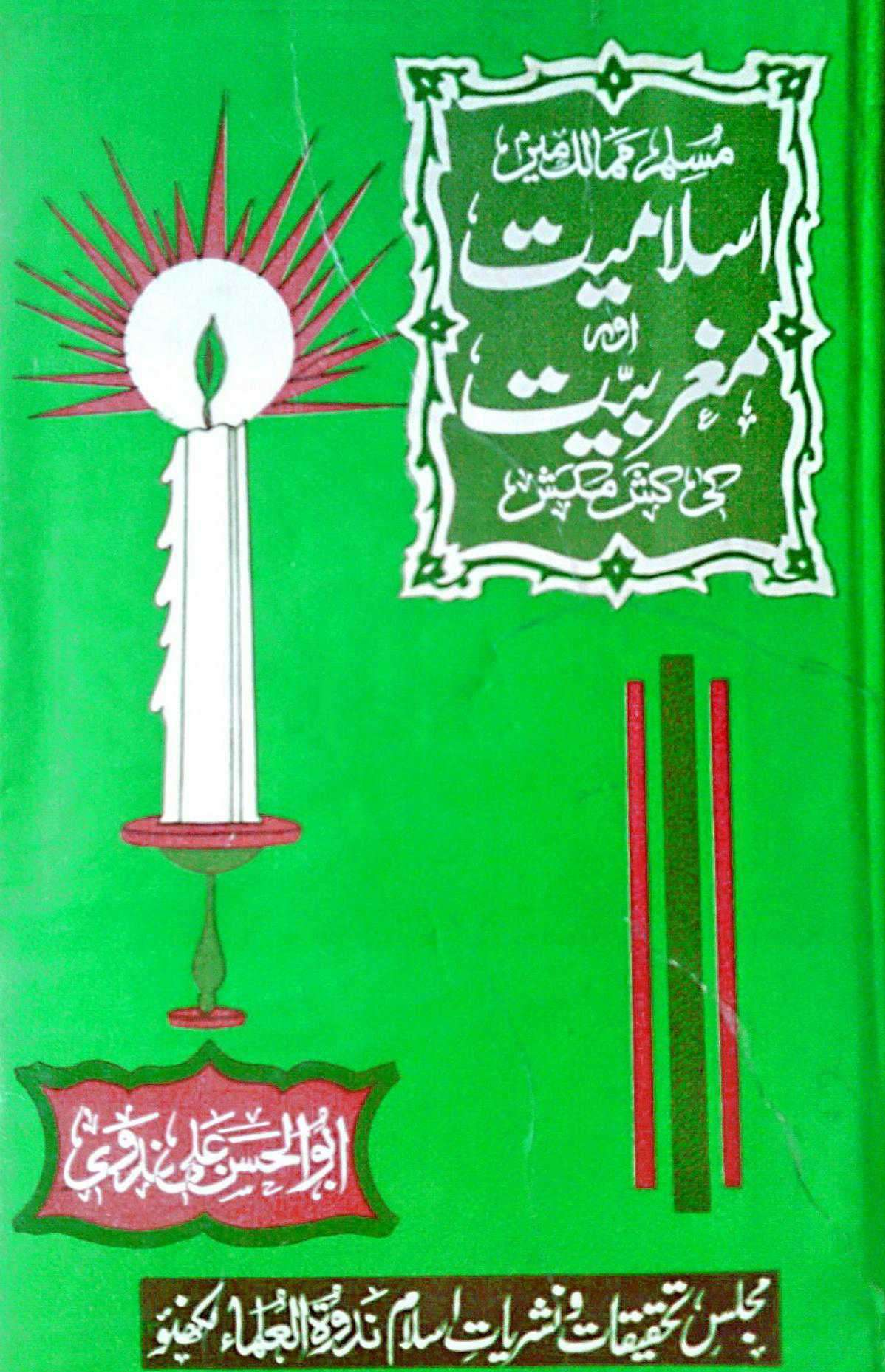
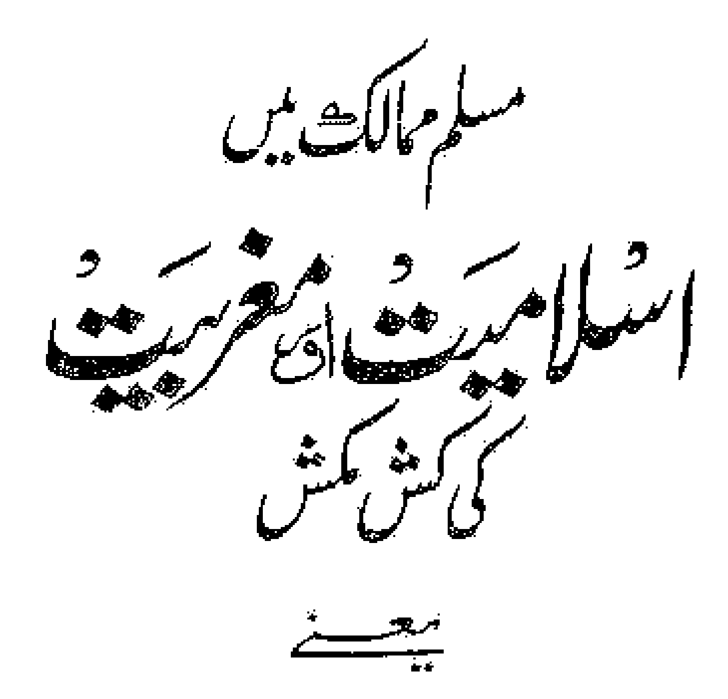

مسلم ممالک میں
اسلامیت
اور
مغربیت
کی کشمکش
ابو الحسن علی ندوی
مجلس تحقیقات و نشریات اسلام ندوۃ العلماء لکھنؤ
www.besturdubooks.wordpress.com

سلسلۂ مطبوعات مجلس
۲۳



وقت کے سب سے بڑے چیلنج "مغربی تہذیب کی کامل پیروی، زندگی کی شرط اور ترقی و طاقت کی واحد راہ ہے" کو دنیائے اسلام نے کس طرح قبول کیا، اور مختلف اسلامی ممالک نے کیا کیا موقف اختیار کئے اور عالم اسلام کے لئے اس بارہ میں صحیح راہ عمل کیا ہے؟

○ جائزہ ○ محاسبہ ○ مشورہ

تالیف

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

تیسرا ایڈیشن اہم اضافوں و ترمیمات کے بعد

۱۴۰۱ھ — ۱۹۸۱ء

کتابت ———— ظہیر احمد کاکوروی

طباعت ———— لکھنؤ پبلشنگ ہاؤس لکھنؤ

صفحات ———— ۳۴۴

قیمت ————

باہتمام

محمد غیاث الدین ندوی

طابع و ناشر

مجلس تحقیقات و نشریات اسلام پوسٹ بکس ۱۱۹ لکھنؤ

(دار العلوم ندوۃ العلماء)

فہرست عناوین

"مسلم ممالک میں اسلامیت و مغربیت کی کشمکش"

عالم اسلام میں مصر کے کردار کی اہمیت

مغربیت کے عالمگیر رجحان کے اسباب اور ان کا علاج
۲۴۱-۲۷۶

عالم اسلام کا مستقل و مجتہدانہ کردار
۲۷۷-۳۰۳

حرف آخر ۳۰۴-۳۱۶

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدمۂ طبع سوم

الحمد للہ! مصنف کی کتاب "مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش" کے طبع سوم کی نوبت آگئی، ہر مصنف کی طرح اس کتاب کے مصنف کا دل بھی کتاب کی اشاعت و مقبولیت سے قدرتی طور پر مسرور اور مالک حقیقی کے شکر کے جذبہ سے معمور و مخمور ہے، ہر مصنف کو شاعر کی طرح (جس کو اپنی ہر غزل عزیز ہوتی ہے) اپنی ہر تصنیف اہم اور مفید معلوم ہوتی ہے لیکن اس کے کہنے میں کوئی باک نہیں کہ اس کی نظر میں یہ کتاب بہت اہم، فکر انگیز اور توجہ طلب ہے، اس لئے کہ وہ ایک ایسے مسئلہ پر لکھی گئی ہے، جو وقت کا اہم ترین اور نازک ترین مسئلہ ہے، طبع اول کے "حرف آغاز" میں لکھا گیا تھا کہ:۔

> "میرے نزدیک یہی اس وقت مسلم ممالک کا سب سے بڑا اور حقیقی مسئلہ ہے اور اسی سوال کے جواب پر (کہ مغربی تہذیب کے بارے میں یہ ممالک کیا رویہ اختیار کرتے ہیں اور اپنے معاشرے کو موجودہ زندگی سے ہم آہنگ بنانے اور زمانے کے قاہر تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے کون سی راہ اختیار کرتے ہیں اور اس میں کس حد تک ذہانت جرأت کا ثبوت دیتے ہیں) اس بات کا انحصار ہے کہ دنیا کے نقشے میں ان قوموں کی نوعیت کیا قرار پاتی ہے اور ان ملکوں میں اسلام کا کیا مستقبل ہے؟"

مصنف کی دوسری تصانیف کی طرح جن میں سے بعض بعض کے دس اور دس سے زیادہ ایڈیشن بھی نکل چکے ہیں اس عرصہ میں اس کتاب کے بھی تین سے زیادہ ایڈیشن نکل سکتے تھے لیکن مصنف کی کتابوں میں اس کتاب کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ ہر ایڈیشن کے وقت اس پر نظر ثانی اور ان ممالک کی تبدیلیوں کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے، جن کا اس کتاب میں ذکر آیا ہے، اس لئے کہ یہ ممالک بھی سفر میں ہیں، تبدیلی و ارتقاء کا عمل

ان میں جاری ہے، نئی تحریکیں اور کوششیں اور طاقتور فکری اور سیاسی عوامل (FACTORS) کام کرتے رہتے ہیں، اور مصنف کے لئے اپنی بڑھی ہوئی مصروفیتوں اور مستقل دروزافزوں ذمہ داریوں کی بنا پر ان تبدیلیوں کا جائزہ لینا آسان نہیں تھا، اس عرصہ میں مصر، یمن، لیبیا، الجزائر، افغانستان، میں دور رس تبدیلیاں وقوع میں آئیں اور پاکستان، ایران میں بھی بنیادی تبدیلیاں اور انقلابات رونما ہوئے، ان تبدیلیوں کے تذکرے کے بغیر اگر یہ کتاب شائع ہو جاتی تو وہ آوٹ آف ڈیٹ (OUT OF DATE) معلوم ہوتی، اور باخبر پڑھنے والے تشنگی اور خلاء محسوس کرتے، مصنف ان تبدیلیوں اور انقلابات کا سنجیدہ اور حقیقت پسندانہ جائزہ لینے کے لئے فرصت کا منتظر تھا، اور اسی میں اس کے نئے ایڈیشن کی اشاعت میں غیر معمولی تاخیر ہوئی، بالآخر اس کو یہ کام اپنے ان عزیز اور سعادت مند رفقائے کار کے سپرد کرنا پڑا، جن کا مطالعہ تازہ اور جن کی واقفیت ان ممالک سے قریبی اور براہ راست معلومات کے ذریعہ ہے، چنانچہ ان تغیر پذیر ممالک پر اس کے ان عزیزوں نے نوٹ لکھے اور مصنف نے ان پر نظر ڈال کر ان کو کتاب میں شامل کیا، یہ کام اس کے ان تین عزیزوں نے انجام دیا جو اس کے علمی اور تصنیفی کاموں میں معاون رہا کرتے ہیں، یعنی برادر زادہ عزیز سید محمد الحسنی[1] مدیر رسالہ "البعث الاسلامی" (عربی) اور خواہر زادگان عزیز مولوی سید محمد رابع حسنی ندوی اور مولوی سید محمد واضح حسنی ندوی (مدیران "الرائد" سلمہما اللہ تعالیٰ) مصنف ان عزیزوں کا شکر گزار اور ان کے حق میں دعا گو ہے، اور اب اس کو یہ اطمینان ہو گیا ہے کہ یہ کتاب ان ممالک کے بارے میں اپٹوڈیٹ (UPTODATE) ہے، ولعل اللہ یحدث بعد ذلك أمرا۔

اس عرصہ میں اس کتاب کے عربی اور انگریزی کے بھی متعدد ایڈیشن نکلے، امید ہے کہ یہ کتاب اسی شوق و دلچسپی سے پڑھی جائیگی جیسے کہ یہ شروع میں پڑھی گئی، اور اپنے اس مقصد کو پورا کرے گی جس کے لئے یہ لکھی گئی۔

دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

ابوالحسن علی
۲؍صفر ۱۳۹۰ھ - ۱۵؍اپریل ۱۹۷۰ء

[1] افسوس ہے کہ ۱۴؍جون ۱۹۷۹ء کو اس نابغہ جوان سال نے ۴۴ سال کی عمر میں چند گھنٹوں کی مختصر علالت کے بعد انتقال کیا۔ رحمہ اللہ تعالیٰ و غفرلہ۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

طبع دوم

الحمد للہ والصلوٰۃ والسلام علی رسول اللہ

مصنف کتاب اللہ تعالیٰ کی حمد میں رطب اللسان ہے کہ کتاب "مسلم ممالک میں اسلامیت و مغربیت کی کشمکش" میں اس کو ضروری اور مفید اضافے کرنے کی توفیق ملی اور اس کے دوسرے اڈیشن کی نوبت آگئی، یہ کتاب عربی میں "الصراع بین الفکرۃ الاسلامیۃ والفکرۃ الغربیۃ فی الأقطار الاسلامیۃ" کے نام سے پہلی مرتبہ ۱۹۶۵ء (۱۳۸۵ھ) "دار الفکر" بیروت کی طرف سے اور دوسری مرتبہ "الدار الکویتیہ" کویت کی طرف سے جس کا نام اب "دار القلم" ہے ۱۹۶۸ء میں شائع ہوئی، عنقریب اس کا تیسرا اڈیشن مؤخر الذکر ادارہ کی طرف سے شائع ہونے والا ہے، طباعت کی دشواریوں اور اشاعت کی سست رفتاری کی وجہ سے (کم سے کم ناچیز مصنف کی تصنیفات کے سلسلہ میں) اردو زبان، عربی سے ہمیشہ پیچھے رہتی ہے، ورنہ اس عرصہ میں اردو کے بھی متعدد اڈیشن شائع ہو جانے چاہئے تھے، آخری عربی اڈیشن میں جو اضافے کئے گئے تھے، وہ بعض جدید اضافوں کے ساتھ اب اس نئے اردو اڈیشن میں شامل کئے جا رہے ہیں، اس طرح یہ اڈیشن پہلے اردو اڈیشن کے مقابلہ میں جو ۱۹۶۴ء میں شائع ہوا تھا، زیادہ مفید و وقیع اور تازہ (UPTO DATE) ہے، کتاب کے آخر میں "حرف آخر" کے عنوان سے

ایک مضمون کا اضافہ کیا گیا ہے جس میں کتاب کی پوری روح اور خلاصہ آگیا ہے۔

اسی عرصہ میں کتاب کا انگریزی ترجمہ بھی (WESTERN CIVILIZATION ISLAM AND-MUSLIMS) کے نام سے شائع ہوگیا اور اعلیٰ انگریزی داں حلقہ میں ذوق وشوق اور قدر کے ساتھ پڑھا گیا، بہت سے اہل ذوق واہل نظر کا احساس ہے کہ فکر و نظر اور مسلمانوں میں احساس خودی پیدا کرنے اور ان کی شخصیت کو ابھارنے کے جس سلسلہ کا آغاز عربی میں "ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین" اور اردو میں "انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر" سے کیا گیا تھا، اس کی اس کتاب کے ذریعہ تکمیل کی گئی، اس طرح وہ اس سلسلہ کی پہلی اور یہ اس کی دوسری کڑی ہے، پہلی کتاب کا اختتام اقبال کے اس مصرعہ پر کیا گیا تھا۔

معمار حرم باز بہ تعمیر جہاں خیز

اب اس کتاب میں بتایا گیا ہے کہ عالم کی تعمیر نو میں اب کن حقائق وواقعات کا لحاظ اور کن پہلوؤں کی رعایت کرنی ہوگی اور یہ کام خود اپنے ملکوں میں جو حرم کی دیوار کے زیر سایہ ہیں، کتنا پیچیدہ اور کتنا ضروری ہوگیا ہے؟ اگر اہل حرم کو اس کام کی عظمت و ضرورت کا کسی درجہ میں احساس ہوگیا تو مصنف کی آرزو برآئی اور اس کی کوشش رائیگاں نہ گئی۔ ورنہ ؎

یک حرف "کاشکے" است کہ صد جا نوشتہ ایم

ابوالحسن علی ندوی

دائرہ شاہ علم اللہ رائے بریلی

۱۹ ربیع الثانی ۱۳۹۰ھ

۲۴ جون ۱۹۷۰ء

حرفِ آغاز

اس وقت تقریباً تمام مسلمان ممالک میں ایک ذہنی کشمکش اور شاید زیادہ صحیح الفاظ میں ایک ذہنی معرکہ برپا ہے، جس کو ہم اسلامی افکار و اقدار اور مغربی افکار و اقدار کی کشمکش یا معرکہ سے تعبیر کر سکتے ہیں، ان ملکوں کی قدیم تاریخ، مسلم اقوام کی اسلام سے گہری وابستگی اور محبت اور جس نام پر جنگِ آزادی لڑی اور جیتی گئی یا جس طاقت کے سہارے ان ملکوں کی آزادی کی حفاظت کی گئی، سب کا دعویٰ ہے کہ اس سرزمین پر صرف اسلامی افکار و اقدار کا حق ہے، اور یہاں صرف اس مسلکِ زندگی کی پیروی جائز ہے جس کی اسلام نے دعوت دی ہے۔ لیکن اس کے برعکس جس طبقہ کے ہاتھ میں اس وقت ان ممالک کی زمام کار ہے، اس کی ذہنی ساخت، اس کی تعلیم و تربیت اور اس کی ذاتی و سیاسی مصالح کا تقاضا ہے کہ ان ممالک میں مغربی افکار و اقدار کو فروغ دیا جائے اور ان ممالک کو مغربی ممالک کے نقشِ قدم پر چلایا جائے، اور جو دینی تصورات، قومی عادات، ضوابطِ حیات اور قوانین و روایات اس مقصد میں مزاحم ہوں، ان میں ترمیم و تنسیخ کی جائے اور بالاختصار یہ کہ ملک و معاشرہ کو تدریجی طور پر (لیکن عزم و فیصلہ کے ساتھ) "مغربیت" کے سانچے میں ڈھال لیا جائے۔

اس سلسلہ میں بعض ممالک اس سفر کی متعدد منزلیں طے کر چکے ہیں اور اپنی منزلِ مقصود پر

یا تو پہنچ گئے ہیں یا اس کے قریب ہیں، اور بعض ممالک ابھی "دور اہے" پر ہیں، لیکن آثار و شواہد صاف بتا رہے ہیں کہ۔

دل کا جانا ٹھہر رہا ہے صبح گیا یا شام گیا

میرے نزدیک یہی اس وقت مسلم ممالک کا سب سے بڑا اور حقیقی مسئلہ ہے، یہ مسئلہ نہ فرضی ہے نہ خیالی، مسلم ممالک کی اندرونی کمزوریوں اور مغربی تہذیب کے نفوذ و استیلاء کی کیفیت نے (جس کی نظیر تہذیبِ انسانی کی تاریخ میں مشکل سے ملے گی) ممالک کے مادی و سیاسی اقتدار نے سارے مسلم ممالک کے سامنے اس مسئلہ کو نہایت روشن سوالیہ نشان بنا کر کھڑا کر دیا ہے جس کا جواب سب کو دینا ہے، اور اس سگنل کے بغیر کسی ملک کی گاڑی آگے نہیں بڑھ سکتی، مغربی تہذیب کے بارے میں یہ ممالک کیا رویہ اختیار کرتے ہیں، اور اپنے معاشرہ کو موجودہ زندگی سے ہم آہنگ بنانے اور زمانہ کے قاہر تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے کون سی راہ اختیار کرتے ہیں، اور اس میں کس حد تک ذہانت و جرأت کا ثبوت دیتے ہیں؟ اسی سوال کے جواب پر اس بات کا انحصار ہے کہ دنیا کے نقشہ میں ان قوموں کی نوعیت کیا قرار پاتی ہے، ان ملکوں میں اسلام کا کیا مستقبل ہے، اور وہ اس زمانہ میں اسلام کے عالمگیر و ابدی پیغام کے لئے کہاں تک مفید ہو سکتے ہیں۔؟

اس بات کی عرصہ سے ضرورت محسوس کی جا رہی تھی کہ اس مسئلہ کا علمی و تاریخی جائزہ لیا جائے، اس سلسلہ میں جتنا کام ہوا ہے، اس پر ایک بے لاگ مورخ اور ایک حقیقت پسند مفکر کی حیثیت سے نظر ڈالی جائے، اور افراط و تفریط سے بچ کر اس کا تجزیہ کیا جائے، اسی کے ساتھ یہ بتایا جائے کہ اسلامی معاشرہ کے لئے (جس کے لئے نہ صرف اسلام کے عقائد و اخلاق اور نظریۂ حیات کی پابندی ضروری ہے بلکہ اپنے منصب کے لحاظ سے دعوت و امامت اور احتساب کائنات بھی اس کا فریضہ ہے) ترقی کرنے اور زندگی کے رواں دواں قافلہ

کے ساتھ جانے کے لئے صحیح اور معتدل راہ کیا ہے؟ آج تمام مسلم ممالک کو بالخصوص نئے آزاد ہونے والے اسلامی ممالک کو سب سے زیادہ اسی مخلصانہ مشورہ کی ضرورت ہے، اس سلسلہ میں ذرا سی غلطی اور تھوڑی سی بے اعتدالی ان کو کہیں سے کہیں لے جا سکتی ہے۔

یک لحظہ غافل بودم و صد سالہ راہم دور شد

راقم سطور نے اسی جذبے کے ماتحت گذشتہ سال عربی میں ایک بسیط مقالہ کا آغاز کیا جس نے جلد ایک کتاب کی شکل اختیار کر لی، یہ کتاب شعبان ۱۳۸۲ھ (فروری ۱۹۶۳ء) میں "موقف العالم الاسلامی تجاہ الحضارۃ الغربیۃ" (مغربی تہذیب کے بارے میں عالم اسلام کا رویہ) کے نام سے شائع ہو گئی اور ممالک عربیہ کے علمی و دینی حلقوں میں توجہ اور دلچسپی سے پڑھی گئی، متعدد اہل فکر و نظر نے ناچیز مصنف کی ہمت افزائی کی مصنف کی خواہش و فرمائش پر عزیزی مولوی محمد الحسنی مدیر "البعث الاسلامی" نے (جن کو اللہ نے ترجمہ و تحریر کا اچھا سلیقہ عطا فرمایا ہے اور مصنف کتاب کے اسلوب تحریر و طرز فکر سے ان کو خاص مناسبت ہے) اردو میں اس کا ترجمہ کیا، میں نے جب اس ترجمہ پر نظر ثانی شروع کی تو اس میں متعدد جگہ اضافہ و تفصیل کی ضرورت محسوس ہوئی، اس عرصہ میں مسئلہ کے کچھ نئے پہلو سامنے آئے اور کچھ جدید مواد و معلومات مہیا ہوئے اس لئے جابجا اضافے کئے گئے اور کہیں کہیں تبدیلی و ترمیم بھی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کتاب ترجمہ کے بعد تقریباً دوچند ہو گئی اور اس کی علمی قیمت و افادیت میں بھی اسی تناسب سے اضافہ ہوا۔

اس عرصہ میں یورپ کا سفر پیش آ گیا اور اس تہذیب کو اس کے اصل مرکزوں میں دیکھنے کا موقع ملا جس پر اس کتاب میں بہت کچھ اظہار خیال کیا گیا ہے، نیز ان جدید علمی مرکزوں میں بعض نئی مطبوعات و مآخذ دستیاب ہوئے جن سے استفادہ کیا گیا، اب ان تمام اضافات و اصلاحات کے ساتھ یہ کتاب "مسلم ممالک میں اسلامیت و مغربیت کی کشمکش" کے نام سے

شائع کی جارہی ہے، امید ہے کہ جس طرح عربی ایڈیشن عرب ممالک میں توجہ و دلچسپی سے پڑھا گیا یہ کتاب ان ممالک میں جہاں اردو سمجھی اور بولی جاتی ہے، توجہ اور دلچسپی کے ساتھ پڑھی جائے گی، انشاء اللہ اس کا انگریزی ایڈیشن بھی شائع ہوگا۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمارے اسلامی ممالک کے قائدین اور ارباب اختیار کو اپنی نازک و عظیم ذمہ داری کو سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے، اور وہ اس سے صحیح طور پر عہدہ برآ ہوں۔

آخر میں ڈاکٹر محمد آصف قدوائی اور حکیم عبدالقوی صاحب کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں، جن سے بعض طویل اقتباسات کے ترجمہ میں بیش قیمت مدد ملی۔

ابوالحسن علی ندوی

۲۴ اکتوبر ۱۹۶۳ء

۱۰ کونس وے، لندن

مغربی تہذیب کے بارے میں بعض

ممالک کا

منفی یا غیر جانبدارانہ رویّہ

عالمِ اسلام مغربی تہذیب کی زد میں

انیسویں صدی عیسوی کے وسط میں عالم اسلام کو ایک بہت ہی نازک، پیچیدہ، اور اہم مسئلہ کا سامنا کرنا پڑا، اس مسئلہ کے بارے میں اس کے صحیح رویہ اور نقطۂ نظر ہی پر ایک مستقل اور آزاد دنیا کی حیثیت سے اس کی شخصیت اور وجود کا انحصار تھا۔

یہ تازہ دم، زندگی اور نشاط، حوصلہ وعزم اور ترقی و وسعت کی صلاحیت سے بھرپور مغربی تہذیب کا مسئلہ تھا، جس کا شمار تاریخ انسانی کی طاقت ور ترین اور وسیع ترین تہذیبوں میں کیا جانا چاہئے، اور جو درحقیقت (اگر غائر نظر سے دیکھا جائے) ان اسباب وعوامل کا ایک قدرتی نتیجہ ہے، جو عرصہ سے تاریخ میں اپنا کام کر رہے تھے، اور مناسب وقت پر اس نئی شکل میں ظاہر ہونے کے منتظر تھے۔

عالم اسلام سب سے زیادہ اس خطرہ کی زد میں تھا، اس لئے کہ کارگاہ حیات سے قدیم مذاہب کی کنارہ کشی کے بعد اسلام دینی واخلاقی دعوت کا تنہا علمبردار، اور معاشرۂ انسانی کا واحد نگراں اور محتسب رہ گیا تھا، بہت سے وسیع، سیرحاصل، اور زرخیز ممالک اسی رقبہ میں واقع تھے، چنانچہ اس مادی اور میکانکی تہذیب کے چیلنج کا رخ بہ نسبت کسی دوسری قوم اور معاشرہ کے زیادہ تر عالم اسلام ہی کی طرف رہا۔

ملی جلی تہذیب

یہ تہذیب اپنی وسیع شکل میں عقائد و خیالات، فکری نظاموں، سیاسی و اقتصادی فلسفوں، اجتماعی، طبعی اور عمرانی علوم نیز ان مخصوص تجربوں کا عجیب و غریب مجموعہ تھی جو مغربی اقوام کو اپنے ارتقا کے طویل سفر کے مختلف مراحل میں پیش آئے تھے، یہ تہذیب عام طور پر علم انسانی اور خاص طور پر طبعی، میکانکی اور ریاضی علوم کی ترقی کا ایک ناگزیر مرحلہ اور مفکرین اور ماہرین طبعیات کی مسلسل کوششوں اور تجربات کا نچوڑ اور خلاصہ تھا، اس اعتبار سے وہ مختلف اجزا و عناصر کا ایک ایسا مجموعہ تھا، جس کے متعلق کوئی یکساں رائے قائم نہیں کی جا سکتی تھی۔

اس تہذیبی مجموعہ میں ناقص اجزا بھی تھے اور مکمل بھی، مضر بھی اور مفید بھی، صحیح بھی اور غلط بھی، اس میں علم کے ان بدیہیات کے ساتھ جو ہر شبہہ سے بالاتر ہیں ایسے غلط قیاسات، خیالات و افکار اور بزعم خود ایسے فیصلے بھی شامل تھے، جن میں بحث و مباحثہ اور غور و خوض کی پوری گنجائش موجود ہے، ان میں ایسے علمی نتائج بھی تھے، جو بڑے غور و خوض اور مطالعہ و تجربہ کا نچوڑ تھے اور ایسے بھی تھے، جن کے متعلق کچھ کہنا قبل از وقت تھا، وہ اجزا اور عناصر بھی تھے، جو کسی خاص ملک و قوم کے ساتھ مخصوص نہیں، مثلاً تجربی علوم اور وہ بھی جن میں مغربی تہذیب کی مقامی روح پوری طرح نمایاں تھی، اور مغربی ماحول اور معاشرہ کا ان پر گہرا اثر تھا، اور وہ ان تاریخی انقلابات اور حوادث کا نتیجہ تھے، جن سے مغربی اقوام کو اپنے دائرۂ عمل اور مرکز میں گزرنا پڑا، وہ بھی تھے، جن کا دینی عقائد سے گہرا تعلق تھا، اور وہ اجزا بھی تھے، جن کو سرے سے مذہب سے کوئی سروکار نہ تھا۔

اس تہذیبی مرکب نے اس مسئلہ کی پیچیدگی اور اہمیت کو بہت بڑھا دیا ہے، اور عالم اسلام کو ایک نازک و دشوار پوزیشن میں لا کھڑا کیا ہے، اور اس کے رہنماؤں اور مفکرین کی ذہانت کے لئے ایک

امتحان بن گیا ہے۔

منفی رویّہ

اس نئی اور پیچیدہ صورتِ حال سے نپٹنے کے لئے قدرتی طور پر تین موقف (رویّے) ہو سکتے ہیں۔
پہلا موقف یا رویہ منفی اور سلبی (NEGATIVE) ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ عالم اسلام اس تہذیب کے سارے نتائج اور فوائد کا یکسر انکار کر دے اور اس کی کوئی اچھی بری بات سننے کا روادار نہ ہو یا غیر جانبداری اختیار کر کے کنارہ کش ہو جائے نہ اس سے کسی قسم کا فائدہ اٹھائے نہ ان علوم کو ہاتھ لگانے پر تیار ہو جن میں اہلِ مغرب کو تفوق و امتیاز حاصل ہے، طبعیات، ریاضیات اور ٹکنالوجی جیسے علوم میں بھی وہ مغرب سے استفادۂ علمی کو حرام اور اپنے لئے "شجرۂ ممنوعہ" سمجھے اور جدید آلات، مشینیں، ساز و سامان اور ضروریاتِ زندگی کے قبول کرنے سے بھی گریز کرے۔

اس موقف کی طبعی اور شرعی حیثیت اور اس کے نتائج!

اس موقف کا قدرتی نتیجہ عالم اسلام کی پسماندگی اور زندگی کے رواں دواں قافلہ سے بچھڑنے کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا، اس سے عالمِ اسلام کا رشتہ باقی دنیا سے منقطع ہو جائے گا اور وہ ایک محدود و حقیر جزیرہ بن کر رہ جائے گا جس کا گرد و پیش کی دنیا سے کوئی پیوند نہیں ہوگا سمندر میں ایسے بے شمار جزیرے ہو سکتے ہیں، لیکن خشکی میں اس طرح کے جزیروں کی گنجائش نہیں اور فطرتِ انسانی سے (جو اپنے ماحول سے کم و بیش متاثر و مستفید ہوتی ہے) جنگ کبھی کامیاب نہیں ہوتی۔
ان سب حقائق کے علاوہ یہ رویہ کوتاہ نظری پر بھی مبنی ہے، اس سے فطری قوتوں اور وسائل میں تعطل پیدا ہوتا ہے اور یہ اس دینِ فطرت کی صحیح ترجمانی اور تعبیر نہیں ہے جس نے کائنات میں

عقل و تدبّر کے استعمال پر بڑا زور دیا ہے اور مفید علوم میں استفادہ کی ترغیب دی ہے جس نے دین کی حفاظت و دفاع کے لئے اور بد اندیشوں اور حریفوں کو اپنے اوپر حملہ کرنے سے محتاط رکھنے کے لئے اپنے پیروؤں کو ہر ممکن تیاری کا حکم دیا ہے قرآن مجید میں اللہ تعالےٰ فرماتا ہے :-

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ	بلاشبہ آسمان و زمین کی خلقت میں اور رات اور دن
وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ	کے ایک کے بعد ایک آتے رہنے میں ارباب دانش کے لئے
لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ○ الَّذِیْنَ یَذْكُرُوْنَ	(معرفت حق کی) بڑی ہی نشانیاں ہیں وہ ارباب
اللّٰهَ قِیٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِهِمْ	دانش جو کسی حال میں اللہ کی یاد سے غافل نہیں ہوتے
وَیَتَفَكَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ	کھڑے ہوں بیٹھے ہوں لیٹے ہوں لیکن ہر حال میں اللہ کی یاد
وَالْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا	ان کے اندر بسی ہوتی ہے) اور جن کا شیوہ یہ ہوتا ہے کہ
بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ	آسمان و زمین کی خلقت پر غور کرتے ہیں (اس ذکر و
النَّارِ ○ (سورۂ آل عمران ۱۹۰، ۱۹۱)	فکر کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ان پر معرفت حقیقت کا

دروازہ کھل جاتا ہے وہ پکار اٹھتے ہیں) اے ہمارے پروردگار یہ سب کچھ جو تو نے پیدا کیا ہے سو بلاشبہ بیکار و عبث نہیں پیدا کیا ہے یقیناً تیری ذات اس سے پاک ہے کہ ایک فعل عبث اس سے صادر ہو۔ خدایا ! ہمیں عذاب آتش سے (جو دوسری زندگی میں پیش آنے والا ہے) بچا لیجیو !

دوسری جگہ قرآن شریف میں ہے :-

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ	اور (مسلمانو) جہاں تک تمہارے بس میں ہے قوت
قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَیْلِ تُرْهِبُوْنَ	پیدا کرکے اور گھوڑے تیار رکھ کر دشمنوں کے مقابلے کے
بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ	لئے اپنا ساز و سامان مہیا کئے رہو کہ اس طرح مستعد
(سورہ الانفال ۶۰)	رہ کر تم اللہ کے اور اپنے دشمنوں پر دھاک بٹھائے رکھوگے

حدیث شریف میں آتا ہے :-

الکلمۃ الحکمۃ ضالۃ المؤمن فحیث   حکمت کی بات مؤمن کا گم شدہ مال ہے، جہاں
وجدھا فھو احق بھا (ترمذی: ابواب العلم)   بھی وہ اس کو ملے وہ اسی کا حق ہے!

اسلام نے انسان کو اس سرزمین پر اللہ تعالیٰ کا خلیفہ قرار دیا ہے، جس کے لئے بحر و بر، شمس و قمر اور لیل و نہار کو مسخر کر دیا ہے، انسان نے زبانِ قال یا زبانِ حال سے جس ضرورت کا بھی اظہار کیا، وہ اس کو عطا کی گئی ہے[1]، خدا نے اپنے بندوں پر اپنا یہ احسان جتایا ہے کہ اس نے ان کے لئے فولاد پیدا کیا جس میں بڑی مضبوطی ہے اور انسانوں کے لئے بہت سے فوائد ہیں[2]، جنگی تیاری اور سامانِ جنگ کی طرف توجہ کے سلسلہ میں امت مسلمہ کے لئے اس کے رسول (صلے اللہ علیہ وسلم) نے خود اپنی عملی مثال پیش کی، غزوۂ احزاب میں اہلِ ایران کے طریقہ پر آپ نے خندق کھودی، آپ کے بعد اسی مثال پر اہلِ علم اور فقہاء کاربند رہے، وہ ان معاملات میں زمانہ کے ساتھ چلتے تھے، اور جنگی تیاریوں، آلاتِ حرب کے استعمال، اپنے استحکام اور مفید علوم کے حصول کے لئے وہ دوسری اقوام کے شانہ بشانہ بلکہ ان سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے، اور بعض اوقات انھوں نے ان میدانوں میں اپنے تفوق اور امامت کا نقش قائم کر دیا۔

اگر دنیا کا کوئی ملک چشم و گوش بند کر کے تہذیب جدید کے زبردست چیلنج کو نظر انداز کرنے کی کوشش کرتا ہے یا اس کو یکقلم مسترد کر کے چین کی نیند سونا چاہتا ہے، اور اپنی محدود دنیا سے باہر نکلنے پر کسی طرح آمادہ نہیں ہوتا تو وہ ملک زیادہ دنوں تک معتدل و پرسکون حالت پر قائم نہیں رہ سکتا، اس کو مسلسل بغاوتوں اور انقلابات کا سامنا کرنا ہوگا، اس کے مختلف گوشوں میں نافرمانی اور مخالفت

---

[1] "إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً" (البقرۃ: ۳۰) "اَللّٰهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ وَأَنْزَلَ" الخ (ابراھیم: ۳۲، ۳۳، ۳۴)

[2] "وَأَنْزَلْنَا الْحَدِيدَ فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ" (الحدید: ۲۵)

کی شدید تحریکیں اٹھ کھڑی ہوں گی، اس لئے کہ یہ رویہ اور موقف اس فطرتِ انسانی کے بالکل خلاف ہے، جو ہمیشہ آگے کی طرف دیکھتی ہے، جو ہر نئی چیز کی طلبگار رہتی ہے اور کسی حال میں بھی اس کی سیری نہیں ہوتی، عزت و سربلندی، قوت و طاقت اور تجدید و احیاء کی محبت اس کی رگ و پے میں ہے، وہ ہر لحظہ ایک نئی منزل کی تلاش میں اور نئی ترقی کی تمنا میں نظر آتی ہے ایک نہ تھکنے والی آرزو اور یاس نا آشنا امید و حوصلہ مندی۔

اسی کے ساتھ یہ موقف قانونِ تکوینی اور اس کائنات کے مزاج کے بھی سراسر خلاف ہے اگر کوئی ملک زبردستی اس خلافِ فطرت موقف کو اختیار کرنا چاہے گا تو یہ تہذیب اس کے گھروں میں اور اس کے خاندانوں میں اس طرح داخل ہو جائے گی جس طرح سیلاب سے گھرے ہوئے کسی گاؤں یا شہر میں پانی بغیر کسی اطلاع اور آگاہی کے داخل ہو جاتا ہے، اور ہر طرف سے اس کو گھیر لیتا ہے۔

علیحدگی پسندی اور کنارہ کشی کا نتیجہ!

اگر کبھی عالمِ اسلام کا کوئی ملک (اپنی زندگی کے کسی دور میں) تہذیب جدید سے محفوظ رہا اور اس کا دامن اس کے خیر و شر کسی سے آلودہ نہ ہو سکا اور وہ اس تہذیب کے مفید علوم اور وسائل تک سے دست کش ہو کر اپنی محدود دنیا میں محصور رہا تو یہ وقفہ زیادہ طویل عرصہ تک کبھی قائم نہ رہ سکا اور اس تہذیب و تمدن کی لہریں (جو دلوں کی گہرائیوں اور معاشرہ کی جڑوں تک میں سرایت کر جاتی ہیں، اور سارے اخلاقی اصول اور قدریں اپنے ساتھ بہالے جاتی ہیں) برابر اس سے ٹکراتی رہیں اور اس کے سکون اور خواب راحت کو برہم کرتی رہیں۔

ہر ذی عقل شخص جو اس مغربی تہذیب کی تاثیر و تسخیر اور قوت و وسعت سے واقف ہے، اسی کے ساتھ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ مشرقی ممالک روحانی اور مادی حیثیت سے کتنے کمزور ہو چکے ہیں

اور اس قوتِ ایمانی اور خود اعتمادی میں کتنا انحطاط رونما ہوچکا ہے جس سے اس تہذیب کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ کیا جاسکتا تھا، وہ اس اندیشہ میں حق بجانب ہوگا کہ ان ممالک کا یہ تہذیبی، معاشرتی اور تمدنی حصار زیادہ دنوں تک قائم اور اس کا یہ دورِ عزلت طویل عرصہ تک برقرار نہیں رہ سکتا، اس لئے کہ بے اعتمادی، احساس کہتری اور روحانی کمزوری کے ساتھ کوئی قوم زیادہ دنوں تک اپنی انفرادیت باقی رکھ نہیں سکتی، اور ایسی طاقتور تہذیب کا مقابلہ نہیں کرسکتی جس کے ساتھ زمانہ کا رجحان شامل ہوچکا ہے۔

مشہور مغربی فاضل محمد اسد نے (جنھوں نے یورپ میں زندگی گزاری اور عالمِ اسلام کا ایک طویل دورہ کیا) ۱۹۳۲ء میں اس پرسکون جزیرۃ العرب کا سفر کیا تھا جو اس وقت تک اپنی قدیم عربی اور اسلامی روایات پر قائم تھا، مغربی تہذیب ابھی اس میں داخل نہ ہوسکی تھی، اور وسائل اور جدید مصنوعات نے ابھی اس کی ریتیلی دیوار کے حصار کو عبور نہ کیا تھا، انھوں نے یہ سب دیکھ کر اپنے اس شک کا اظہار کرتے ہوئے کہ آیا یہ علیحدگی اور مغربی تہذیب کے اثرات سے بعد اور کنارہ کشی زیادہ دنوں تک قائم رہ سکے گی؟ حسب ذیل الفاظ لکھے تھے :۔

"جب میں غور کرتا ہوا اس حد تک پہونچا تو میں نے اپنے دل میں سوچا کہ زید[1] اور زید کی قوم (عرب) اپنے آپ کو اس خطرہ سے کب تک محفوظ رکھ سکے گی جو ہزار حیلہ و فریب کے ساتھ ان کا محاصرہ کررہا ہے، اور بغیر کسی مروت و رعایت کے عنقریب ان پر مسلط ہونے والا ہے، ہم ایک ایسے زمانہ میں سانس لے رہے ہیں جس میں مشرق بڑھتے ہوئے مغرب کے مقابلہ میں جو ہر طرف سے اس کو بے بس کررہا ہے خاموش اور غیر جانبدار تماشائی بن کر باقی نہیں رہ سکتا، ہزاروں سیاسی، اجتماعی اور اقتصادی قوتیں اس وقت عالم اسلام کے دروازے پر دستک دے رہی ہیں کیا عالمِ اسلام، مغربی تہذیب کے سامنے ہتھیار ڈالے کر اس اختلاط و مقابلہ کے نتیجہ میں نہ صرف یہ کہ اپنی روایاتی شکل کھودے گا بلکہ اپنی

[1] محمد اسد کے عرب رہبر اور رفیق سفر کا نام جو ان کے صحرائی سفر میں ان کے ساتھ تھا۔

روحانی جڑوں اور سرچشموں سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے گا؟"[1]

محمد اسد صاحب کا اندیشہ صحیح ثابت ہوا، یہ وقفہ یقیناً طویل نہ ہو سکا، کچھ ہی دنوں میں عالمِ اسلام کے اس مقدس مرکز میں مغربی تہذیب فاتحانہ داخل ہو گئی، جدید مصنوعات اور مغربی مال سیلاب کی طرح امنڈ پڑا، سامانِ تعیش اور غیر ضروری اشیاء (LUXURIES) سے بازار پٹ گئے، اور گھر بھر گئے، زندگی کی وہ سادگی و جفاکشی، مردانگی و شہسواری، بلند ہمتی اور حوصلہ مندی کی وہ ساری صفات ناپید ہو گئیں جو قدیم زمانہ سے عربوں کی خصوصیات تھیں۔

جزیرۃ العرب اور مغرب کا یہ نیا تعلق اور رشتہ، تمدن و ثقافت، سیاست اور پٹرول کے راستہ سے ہوا، یہ استفادہ یا خوشہ چینی (جس کا آغاز تہذیب و ثقافت اور تجارت کے میدان میں ہوا) بالکل عاجلانہ اور غیر دانشمندانہ طریقہ پر ہوئی، ان کی پشت پر کوئی متوازن فکر یا کوئی سوچا سمجھا منصوبہ نہ تھا، چنانچہ مغرب کے مقابلہ میں وہ سپر افگندگی جس کا اسد صاحب کو خوف تھا، ایک امرِ واقعہ بن کر سامنے آ گئی اور روایات و عادات اور ظاہری شکلوں کے بعد اب اس ملک کی روحانی جڑیں بھی اس طوفان کی زد میں آ چکی ہیں۔

اس تغیر و انقلاب، جزیرۃ العرب کے پُرسکون و خاموش صحرا میں مغربی مصنوعات و وسائلِ راحت اور سامانِ تعیش کی فراوانی، معیارِ زندگی کے اچانک بلند ہو جانے اور صدیوں کی سادہ و عملی زندگی کے پیچیدہ ہو جانے کو خود اہلِ مغرب محسوس کرتے ہیں اور اس پر تعجب کا اظہار کرتے ہیں، امریکہ کا ایک مصنف (DON PERETZ) اپنی کتاب (THE MIDDLE EAST TODAY) میں لکھتا ہے:-

"دوسری جنگِ عظیم کے بعد سے بہت سے روایتی اثرات تیل کے ذریعہ حاصل ہونے والی دولت (جس کے ساتھ مغربی طاقتوں کے اثرات بھی شامل ہیں) کی وجہ سے ضعیف ہو گئے ہیں،

---

[1] ROAD TO MECCA P. 103, 104

قدیم مشترک تہذیبی ورثہ جس نے مختلف طبقات کو مربوط کر رکھا تھا، اب ختم ہوتا جا رہا ہے، اس لئے کہ شیوخ کے اعلیٰ خاندانوں کے افراد جو تیل کی دولت کے باعث مالا مال ہو چکے ہیں یا وہ مغربی مصنوعات، انوکھی چیزوں، رسم ورواج اور مغربی مذاق سے متاثر ہونے لگے ہیں، اور اس تبدیلی کے علم نے نچلے طبقوں میں بے چینی پیدا کر دی ہے، کیونکہ وہ اس طرح کی ظاہری شان وشوکت کی زندگی بسر کرنے کی قدرت نہیں رکھتے مثلاً بدوی قبائل اب جانوروں کے چرانے اور نگہداشت کرنے کے شغل سے بے دخل ہو کر شہروں کے ارد گرد اکٹھے ہو گئے ہیں، اور وہ روز بروز ان شہروں کے بے چین و غیر مطمئن نچلے طبقہ، عوام کے ہمدرد ہوتے جا رہے ہیں۔[۱]

دوسری جگہ لکھتا ہے:-

"دوسری طرف، دولت کی ناگہاں ریل پیل نے جو انتہائی طاقت و جبروت رکھنے والے سعودی خاندان کے خزانہ میں مجتمع و مرتکز ہو گئی تھی، ساتھ ہی ساتھ ان میں رشوت ستانی، اقربا نوازی اور انتہا درجے کی مالی غیر ذمہ داری بھی پیدا کر دی، تیل سے حاصل ہونے والی دولت کثیر کا بڑا حصہ انتہائی فضول خرچی کے ساتھ برباد کر دیا گیا، اور اس سے اصل نفع شاہی خاندان ہی نے اٹھایا، اس بڑے اور پھیلے ہوئے گروہ میں صرف شاہ اور ان کی اولاد ہی شامل نہیں، بلکہ ان کی بیویاں اور سسرالی رشتہ دار جن کی میزان صدہا تک پہنچتی ہے سب ہی شامل ہیں، ان سب کو اسی دولت کی رقمیں براہ راست ملتی رہی ہیں، اور اب سعودی حکمران خاندان پہلے زمانہ کے صحرا میں حکومت کرنے والے وہابی شیخ کی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ وہ مشرقی شان و شوکت کے ساتھ ہر قسم کے سامان عیش وراحت کے ساتھ زندگی گزارتا ہے، بیسیوں شہزادوں نے فرداً فرداً بڑی بیش قیمت موٹر کاریں خرید لی ہیں، اور ایک سے ایک عالی شان محل تعمیر کرائے ہیں، جو

---

[۱] THE MIDDLE EAST TODAY P. 402

جدید طرز کے سامانِ راحت و تعیش (مثلاً یہ کہ وہ ایر کنڈیشنڈ ہیں، اور ان میں غسل کے لئے جدید قسم کے تالاب بنے ہیں) سے آراستہ و پیراستہ ہیں۔[1]

آگے چل کر وہ مزید لکھتا ہے :۔

"جس جوش و خروش کے ساتھ کسی زمانہ میں وہابی قبائل نے اسلام کے بنیادی اصول کا دفاع کیا تھا، اور اس سلسلہ میں انھوں نے جس سادگی پر زور دیا تھا، وہ اب بالکل غائب ہے اب غیر ملکی سامانِ تعیش کے خلاف تہدید آمیز احتجاج نہیں ہوتے، آج ان سب کو نہ صرف تسلیم کر لیا گیا ہے، بلکہ سوسائٹی کے سب ہی طبقے ان کو حاصل کرنے میں کوشاں نظر آتے ہیں، وہ قبیلے جو پہلے وہابی طرز کی سادہ اور خشک زندگی گزارتے تھے، اب وہ صحرا کا قیام ترک کر کے تیل کے نئے مراکز کے پاس آبسے ہیں، جہاں سکونت اختیار کرنے کے بعد وہ ان مغربی نو ایجاد اشیاء کے خوب عادی اور خوگر ہو گئے ہیں، جنھیں وہ "آرمکو" (ARMCO) میں کام کرنے کے صلہ میں ملنے والی بڑی تنخواہوں سے خریدتے رہتے ہیں۔"[2]

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اگر جزیرۃ العرب کو خود کفیل بنانے کی سنجیدہ کوشش کی جاتی منصوبہ بندی، تنظیم اور ملک کو تعمیری لائنوں پر ترقی دینے اور مستحکم کرنے کی مخلصانہ سعی کی جاتی تو ملک اس بری طرح مغرب کا دست نگر نہ بنتا، اسی طرح اگر مغربی تہذیب پر ناقدانہ و محققانہ نظر ڈالی جاتی اور "خذ ما صفا ودع ما کدر" کے قدیم اسلامی و عربی اصول پر عمل کیا جاتا تو اس طرح وہ ایک سیلاب کی طرح مرکزِ اسلام پر نہ امنڈ آتی، اور صرف اس کا سطحی اور نمائشی پہلو اس کے حصے میں نہ آتا، لیکن اس کے لئے جس دوربینی، صبر و تحمل اور غور و فکر کی ضرورت ہے اس کی اس طبقہ میں کمی تھی جس کو یہ نازک فرض انجام دینا تھا۔

---

[1] THE MIDDLE EAST TODAY P. 406, 407 [2] ایضاً ص۴۰۷

ہم کو مرکزِ اسلام اور دعوتِ اسلام کے اولین گہوارے میں تمدنی یا ثقافتی منصوبہ بندی کی بات کرتے ہوئے یہ نہ بھولنا چاہیے کہ اس کی ایک ابدی اور ممتاز حیثیت و شخصیت بھی ہے جسے اولین مقام ملنا چاہیے، اور تمام پروگراموں اور منصوبوں اصلاح و ترقی کی ساری کوششوں اور زمان و مکان کی تمام رعایتوں کو اس کے تابع اور ماتحت ہونا چاہیے، اور رد و قبول اور مغربی تہذیب اور عصری سہولتوں سے اخذ و استفادہ کے ہر موقع پر اس کی اصلیت ہی کو اساس و اصول بنانا چاہیے، اور اس ثقافتی و تربیتی، تعلیمی و تہذیبی منصوبہ سازی کا ایسا مناسب لباس تیار کرنا چاہیے جو اس کی قامت موزوں پر راست آئے اور اس کی معنوی قدر و قیمت اور اس کے اس پیغام سے مطابقت و مناسبت رکھتا ہو جسے وہ ساری انسانیت تک ہر زمانے میں پہنچانے کا ذمہ دار ہے۔

اسی طرح یہ بات اصول موضوعہ کی طرح طے شدہ رہنی چاہیے کہ جزیرۃ العرب محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا لگایا ہوا باغ اور آپ کی دعوت و محنت کا ثمرہ ہے اس لئے اس پر صرف ان کا، ان کے اصحاب اور ان کی دعوت پر ایمان رکھنے والوں ہی کا حق ہے، اس بنا پر اس جزیرے میں جو اصول اور طرزِ عمل، پروگرام اور منصوبہ اختیار کیا جائے، اس کو اس حقیقت کا آئینہ دار اور اس کے مطابق ہونا چاہیے، اس سرزمین کے لئے ضروری ہے کہ وہ ہر ایسی چیز سے بالکل دور ہو جو اس کی فکری و ایمانی سالمیت کی مخالف ہو اور اس کی شخصیت کو کمزور کرتی ہو، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی دوربین نگاہوں نے مستقبل کے اس خطرے کو دیکھتے ہوئے ہی جزیرۃ العرب سے یہود و نصاریٰ کو باہر کر دینے کی وصیت فرمائی تھی، اور اس سے منع فرمایا تھا کہ وہاں اسلام کے سوا کسی دوسرے دین و مذہب کا وجود ہو[1]، اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ کی یہ پیغمبرانہ و

---

[1] ملاحظہ ہو صحیح مسلم اور حدیث کی کتابیں۔

حکیمانہ وصیت صرف جسمانی طور پر ہی غیر مسلموں کے اخراج پر اکتفا نہیں کرتی بلکہ وہ ان کے ہر قسم کے اثر و رسوخ، اور ان کی دعوت و ثقافت کے اخراج پر مشتمل ہے جسے ہر ذی شعور سمجھ سکتا ہے۔

اس کے علاوہ اس جزیرے میں حرمین شریفین واقع ہیں یہیں وہ بلد امین ہے، جہاں رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم پیدا اور رسالت سے سرفراز ہوئے اور جہاں حج کا فریضہ اور اس کے مناسک ادا کئے جاتے ہیں اسی سرزمین میں وہ محبوب شہر (مدینہ) ہے، جہاں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ہجرت فرمائی، جہاں آپ کی مسجد درس گاہ بنی اور پہلا مثالی اسلامی معاشرہ برپا ہوا اور جہاں سے اسلامی دعوت اور اس کی فتوحات کا آغاز ہوا، یہ ایک عظیم اور ابدی ذمہ داری ہے، اس لئے اس ماحول کو اسلامی زندگی کا صحیح گہوارہ اور اس کا شفاف آئینہ ہونا چاہیے جہاں پہنچ کر ہر شخص کو محسوس ہونا چاہیے کہ وہ اسلام کے گہوارہ میں ہے جہاں اس کے اصل مذاق و مزاج کی جھلک دیکھی جاسکتی ہے کیونکہ اللہ تعالےٰ نے اس سرزمین کو ہمیشہ کے لئے مرکز حج اور مسلمانوں کا سالانہ مرجع و ماویٰ بنا دیا ہے، اس لئے انھیں یہ یقین رکھنے کا پورا حق ہے کہ وہ ایک ایسے شہر کا قصد کر رہے ہیں جو پاکیزگی کا معدن، دین کا گہوارہ، اور اسلام کا اخلاقی و روحانی دارالسلطنت ہے، اور قدرتی طور پر اسلام دشمن رجحانات اور اس کی تعلیم کے مخالف اثرات سے اتنا دور ہے، جس کا عہد حاضر میں تصور کیا جاسکتا ہے، اور اس نے مغربی تہذیب کے آگے عالم اسلام سے دور افتادہ کسی ملک کی طرح ہتھیار نہیں ڈالے جو اس امتیاز اور ذمہ داری کا حامل نہیں۔

اس منصوبہ بندی میں سادگی، اصلیت اور کسی قدر زہد و تقشف کی رعایت بھی رہنی چاہیے جس سے دور دراز مقامات سے آنے والے اس ماحول اور فضا کو محسوس کرسکیں جس میں اگلے مسلمان اپنا حج ادا کرتے تھے، اور ان میں ان جیسا شعور بیدار رہے، ایسا نہ ہو کہ حرم شریف ہی

عبادت و سکینت کا ایک مخصوص جزیرہ بن کر رہ جائے، جس کے ارد گرد مادی تہذیب کا سمندر موجیں مار رہا ہو اور اس کی سرکش لہریں ان کی دیواروں سے ٹکرا رہی ہوں اور بڑھتی چلی آتی ہوں۔

محض معاشرتی روایات اور ملکی رسم و رواج کسی تازہ دم تہذیب کا مقابلہ نہیں کر سکتے

یہ نیم دوریا و قفہ در حقیقت کسی مشرقی ملک میں زیادہ دنوں تک قائم نہیں رہ سکتا اس لئے کہ وہ روایات اور رسم و رواج یا وہ معاشرتی اور تنظیمی ڈھانچہ جس کے پیچھے فہم و بصیرت پر مبنی کوئی طاقتور عقیدہ نہ ہو نیز اس کے ساتھ ذہانت اور ذکاوت اور اس بدلتی ہوئی دنیا کے حقائق پر اسلام کے ابدی اصولوں کے منطبق کرنے کی قابلیت اور تہذیب جدید کے صالح اور مفید اجزا اور غیر صالح اور غیر مفید اجزا میں تمیز کی مکمل صلاحیت نہ ہو، اس تند و تیز تہذیب کے مقابلہ میں زیادہ دیر تک ٹھہر نہیں سکتا، اور اس سے قوم کی حفاظت نہیں ہو سکتی، ہر وہ ملک جو اپنی قدیم روایات کو عزیز رکھتا ہے لیکن ان کو برقرار رکھنے اور ان کی توسیع کی صلاحیت سے محروم اور طاقتور ایمان اور پختہ کار عقل سے عاری ہے، اس کی قسمت میں دیر یا سویر زوال و انحطاط کے سوا کچھ نہیں۔

اسی طرح اگر مغربی تہذیب اور اس کے وسائل و ثمرات سے استفادہ باقاعدہ سوچی سمجھی اسکیم بصیرت و تدبر اور خیر و شر میں تمیز کی بنیاد پر نہ ہوا تو یہ تہذیب ملک کے رہنماؤں اور ارباب حل و عقد اور علماء دین کی مرضی اور خواہش کے خلاف اس ملک یا سوسائٹی پر جبراً قابض ہو جائے گی عوام گرمجوشی کے ساتھ اس کا خیر مقدم کریں گے، ادباء اور اہل فکر اس کے لئے راستہ صاف کریں گے اور خیر و شر اور مفید و مضر میں تمیز کئے بغیر اس ملک کے باشندے فاقہ زدوں کی طرح اس پر ٹوٹ پڑیں گے، ساری اخلاقی و دینی قدریں اس کے ساتھ فنا ہو جائیں گی ملک کے رہنما اور زعماء اور سیاست داں اس صورت حال کے سامنے

بے دست و پا اور مفلوج نظر آئیں گے اور ان کے ہاتھ سے زمامِ قیادت ہمیشہ کے لیے نکل چکی ہوگی۔

تہذیبی و تعلیمی منصوبہ بندی اور دانشمندانہ اقدام کی ضرورت

بغیر کسی استثناء کے تقریباً سارے مشرقی ممالک اس دورِ آخر میں ایک ایک کر کے مغربی تہذیب کا لقمۂ تر ہو چکے ہیں، اور بغیر کسی مزاحمت کے یہ سیلاب بلا خیز ان کو بہا لے گیا ہے، اس کی وجہ یہی تھی کہ ان کی قیادت غیر معمولی اور متوازن عقل اور انتخاب و تمیز کی ضروری صلاحیت سے محروم تھی اور تصویر کے دونوں رخ اس کی نظر کے سامنے پوری طرح نہیں آسکے تھے، نظامِ تعلیم اور ملک کی تنظیمِ نو کی بنیاد حکیمانہ منصوبہ بندی (PLANNING) اور جدید تجربوں پر نہیں تھی۔

اس کے علاوہ (اور سب سے بڑھ کر) صحیح اسلامی تعلیمات سے انحراف کی وجہ سے ملک میں ایسے حالات اور ایسی فضا پیدا ہو گئی تھی جس کو عقل اور انصاف کسی لحاظ سے بھی جائز نہیں سمجھا جا سکتا، اور ان میں کسی زمانہ میں بھی باقی رہنے کی صلاحیت نہیں تھی، نہ کہ اس بے چلن تغیر پذیر اور تغیر پسند عہد میں!

افغانستان کے ساتھ (جو پورے مشرق میں اپنے رسم و رواج کی پابندی اور قدیم افغانی روایات پر اصرار میں مشہور ہے) یہی ٹریجڈی پیش آئی، ایک عرصہ تک وہ مغربی تہذیب کے اثرات اور ہر قسم کی اچھی بری تبدیلیوں سے محفوظ رہا، قدیم تہذیبی و معاشرتی روایات و رسوم کو دانتوں سے پکڑے رہا، وہ جدید تہذیب کے صالح اور مفید اجزاء بھی قبول کرنے کا روادار نہ تھا۔

روس اور ہندوستان (جو اس وقت سلطنت برطانیہ کا ایک اہم جزء تھا) کے درمیان واقع ہونے اور ان عظیم ذمہ داریوں، نزاکتوں اور خطرات کے باوجود جو اس کے اہم جائے وقوع اور وقت کی نزاکت کی وجہ سے اس کو درپیش تھے، وہ تعلیمی، صنعتی اور فوجی نقطۂ نظر سے ایک نہایت پسماندہ ملک تھا، بیسویں صدی کی ابتداء میں پہلی جنگ عظیم شروع ہو جانے کے بعد تک وہ علوم جدیدہ کی تعلیمات

اور ضروری تمدنی ترقیات سے بکلی محروم تھا، اس پسماندگی کا اندازہ ایک ایسے ذی علم مسلمان سیّاح کے بیانات سے کیا جاسکتا ہے جنھوں نے ۱۹۱۵ء میں افغانستان کا سفر کیا تھا، اور آٹھ برس وہاں کی زندگی اور سیاسیات میں دخیل رہ کر ایک ہم وطن کی طرح اس ملک کے حالات کا مطالعہ کیا تھا، ظفر حسن صاحب[1] ایک افغانستان کی تعلیمی حالت بیان کرتے ہوئے اپنی "آپ بیتی" میں لکھتے ہیں:۔

"اس زمانہ میں افغانستان تعلیم میں بہت پس ماندہ تھا، شاید کل آبادی میں سے صرف ایک فی صدی یا زیادہ سے زیادہ دو فی صدی لوگ لکھنا پڑھنا جانتے تھے، اور وہ بھی صرف پرانے مدارس کے پڑھے ہوئے تھے، پرانے بادشاہ غالباً اپنی رعایا کو تعلیم دینے سے ڈرتے تھے کہ کہیں ان کی آنکھیں نہ کھل جائیں اور وہ ان کی مطلق العنانی کے برخلاف بغاوت نہ کردیں، امیر حبیب اللہ خاں (سراج الملۃ والدین) کے زمانہ میں سارے ملک میں ایک سول مکتب (مکتب حبیبیہ کے نام سے) (HABIBYA HIGH SCHOOL) اور ایک فوجی اسکول (مکتب حربیہ کے نام سے) موجود تھا، افغانستان میں نئی تعلیم اور موجودہ ترقی کی داغ بیل امیر حبیب اللہ خاں ہی کے زمانہ میں ڈالی گئی، اور اگر وہ امیر عبدالرحمٰن خاں (ضیاء الملۃ والدین) کے بعد افغانستان

---

[1] ظفر حسن صاحب کرنال (مشرقی پنجاب) کے رہنے والے ہیں، وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں بی۔اے کے آخری سال میں تھے، جوش جہاد، انگریز دشمنی اور ہندوستان کی آزادی کے جذبہ سے سرشار ہوکر انھوں نے تعلیم اور ہندوستان کو خیرباد کہا، اور ہجرت کی نیت سے ۱۹۱۵ء میں کابل گئے، وہاں مولانا عبید اللہ صاحب سندھی کے ایک شاگرد، معاون اور جنرل نادر خاں کے معتمد علیہ اور دست راست بن کر کئی برس تک ہندوستان کی آزادی اور افغانستان کی تعمیر و ترقی کے لیے جدوجہد کرتے رہے، انھوں نے فوجی اور سیاسی میدان میں نمایاں خدمات انجام دیں، ۱۹۲۲ء میں دائرہ عمل کے تنگ ہونے اور آزادی کے ساتھ کام نہ کرسکنے کی وجہ سے انھوں نے مولانا سندھی کے ساتھ کابل سے ترکی کا رخ کیا، ترکی میں آنرری کیپٹن کے عہدہ تک ترقی کی اور اس سے سبکدوش ہوئے، ان کی نہایت دلچسپ، سبق آموز اور چشم کشا آپ بیتی کا پہلا حصہ منصور بک ڈپو لاہور کی طرف سے ۱۹۶۴ء میں شائع ہوا ہے۔

کے بادشاہ نہ ہوتے تو شاید اس ملک میں کوئی نئی تہذیب اور جدید طریقۂ تعلیم کا نام بھی نہ جاتا۔[1]

"کابل کے سوا کسی اور شہر میں نئے اصول کے مدرسے موجود نہ تھے، لوگ پرانے اصولوں پہ مسجدوں میں قرآن شریف پڑھنا سیکھ لیتے تھے، دفتروں میں کام کرنے والے کلرک جن کو افغانستان میں (مرزا کہا جاتا ہے) پرائیویٹ طور پر تعلیم یافتہ تھے جن کی عمومی معلومات بہت محدود تھیں، نئی طرز کی تعلیم امیر حبیب اللہ خاں کی سیاحت ہندوستان کے بعد جو انھوں نے ۱۹۰۷ء میں کی تھی، شروع ہوئی تھی۔"[2]

"ہم نے (جلال آباد میں) خط لکھنے کے لئے کاغذ اور لفافے تلاش کئے تو معلوم ہوا کہ کوئی ایسی دکان ہی نہیں جہاں قلم دوات یا پنسل بکتی ہو، ہمیں کہا گیا کہ کاغذ قصاب کی دکان پر بکتے ہیں، مگر قلم دوات بیچنے والا کوئی نہیں۔"[3]

افغانستان میں اس وقت صنعت وحرفت اور تجارت کی جو کیفیت تھی، اس کا اندازہ مندرجہ ذیل اقتباس سے ہوگا۔

ظفر حسن صاحب لکھتے ہیں :۔

"کابل میں اس زمانہ میں ایک بوٹ فیکٹری تھی، جو زیادہ تر فوجی ضروریات کو پورا کرتی تھی، اہالی کے لئے اس میں بوٹ بہت کم بنتے تھے، عام طور پر کابل کے بازاروں میں ہندوستان اور انگلستان کے ساخت کے جوتے ملتے تھے، ہاتھ سے کرگاہوں میں بنا ہوا سوتی کپڑا، اور اونی کپڑا بھی گاؤں میں زیادہ استعمال ہوا کرتا تھا، ہرات میں اونٹ کی اون سے اچھا پشمینہ بنتا تھا، قالین بافی کافی زیادہ تھی، افغانی قالین جن کے ڈیزائن (DESIGN) کو فیل پایہ کہتے ہیں، برآمد کئے جاتے تھے۔"[4]

وسائل آمد ورفت اور رسل ورسائل کا جو حال تھا، اس کا اندازہ اس بیان سے ہوگا:۔

---

[1] آپ بیتی حصہ اول صفحہ ۵۵ [2] ایضاً صفحہ ۵۸ [3] ایضاً صفحہ ۶۷-۶۸ [4] ایضاً صفحہ ۵۵

"افغانستان میں نہ اس وقت اور نہ اب ریل کی سڑک تو بالکل ہی نہیں ہے' اس کے علاوہ اس زمانہ میں سڑکیں بھی کم' اور کچی تھیں' پختہ سڑکیں کابل شہر کے اندر اور اس کے گرد و پیش اور کابل' جلال آباد' ٹکر' کابل' لغمان' کابل' جبل السراج کا برقی کارخانہ' جلال آباد پغمان کا نشانیہ (سردیوں میں درباریوں کی سیر و شکار کی جگہ) کے درمیان تھیں' ان سڑکوں پر جو پل تھے' وہ بھی چنداں مضبوط نہ تھے' اور بارش کے دنوں میں سیلاب سے خراب ہو جایا کرتے تھے' کابل قندھار' ہرات' مزار شریف اور گردیز' غزنی جیسے شہروں اور قصبوں کے درمیان جو سڑکیں تھیں' وہ بالکل خراب حالت میں تھیں' اگر کبھی کسی بڑے شہزادے یا گورنر کو اس طرف دورہ کرنے کا اتفاق ہوتا تو ان کی ذرا مرمت کر دی جاتی تھی' نہیں تو خیر سواری اور بار برداری کے لئے عام طور پر گھوڑے' خچر' ٹٹو اور اونٹ کام میں لائے جاتے تھے' اگاڑی اور تانگے کا رواج صرف کابل یا جلال آباد میں تھا' موٹر کاریں تو صرف حبیب اللہ خاں کی سواری کے لئے تھیں' دوسرے امراء اور وزراء عام طور پر گھوڑے کی سواری کرتے تھے' اس لئے ان کے اصطبلوں میں اچھے اچھے گھوڑے موجود تھے۔

ڈاک کا انتظام بہت ابتدائی حالت میں تھا' اور زیادہ تر مرکزی حکومت کے احکام کو گورنروں اور حکام ضلع تک پہونچانے کے لئے تھا' لوگ عام طور پر ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتے ہوئے خطوط پتہ لے جاتے تھے' اور اس بارے میں ڈاک کے صیغے سے چنداں فائدہ نہ اٹھاتے تھے' ہندوستان سے ڈاک عام طور پر ہفتہ میں دو مرتبہ اور بعض اوقات خاص کر سردی میں صرف ایک دفعہ آتی تھی' جس میں اخبارات بھی آیا کرتے تھے' کابل اور جلال آباد کے درمیان ایک ٹیلیفون لائن بھی تھی' جو صرف امیر صاحب کے سردیوں میں جلال آباد جانے پر ذرا اچھی طرح کام دیتی تھی' ورنہ سرکاری خبر رسانی کے سوا' اس سے کوئی نجی کام نہیں لیا جاتا تھا'

محکمۂ تار تو بالکل موجود ہی نہ تھا۔"[۱]

عین جنگِ عظیم کے زمانہ میں جب افغانستان دو طاقتوں کے درمیان گھرا ہوا تھا، فوجی قوت، جنگی تیاری، اور جدید اسلحہ کے لحاظ سے اس کا کیا درجہ تھا؟ اس کا اندازہ ایک صاحب کے اس بیان سے ہوگا، وہ لکھتے ہیں:۔

"اس زمانہ میں افغانی فوج کے ہتھیار بہت ابتدائی تھے، صرف کابل کے فوجی دستوں کے ہاتھ میں نئی قسم کی بندوقیں تھیں، جن سے کچھ ماؤزر (MAUSER) ساخت جرمنی تھیں، ان کو افغان (تونگ یا خوردار) کہا کرتے تھے اور کچھ انگریزی مارٹینی (MARTINI) بندوقیں تھیں، چند ایک مشین گنیں (MACHINE GUNS) اور دو جرمنی سریع آتش یعنی (QUICK FIRING) پہاڑی ہوسر توپیں موجود تھیں، باقی توپیں پرانی اور فتیلی تھیں، جن کا دنیا میں غالباً کسی جگہ بھی رواج باقی نہ رہا تھا، فوجی سپاہیوں کو سرکاری طور پر کسریٹ سے کھانا نہیں ملتا تھا، بلکہ ماہوار تنخواہ دی جاتی تھی، جوان کے بال بچوں کے گزارے کے لئے بمشکل کافی ہوتی تھی، وہ خود آٹا مول لے کر روٹی پکاتے تھے، اور اپنا سالن بھی خود ہی تیار کیا کرتے تھے، چولہے کے لئے لکڑی بھی وہ خود ہی اِدھر اُدھر سے اور پاس کے درختوں سے جمع کر کے لاتے اور جلاتے تھے، اس سے ان کا وقت فوجی پریڈ کے لئے بہت کم رہ جاتا تھا، اس لئے ان میں نہ چنداں فوجی ڈسپلن موجود تھا، اور نہ وہ خود کچھ توانا نظر آتے تھے۔"[۲]

محکمۂ حفظانِ صحت اور علاج و معالجہ کے بارے میں بھی افغانستان کی بےبضاعتی اور بےسروسامانی کا اندازہ اس سے ہوگا کہ:۔

• سارے ملک میں صرف کابل میں ایک سول، اور ایک ملٹری اسپتال موجود تھا، سول اسپتال کے ہیڈ سرجن ترکی ڈاکٹر منیر بیگ اور امراضِ داخلیہ کے ماہر ڈاکٹر نخیمہ بیگ تھے، یہاں ہندوستانی

---

[۱] آپ بیتی ص۵۶-۵۷ [۲] ایضاً ص۵۹

کمپونڈر کام کرتے تھے، فوجی اسپتال کے انچارج (INCHARGE) لاہور کے ڈاکٹر اللہ جوایا تھے، جو ہمارے ساتھیوں میں سے شجاع الدولہ کے رشتہ دار ہوتے تھے۔[1]

محکمہ جات کے افسروں اور ذمہ دار عہدیداروں کی قابلیت کا معیار بھی بہت پست تھا اور عام حالات میں معمولی نوشت وخواند سے معاملہ آگے نہیں بڑھتا تھا، اس وقت افغانستان کا امین الاطلاعات یعنی (C.I.D.) کا ہیڈ فارسی کے صرف ونحو سے واقف نہیں تھا، وہ ابتدائی انگریزی کے سبق ظفر حسن ایبک سے لیتا تھا ظفر حسن صاحب لکھتے ہیں:۔

"اندھوں میں کانا راجہ" اس زمانہ میں افغانستان کے باشندے اور ان کا حکمراں طبقہ اس ضرب المثل کا مصداق تھا، لوگ اَن پڑھ اور پسماندہ تھے، اس وقت جس کو ذرا لکھنا پڑھنا آتا تھا وہی بر سرِ کار ہوجاتا تھا، حکومت میں نالائق آدمی بھی داخل تھے، اور کوئی نہ پوچھتا تھا کہ کس قابلیت کی بنیاد پر وہ بڑے بڑے عہدوں پر پہونچ گئے ہیں، موجودہ افغانستان میں بھی گریجویٹ (GRADUATE) اور ڈگری (DEGREE) یافتہ اعلیٰ افسر ابھی تک بہت کم ہیں۔[2]

لیکن آخر میں یہ حجاب اٹھا اور اس نے بھی مغربی تہذیب اور طرزِ زندگی کو (اپنی کمزوریوں اور سارے معائب کے ساتھ) قبول کرنے کا تہیہ کرلیا، اور اس وقت وہ آنکھ بند کرکے تیزی کے ساتھ مغربی تہذیب ومعاشرت کو اپنا رہا ہے، اس ۳۲ سال کے عرصے میں وہاں ایسا انقلاب ہوگیا ہے کہ جن طریقوں کو افغانی معاشرہ برداشت نہیں کرسکتا تھا، اور اس کی پاداش میں امیر امان اللہ خاں کو اپنے موروثی تخت وتاج سے دست بردار ہونا پڑا تھا، آج افغانستان ان کو شوق وقدر کے ہاتھوں سے قبول کر رہا ہے، اس انقلاب عظیم کا اندازہ ایک عینی شاہد کی روایت سے ہوسکتا ہے۔

"ٹائمز آف انڈیا" (TIMES OF INDIA) کا یورپین نامہ نگار (RITCHIE CALDER) جس نے

---

[1] آپ بیتی ص ۹۳ [2] ایضاً ص ۱۱۱

۱۹۶۳ء کے افغانی جشن استقلال میں شرکت کی تھی اس اخبار کی ۲۸ جولائی ۱۹۶۳ء کی اشاعت میں لکھا ہے

"وسیع پیمانے پر چھوٹنے والی آتش بازی (جو اس سے قبل میں نے افغانستان میں نہیں دیکھی تھی) کے ہر تماشہ کے ساتھ آفریں و تحسین کی آوازیں پانچ لاکھ تماشائیوں کے حلق سے نکل رہی تھیں، اس طرح افغانستان اپنے جشن استقلال کا ہفتہ منا رہا تھا مجھ سے افغانستان کے وزیر خارجہ نے (جو ہمارے ساتھ جھیل کے کنارے شاہی نشستوں پر بیٹھے تھے اور جہاں مسلسل آتش بازی چھوٹ رہی تھی) کہا کہ آپ غلط موقع پر آئے ہم اس وقت جشن تفریح منا رہے ہیں اور اس وقت اپنے پنج سالہ ترقیاتی منصوبہ کی تفصیلات پر گفتگو نہیں کر سکتے۔

میں نے جواب دیا "جی نہیں! یہی بہترین موقع ہے کسی ملک کے کارناموں کو اس وقت بہتر طور سے جانچا جا سکتا ہے جبکہ وہاں کے باشندے تفریح میں مشغول ہوں میں تو افغان عورتوں کو مسکراتے دیکھنا چاہتا ہوں" عین اس وقت ایک خوبصورت عورت ہمارے گروہ میں شامل ہوئی اور مسکرائی۔

یہ چیز اس ساری روشنی سے جو بجلی کی اسکیموں کی بدولت کابل کو منور کر رہی ہے اور وہاں کی ساری عمارتوں نئی نئی صنعتوں اور ساری مادی ترقیوں سے بھی زیادہ افغانستان میں ہونے والی تبدیلیوں کو ظاہر کرتی ہے۔

تین سال قبل یہاں کی عورتیں پردہ میں تھیں اس وقت اگر ایسے مواقع پر اسے باہر نکلنے کی اجازت ملتی بھی تو اسے چادر میں ملفوف ہو کر آنا پڑتا جو اسے سر سے پیر تک ڈھکے رہتی اور نقاب اس کے چہرہ کو ڈھانپے ہوئی ہوتی جس میں دیکھنے کے لئے سوراخ بنے ہوتے۔

اب یہ سب نذر انقلاب ہو چکا ہے، اب بھی جشن کے مجمع میں ایسی عورتیں خاصی نظر آتی ہیں جو اب بھی الگ تھلگ رہنے والا برقع پہنتے ہیں اور وہ ابھی اس کی خوگر نہیں ہوئی ہیں کہ ان کو اپنا چہرہ کھلا رکھنے کی آزادی نصیب ہو چکی ہے لیکن اب عورتوں کی عظیم اکثریت بے نقاب ہو چکی ہے۔

افغانستان سے باہر رہنے والوں کے لئے یہ اندازہ بہت دشوار ہے کہ اس انقلاب نے افغان

عورتوں پر کتنا زیادہ اثر ڈالا ہے ۳۲ سال قبل شاہ امان اللہ خاں کو ملاؤں (مذہبی عالموں) نے اس لئے تخت شاہی سے نکال باہر کیا تھا کہ انھوں نے اپنی ملکہ کو بغیر نقاب کے باہر نکلنے کی اجازت دے دی تھی۔

یہ دعویٰ تقریباً صحیح ہوگا کہ افغان عورتوں کی پردہ سے "نجات" کا آغاز زچہ وبچہ کے طبی مراکز سے ہوا جبکہ ڈاکٹر اینا میریا گیڈ (ANNA MARIA GADE) (جو اس وقت عالمی ادارۂ صحت کے علاقائی ہیڈ کوارٹر دہلی کی صدر ہیں) آج سے دس سال قبل ڈنمارک سے افغانستان وارد ہوئی تھیں اس وقت وہاں بچہ جنانے والی لیڈی ڈاکٹر ایک بھی موجود نہ تھی، پورے افغانستان میں اس وقت ایک سو بیس ڈاکٹر تھے، اور وہ سب کے سب مرد ہی تھے، کسی مرد ڈاکٹر کو عورتوں کے معائنہ کی اجازت نہ تھی، مقامی قابلہ عورتیں جدید طریق علاج سے بالکل ناآشنا تھیں۔

ڈاکٹر گیڈ نے قابلہ (مڈوائف) عورتوں کی تربیت شروع کی اور ان میں شاہی خاندان کی عورتیں بھی شامل تھیں، زچہ وبچہ کی صحت کے مراکز قائم کئے گئے اور برقعہ پوش عورتیں وہاں بکثرت آنے لگیں، وہاں انھوں نے صرف جسمانی فائدے ہی حاصل نہیں کئے جن کے نتیجہ میں ان کے نقطہ نظر میں انقلابی تبدیلی ہوئی، بلکہ لیڈی ڈاکٹروں اور نرسوں سے ملنے کے بعد انھیں یہ بھی علم ہوا کہ عورتیں بھی (اس پیشہ میں) مردوں کی طرح روزی کما سکتی ہیں، اور اس سے اہم چیز یہ کہ ان مریض عورتوں نے ان طبی مراکز میں اپنے بارے میں یہ محسوس کیا کہ ان کی حیثیت کتنی اہم ہے اور اب ان کا شمار چھپائے جانے والے خانہ داری کے سامان میں نہیں ہو سکتا۔

آج ان عورتوں کے لئے اعلیٰ قسم کے اسپتال موجود ہیں جن کی انچارج اعلیٰ ڈگری یافتہ عورتیں ہیں جو انتہائی صاف ستھری اور حفظانِ صحت کے اصول وضوابط پر عامل ہیں، اور اس بارے میں ان روایات کو قائم کئے ہوئے ہیں جو ڈاکٹر گیڈ نے قائم کی تھیں۔

افغانستان میں عورتوں نے اگست ۱۹۵۹ء سے بے نقابی شروع کی ہے، ایک شاہی فرمان کی روسے عورتوں کو برقع سے باہر نکلنے کا حکم تو نہیں دیا گیا لیکن اجازت دے دی گئی تھی۔

میں نے کابل یونیورسٹی کی ایک میڈیکل انڈر گریجویٹ، زندگی اور زندہ دلی کی مجسم تصویر مسماۃ معصومہ کاظمی سے پوچھا کہ تم نے (اس فرمان کے اجراء کے بعد) کیا کیا؟ اس نے جواب دیا کہ میری بہن اور میں نے اپنے برقع کی چادروں کو نذرِ آتش کر دیا اور ہم نے قسم کھائی کہ اب کبھی برقع اور چادر نہ استعمال کریں گے، معصومہ اور ان کی بہن فیروزہ یہ ایک بینک کار کی لڑکیاں ہیں، اور یہ دونوں ۱۹۶۵ء میں تعلیم مکمل کر کے لیڈی ڈاکٹر بن جائیں گی، خاتون ڈاکٹروں کی پہلی کھیپ ۱۹۶۴ء میں سات سال میڈیکل نصاب پورا کر کے یونیورسٹی سے نکلے گی۔

آج افغانستان کی یونیورسٹی میں مخلوط تعلیم جاری ہے، جہاں پہلے طالبات چادر اوڑھ کر آتی اور طالب علموں سے علیحدہ پڑھنے کی عادی تھیں، یونیورسٹی کی ساری تعلیم اور ٹریننگ مفت ہوتی ہے، حکومت ہی فیس، کتابیں، کپڑے اور کھانے کی کفالت کرتی ہے، بہت سی لڑکیاں عنقریب ڈگری پا کر یونیورسٹی میں ٹیچر مقرر ہو جائیں گی، اس وقت یونیورسٹی کو مرد اور خاتون ٹیچروں کی اشد ضرورت ہے کیونکہ وہاں تعلیم کا موجودہ انحصار بڑی حد تک غیر ملکی استادوں پر ہے۔[۱]

۱۳۹۳ھ ۱۹۷۳ء میں جب مصنف کو افغانستان جانے اور وہاں کے حالات کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تو اس نے اپنے سفرنامے "دریائے کابل سے دریائے یرموک تک" میں کچھ تجدد پسند افغان خواتین کی گفتگوؤں کے ذیل میں یہ تاثرات لکھے تھے۔

"ہم یہ محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکے کہ ملک میں مغربی تہذیب بہت آگے جا چکی ہے اور اس کے ثمرات بھی ظاہر ہو رہے ہیں، ۱۹۲۸ء اور ۱۹۷۳ء کے درمیان وسیع خلیج حائل ہو چکی ہے، امیر امان اللہ خاں

---

[۱] TIMES OF INDIA 28 JULY 1963.

کے دور تک افغانی قوم اسلامی افغانی روایات پر بڑی مضبوطی سے قائم تھی اسے دانتوں سے پکڑے ہوئے تھی اس کا تعلب غلو اور مبالغہ کی حد تک پہنچا ہوا تھا اور اسی کا نتیجہ تھا کہ امیر امان اللہ خاں کی بعض قدیم اسلامی روایات کی خلاف ورزی کی بنا پر ان کے خلاف ہنگامہ برپا ہو گیا۔ اور ان کو تخت و تاج سے دستبردار ہونا پڑا لیکن اس وقت صورتِ حال بالکل مختلف ہے، افغانی قوم اپنے ماضی سے بہت دور جا پڑی ہے اور یہ دوری ماہ و سال کی تعداد کے اعتبار سے تو بہت کم ہے یعنی صرف ۴۵ سال لیکن فکری و تمدنی اعتبار سے یہ مسافت بہت طویل ہے اکثر قومیں کہیں صدیوں میں اتنی مسافت طے کرتی ہیں، پردہ اب پسماندگی، جہالت و غربت کی علامت بن گیا ہے اسی وجہ سے دیہاتوں، گاؤں میں بعض دیندار علماء اور دارالسلطنت سے دور کسانوں کے گھروں تک محدود ہو کر رہ گیا ہے..... بہر حال دونوں طبقوں ـــــ دین کے نمائندہ علماء اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ ـــ کے درمیان پیدا ہونے والی خلیج بہت وسیع ہو گئی ہے جس کو پُر کرنا آسان نہیں ہے۔[1]

• ہمارے رفیقِ سفر شیخ احمد محمد جمال کابل میں خواتین کی ایک نشست میں شریک ہوئے میں اس وقت غزنی میں تھا، اس لئے شریک نہ ہو سکا، واپسی پر بتلایا گیا کہ پردہ، مردوں کے حقِ طلاق اور تعدد ازدواج کے موضوع پر گرما گرم بحث ہوئی، ان باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ افغانی خواتین ذہنی و فکری انتشار و اضطراب کی کس منزل سے گذر رہی ہیں، اور غیر ملکی تہذیب و ثقافت کا پروپیگنڈا اور اس کے اثرات کس حد تک پہنچ چکے ہیں۔[2]

۱۹۷۸ء میں ایک فوجی انقلاب کے نتیجہ میں سردار داؤد خاں کا تختہ الٹ دیا گیا اور فوج کی مختصر خانہ جنگی اور عوام پر جبر و تشدد کے بعد فوج کے کمیونسٹ عنصر نے زمام اختیار اپنے ہاتھ میں لے لی اور سوویت یونین سے خصوصی روابط قائم کئے،

---

[1] دریائے کابل سے دریائے یرموک تک صفحہ ۳۱، ۳۲ [2] ایضاً صفحہ ۳۴

علما اور دین دار نوجوانوں کو گرفتار کرلیا گیا اور قتل وغارت گری کا نشانہ بنایا گیا، ان مظالم کے نتیجے میں نیز افغانی عوام کے مذہبی مزاج اور دینی حمیت کی وجہ سے کمیونسٹ نظام کے خلاف سخت مزاحمت شروع ہوگئی اور روس کو دو مرتبہ مداخلت کرکے نئے حاکم بٹھانے پڑے اور جب اس سے بھی کام نہ چلا تو کھلی فوج کشی کرکے براہ راست ملک پر قبضہ اور اس کو اپنے انتظام میں لے لیا گیا، جس اقدام کی دنیا کے اکثر ممالک نے مذمت کی اور اس کو عریاں جارحیت اور اس تاریخ کا اعادہ سمجھا گیا، جب ایک بڑا ملک دوسرے چھوٹے ملک پر فوج کشی اور طاقت کا استعمال کرکے قبضہ کرلیا اور اس کو غلام بنا لیا کرتا تھا۔

اس اقدام نے جس کی نظیر پچھلے برسوں میں دیکھنے میں نہیں آئی تھی، روس کے خلاف اخلاقی احتجاج کی عالم گیر فضا پیدا کردی اور کمیونزم کے مساوات انسانی اور مظلوموں کی حمایت کے بلند بانگ دعوی کو سخت دھکا پہنچایا اور چھوٹے امن پسند اور خود دار ملکوں کو جن کو اپنے عقائد اور مسلکِ زندگی عزیز ہے، خوف زدہ اور مشکوک بنا دیا، "وبعل الله يحدث بعد ذالك امراً"

قریب قریب یہی یمن اور ان تمام ممالک کا حشر ہوتا نظر آرہا ہے جنھوں نے عرصہ تک ہر نئی چیز کا انکار کیا اور مفید علوم، بے ضرر وسائل، نئے تنظیمی تجربوں، رفاہی تدابیر اور فوجی استحکامات کو بھی اپنے حدود میں قدم رکھنے کی اجازت نہیں دی تھی۔

کم سے کم ۱۹۵۵ء تک یمن کا جو نقشہ، اندرونی ترقی و تنظیم، بیرونی دنیا سے رابطہ اور زمانہ کے رفتار کے ساتھ اس کے سفر کا جو حال تھا، اس کا کچھ اندازہ مندرجہ ذیل معلومات سے ہو سکے گا، جو مصر کے کثیر الاشاعت ہفتہ وار "روزالیوسف" کے عرب امور کے مدیر "محمد فوح رضا" صاحب نے یمن کے نائب وزیر خارجہ السید محمد عبد اللہ العمری سے ایک انٹرویو کے درمیان اخذ کئے ہیں، اور ۷ فروری ۱۹۵۵ء کی اشاعت میں ایک مکالمہ کی شکل میں شائع ہوئے، ان معلومات سے حسب ذیل حقائق کا علم ہوتا ہے:۔

٭ ۱۹۵۵ء تک یمن میں کوئی باقاعدہ مردم شماری نہیں ہوئی، ذرائع آمدنی صرف وصول کئے جانے والے ٹیکس اور کسٹم کی آمدنی تھی، زراعت ہی تنہا اہل یمن کا ذریعہ معاش تھا، ذرائع آبپاشی صرف دو تھے، بارش کا پانی اور کنویں، سالانہ بجٹ صرف ڈیڑھ کروڑ پاؤنڈ تھا، ملک کا محفوظ سرمایہ امام یمن کی ذاتی دولت (۸ کروڑ پونڈ) کے سوا اور کچھ نہیں۔

ملک میں عام طور پر سڑکیں نہیں تھیں صرف دو شہروں مخا اور تعز کے درمیان کچھ ہی عرصہ پہلے ۱۲۰ کیلومیٹر کی ایک لمبی سڑک نکالی گئی تھی، جو ۱۹۵۵ء تک پختہ نہیں ہوئی تھی۔

پورے ملک میں صرف چھ سو مکاتب تھے، ان کے علاوہ تمام شہروں میں پرائمری اسکول تھے، تعز، مخا اور حدیدہ میں ثانوی اسکول (سکنڈری اسکول) بھی تھے، فوج کی تین قسمیں تھیں، جو فوج اس وقت کام کر رہی تھی اس میں چھ بریگیڈ تھے، دوسری فوج جسے ٹریننگ دے کر وقت ضرورت کے لئے چھوڑ دیا گیا تھا، اس میں ۱۴ بریگیڈ تھے، ان کے علاوہ ۲۰ ہزار نفوس پر مشتمل مختلف قبائل کے آدمی تھے، چوپائے آمد و رفت کا واحد ذریعہ تھے، ملک میں صرف چند پرائیوٹ کاریں تھیں، کوئی فوجی ہوائی جہاز نہیں تھا، صرف ۱۱ طیارے تھے، جن میں تین ڈکوٹا تھے، ملک میں کوئی ہوٹل کوئی ریستوران نہیں تھا، کوئی کارخانہ نہیں تھا، کوئی پولیس فورس

بھی نہیں حکومت نے بعض یورپین کمپنیوں کو کوئلہ اور پٹرول نکالنے کا ٹھیکہ دیا تھا۔[1]

ملک کی اس پسماندگی اور گردوپیش کی دنیا کے حالات اور ہمسایہ ملکوں کی ترقی کے دباؤ نے حکومت کو بعض اصلاحات و ترقیات پر مجبور کیا، اس کی واحد صورت یہی تھی کہ ترقی یافتہ ملکوں سے امداد لی جائے، چنانچہ حکومتِ یمن نے سوویت روس اور عوامی جمہوریہ چین سے مختلف معاہدے کئے اور انھوں نے یمن کو گراں قدر قرضے دیئے اور بعض اہم ترقیاتی منصوبوں کی تکمیل کی ذمہ داری لی، چنانچہ ۱۹۵۸ء میں چین سے جو معاہدہ ہوا تھا، اس میں چین نے یمن کو ۷ ملین فرنک (سوئس) بلا سود دینے منظور کئے جو حسبِ ذیل منصوبوں کی تکمیل میں خرچ کئے جائیں گے۔

(۱) ..۵ کیلومیٹر کی ایک سڑک کی تعمیر جو حُدیدہ کو صنعاء سے ملائے (۲) کپڑے کے ایک کارخانہ کا قیام (۳) خشک شدہ مچھلیوں کے لئے ایک کارخانہ کا قیام (۴) ایک شوگرمل (۵) ایک شیشہ کے کارخانہ کا قیام[2]

زندگی کے رواں دواں قافلے سے یہ دور افتادگی اور پسماندگی (جو کسی سوچے سمجھے منصوبہ اور خود اعتمادی اور دینی جذبہ کے ساتھ نہیں تھی، بلکہ محض کسلمندی، پست ہمتی اور بے خبری کا نتیجہ تھی) کا انجام اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا تھا کہ یہ بند دروازہ آندھی کے زور سے اس طرح چوپٹ کھل جائے کہ کسی وارد و صادر اور خیر و شر کی تمیز نہ رہے، اور جدید تہذیب و تنظیم کا سیلاب قدیم نظام کی خوبیوں اور صحت مند و صالح افکار و اقدار کو بھی بہالے جائے اور یمن جو کبھی "یمنِ میمون" کہلاتا تھا اور جس کے باشندوں کی قوتِ ایمانی و حکمتِ دینی کی شہادت زبانِ نبوت نے ان قابلِ صد رشک الفاظ میں دی تھی "أتاكم أهل اليمن أرق أفئدة وألين قلوبا، الإيمان يمان، والفقه يمان، والحكمة يمانية"[3] (تمہارے پاس اہلِ یمن آئے ہیں، جن کے قلب بڑے رقیق اور جن کی طبیعتیں نہایت نرم ہیں، ایمان یمن کا حصہ ہے، دین کی سمجھ یمن کی

---

[1] ترجمہ از ڈاکٹر محمد اقبال صاحب انصاری ندوی۔ [2] الیمن تصنیف امین سعید ص۲۸۱ [3] بخاری شریف

چیز ہے، حکمت یمن کا حق ہے) وہ یمن سیاسی و ذہنی و اخلاقی انتشار اور اشتراکیت کی زد میں آجائے اور غیر ملکی اس کی زندگی کا نیا سانچہ بنائیں۔

راقم سطور نے یمن کے اس انقلاب سے جو یمن کے حالات میں رونما ہوا، ۱۱ سال قبل یمن ہی کے ایک ذمہ دار (نائب وزیر خارجہ سید عبداللہ العمری) سے (جن کا انٹرویو اوپر مذکور ہے) اپنے اس اندیشہ کا اظہار کیا تھا، اور ان کو اس معتدل و متوازن راستہ کی طرف توجہ دلائی تھی جس میں یمن اپنی شخصیت کو برقرار رکھ کر ترقی کر سکتا ہے، اور "اندھا دھند" انقلابات سے محفوظ رہ سکتا ہے۔ ۱۹۵۱ء کے روزنامچہ کا وہ ورق عبرت کے لئے پیش ہے۔

(۷ جمادی الاولیٰ ۱۳۷۰ھ مطابق ۱۳ فروری ۱۹۵۱ء)

"آج ہم لوگ یمنی وزارت خارجہ کے سکریٹری قاضی محمد عبداللہ العمری سے ملنے قصر الجزیرہ ہوٹل گئے، میں نے ان سے کہا کہ اس وقت بیشتر عرب ممالک کی زمام کار ان کے ہاتھ سے چھوٹ چکی ہے، اور وہ اپنے آپ کو مغرب کے تیز و تند دھارے کے حوالہ کر چکے ہیں، البتہ یمن کو اس سے مستثنیٰ قرار دیا جا سکتا ہے، اس کو ابھی اپنے اوپر قابو حاصل ہے، مجھے امید ہے کہ وہ مغربی تہذیب اور اس کے تعلیمی نظام و فلسفۂ حیات سے خوشہ چینی میں جلد بازی اور ناعاقبت اندیشی سے کام نہیں لے گا، اور اس پر اس طرح نہ گرے گا جس طرح پیاسا پانی پر اور پروانے شمع پر گرتے ہیں، وہ اس تہذیب سے صرف وہ اجزاء لے گا جو اس کے طرز زندگی، اس کے مذہب، اس کے مزاج اور اس کے پیغام و دعوت کے ساتھ مطابقت رکھتے ہوں، اور اس کی زائد بے ضرورت چیزوں اور اس کے مفاسد اور برائیوں سے دست کش رہے گا، یمن ایک طویل عرصہ سے دنیا سے علیحدہ رہ کر زندگی گزارتا رہا ہے، اس کو اس کا احساس ہے کہ وہ قافلہ سے بہت پیچھے رہ گیا ہے، مجھے

اندیشہ ہے کہ اس غفلت اور سستی کی تلافی کے لئے وہ اپنی رفتار اتنی تیز کردے کہ اس کو ٹھوکروں پر ٹھوکریں لگنے لگیں یا راستہ ہی سے بھٹک جائے اور پھر وہ بات پیش آجائے جس کی تلافی کبھی نہ ہو سکے۔

میں نے ان سے کہا کہ میرے نزدیک اسلامی ممالک میں صحیح زندگی کی بنیاد عوام میں صحیح اور طاقت ور دینی شعور کا وجود ہے، اور وہ صرف عمومی دعوت، عوام سے ربط اور ان کی دینی تربیت اور اس کے مختلف طبقوں میں احساس و شعور پیدا کرنے سے وجود میں آسکتا ہے۔ دوسری مضبوط بنیاد صحیح نظامِ تعلیم اور وحی و نبوت کے ذریعہ آئے ہوئے اس علم کو جو ہر شک و شبہہ سے بالاتر ہے، اور جو ہر دور کا علم اور ہر صالح تہذیب اور صالح زندگی کی بنیاد و اساس ہے، ان طبیعی علوم، عصری معلومات اور ان تجربوں اور ایجادات و انکشافات کے ساتھ جمع کرنا ہے، جن میں مغرب فوقیت لے گیا ہے، اور مشرق پر غالب آگیا ہے، مجھے امید ہے کہ میں ان دونوں طاقتوں کو جمع کرنے میں کامیاب ہو گا، اس وقت ہم توقع کرسکتے ہیں کہ اس کی تمام عرب ممالک میں جو نہ اسلامی کہے جاسکتے ہیں، نہ مغربی، ایک بالکل دوسری شان ہو گی۔"[1]

اسی سے ملتے جلتے تاثر اور احساس کا اظہار ایک مغربی فاضل (W. ERICH BETHMANN) نے اپنی کتاب (YEMEN ON THE THRESHOLD) میں کیا ہے، مصنف نے ۱۹۵۹ء میں یمن کی سیاحت کی، جبکہ امام احمد کی حکومت تھی، اور اس نے جدید ترقیات کے لئے اپنے دروازے بند کر رکھے تھے، مصنف مذکور نے اس طرح اپنی مسرت اور اندیشہ کا اظہار کیا ہے:-

"عہد حاضر کی سہولتوں اور آسائشوں سے محرومی، اور آج کل کی بہت سی نام نہاد ضروریاتِ زندگی کے مالک ہونے کی خواہش نہ رکھنے کے باوجود یہاں کے لوگ مقابلۃً

---

[1] "مذکرات سائح فی الشرق العربی" مطبوعہ قاہرہ ۱۹۵۴ء صفحہ ۱۷-۱۶

خوش وخرم ہیں، مرحوم امام یحییٰ اور موجودہ امام احمد نے اس احساس کے باوجود کہ عہدِ حاضر کی قوتیں یمن کی اس زندگی میں جس کا وہ اب تک عادی رہا ہے، بہت سی تبدیلیاں پیدا کر کے رہیں گی، جن کے نتائج بہت خطرناک ہوں گے، برابر اس کی کوشش کی کہ جہاں تک ہو سکے یمن کے دروازے مضبوطی سے بند رکھے جائیں، انھیں اس میں اچھی خاصی کامیابی رہی، لیکن اس صورتِ حال کا زیادہ دن قائم رہنا بہت مشکوک معلوم ہوتا ہے۔

نیا زمانہ یمن کے دروازے پر دستک دے رہا ہے، طیارے، موٹر کار، ٹیلی فون، ریڈیو اور برقی روشنی کا داخلہ وہاں ہو چکا ہے، اور دوسری چیزیں بھی ان کے عقب میں پہونچنے والی ہیں، اس ٹکراؤ کا اثر زیادہ قوت سے محسوس ہو کر رہے گا، اور اس سلسلہ میں عبوری دور آنے والا ہے، آیا یہ عبوری دور بلا کسی سخت تہلکہ کے گزر جائے گا یا ملک میں بدامنی اور فساد برپا کر کے رہے گا؟ اس کا انحصار بڑی حد تک اس امر پر ہے کہ یہ کون سا راستہ اختیار کرتا ہے، اور طرزِ جدید کی حکومت (جس کی بنیاد عہدِ حاضر کی معاشی ضروریات پر ہو) کے قیام کے لئے کس نوعیت کے قدم اٹھائے جاتے ہیں؟ یہ عبوری دور تدریجی ہونا چاہئے، اور اس کے لئے بڑی دانائی کی ضرورت ہے کہ جو ابتدائی قدم اٹھائے جائیں، وہ صحیح ہوں، اور جو طریقے اختیار کئے جائیں وہ بھی صحیح ہوں[1]!

پھر ان منصوبوں، تنظیمات اور نئی اصلاحات کا تذکرہ کرتے ہوئے جن کو یمن کی ترقی و استحکام کے سلسلہ میں اوّلیت و ترجیح حاصل ہے، اور ان ماہرینِ فن کا ذکر کرنے کے بعد جو ملک کی ٹھوس تعمیر و ترقی کے لئے صحیح اور بے غرض مشورہ دے سکیں، وہ روحانیت و مادیت کے اس صحیح امتزاج اور ملک کی متوازن ترقی کی دعوت دیتا ہے، جس کی ایک مغربی فاضل سے زیادہ ایک مسلمان

---

[1] YEMEN ON THE THRESHOLD P. 71

مشرقی مفکر سے توقع کی جاتی ہے' وہ لکھتا ہے:۔

"بلاشبہ یمن معاشی دائرہ میں بہتری کے لئے ہر ممکن کوشش کرے گا، اسے اس کا بھی لحاظ رکھنا چاہئے کہ وہ قابل قدر مذہبی و روحانی ورثہ کو بھی برقرار رکھے، صرف مادی ترقی ہی نہ انسانی خرابیوں کا مکمل علاج کر سکتی ہے' نہ انسان کو بعجلت خوش و مطمئن بنا سکتی ہے' اس کا تجربہ ان ملکوں کو جو بڑی سے بڑی مادی ترقی کر چکے ہیں' روزانہ افسوس و غم کے ساتھ حاصل ہو رہا ہے' اسی وقت جبکہ بنیادی انسانی قدروں کی حفاظت کی جائیگی اور روحانی و مذہبی اثاثہ کو افراد (جو قوم کی تشکیل کرتے ہیں) کے ضمیر میں زندہ قوت کا درجہ حاصل ہوگا، مادی ترقی ایک نعمت ثابت ہو سکتی اور زندگی کے ہر پہلو کو مالامال کر سکتی ہے۔

یمن عقلمندی کے ساتھ اپنے قیمتی روحانی ورثہ اور مادی ترقی کے ساتھ اس حد تک ملا رکھنے کے ذریعہ جو اس کی ضروریات کے لحاظ سے مناسب ہے وہ پھر سے "باغ عدن" کی حیثیت اختیار کر سکتا ہے' جس میں لوگ سکون کے ساتھ رہ سکیں گے' دانائی اور ترقی کے اس خوشگوار امتزاج ہی سے یمن نہ صرف دنیائے عرب بلکہ دنیائے اسلام کی ترقی میں معتدل حصہ لے سکتا ہے بلکہ مجموعی طور سے دنیا کی ترقی میں بھی"[1]

لیکن نہ اس متوازن فکر رکھنے والے مغربی مصنف کی توقعات پوری ہوئیں' نہ یمن کے مسلمان بہی خواہوں اور خیر اندیشوں کی خواہشات اور تمنائیں' یمن ان پے در پے انقلابات کا نشانہ بنتا رہا جنھوں نے اس کی چولیں ہلا کر رکھ دیں' ان انقلابات کے پیچھے بھی نہ کوئی سوچا سمجھا منصوبہ تھا، نہ واضح مقاصد' نہ متوازن اصلاحی و تعمیری اسکیم' نہ ان میں یمن کے قدیم صالح ورثہ کی حفاظت' نہ اس کو عالم اسلام اور عالم عربی میں شایان شان مقام دلانے کی مخلصانہ خواہش کام کر رہی تھی اور نہ پسماندہ اور خستہ حال عوام کے ساتھ جو اُن

[1] YEMEN ON THE THRESHOLD P. 74

پے در پے تبدیلیوں سے زار و نزار ہو رہے تھے مخلصانہ ہمدردی کا جذبہ، یہ سب انقلابات شخصی خاندانی اور جماعتی محرکات اور مفادات کا نتیجہ تھے، جن کے متعلق کوئی پیشین گوئی نہیں کی جا سکتی کہ ان کا سلسلہ ختم ہو جائے گا، اس کا نتیجہ ہے کہ یمن ابھی تک ایک عبوری دور سے گذر رہا ہے، اس کی سمتِ سفر مبہم اور اس کی منزل غیر متعین ہے۔

ستمبر ۱۹۶۲ء میں اس کے حکمراں امام احمد کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے امام بدر کے ہاتھ میں زمام سلطنت آئی، وہ اپنے والد کے زمانہ میں وزیر خارجہ کی حیثیت سے دنیا کے مختلف علاقوں میں گئے تھے، یورپ کے سفر بھی بار بار کئے تھے، اور دنیا کی نئی تبدیلیوں کو قریب سے دیکھا تھا، ان کو بدلتے ہوئے حالات کا نسبتاً زیادہ علم و اندازہ ہو سکتا تھا لیکن ان کا اقتدار ایک ہفتے سے زیادہ نہ رہ سکا، اور تاریخ کو ان کی کارکردگی دیکھنے کا موقع نہ مل سکا، ان کے محافظ دستہ کے سربراہ عبداللہ سلال نے مصر کی انقلابی حکومت کے اشارے پر بغاوت کر دی، مصر کی انقلابی حکومت کے سربراہ جمال عبدالناصر کی سرپرستی ان کو حاصل تھی، چنانچہ یمن کے نئے سربراہ نے جمال عبدالناصر کی تجدد پسند اور کمیونسٹ نواز پالیسی کو اختیار کیا اور یمن میں تیزی سے تبدیلی لانے کی کوشش شروع کر دی، یہ تبدیلی نامذہبی اصولوں پر تھی، چنانچہ نئی حکومت کے اثرات یمنی زندگی کے جن گوشوں پر اور جن طبقوں پر تھے، ان میں جدید یا مذہبی تمدن کا رنگ تیزی سے بڑھنے لگا، یہ عمل شہری زندگی میں زیادہ ظاہر ہوا، دیہاتی آبادی اپنے قدیم رہنماؤں کے اثرات میں تھی اس لئے اس نے نئی حکومت کے سامنے سپر نہیں ڈالی اور نہ اپنی زندگی میں تبدیلی کو قبول کیا، اس کی وجہ سے یمن میں دو محاذ بن گئے، ایک انقلابی محاذ جس کی باگ ڈور جدید مادہ پرستانہ ذہن رکھنے والے قائدین کے ہاتھ میں تھی اور ان کی سرپرستی مصر کے جمال عبدالناصر کی طرف سے تھی، دوسری طرف قدامت پرستانہ ذہن رکھنے والے لوگ تھے جن کی سرپرستی امام بدر کے توسط سے

سعودی حکمرانوں کی طرف سے تھی، دونوں محاذوں کی کشمکش ذہنی اور عسکری میدانوں میں برسوں جاری رہی۔

اس کشمکش میں ملک میں تباہی آئی، انقلابی حکومت کا عمل دخل جہاں تک تھا، وہاں اسلامی قدروں کو نقصان پہنچا لیکن ملک میں تمدنی سہولتوں میں اضافہ ہوا، شہری زندگی میں اصلاح و ترقی ہوئی، البتہ قدیم و جدید کے درمیان کوئی معتدل راہ نہ بن سکی، جدید پسند طبقہ چونکہ طاقت و اقتدار رکھتا تھا، اس لئے اس کے اثرات زیادہ پڑے، یہ طبقہ ملک کی زندگی کو خالصۃً نا مذہبی بلکہ ملحدانہ رنگ میں رنگنے کی کوشش کرتا رہا، دوسری طرف جاہل عوام اور ان کے مذہبی اور قدیم سرکاری پیشواؤں کا طبقہ تھا جس کی تعلیم و تربیت قدیم مدرسوں اور مکتبوں میں ہوئی تھی، جہاں عصر جدید کے خطروں اور اس کے مسائل سے نہ تو بحث کی جاتی تھی اور نہ ان کے مقابلہ کے لئے ضرورت اور وقت کے مطابق مناسب تدابیر اختیار کرنے کی فکر کی جاتی تھی، جہاں کا نصاب و نظام ایسے لوگوں کو تیار کرنے سے بالکل قاصر تھا، جو وقت کے فتنوں کو بروقت شناخت کر کے ان کے مقابلہ کے لئے مؤثر تدابیر اختیار کر سکیں، چنانچہ یہ لوگ جن قدروں اور افکار کے علمبردار تھے، وہ تیزی کے ساتھ ملک کی زندگی میں اپنا اثر و مقام کھوتی رہیں۔

یمن کے جنوب میں عدن اور حضر موت کا علاقہ واقع ہے، یہ ایک عرصے تک انگریزوں کے زیر اقتدار رہا ہے، چنانچہ یہاں انگریزوں ہی کے زمانے سے دو طبقے بن چکے تھے، آزادی ملنے پر یہاں کی چھوٹی چھوٹی سترہ حکومتیں ایک وفاق میں جنوبی یمن کے نام سے منسلک ہو گئیں اور اس علاقے نے انگریزوں کے اثر سے نئے تمدن اور

ترقی پسندی کی طرف پیش قدمی شروع کی اگست تا اکتوبر ۶۷ء کے درمیان انتہا پسند کمیونسٹوں کے ہاتھوں انقلاب آیا چنانچہ ان کی سرکردگی میں اس پورے علاقہ میں قدیم روایات و زندگی کے خلاف جنگ شروع کر دی گئی اس طرح یہ اسلامی علاقہ نئی کارروائیوں کے نتیجہ میں جلد اس مقام پر پہنچ گیا جہاں صرف چند برسوں کے فرق سے برملا ملحدانہ افکار کی ترویج، شعائر دین کا استہزا اور صالح مذہبی قدروں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کا عمل جاری ہو گیا، اسلامی زندگی کو مٹانے کے لئے وہ باتیں ہونے لگیں جو دنیا کے کافر ملکوں میں بھی عام طور پر نہیں ہوتیں، اور یہ عمل کمیونسٹ ذہن رکھنے والے رہنماؤں کی سرکردگی میں ہو رہا ہے جن کی تعداد ملک میں زیادہ نہیں ہے لیکن فوج و طاقت پر ان کی گرفت ہونے کے باعث ان کے اثرات دور رس ہیں۔

اصل یمن جو اب جمہوریہ یمن کہلاتا ہے اس میں مذکورہ بالا کیفیت سعودی عرب کے مالی و سیاسی اثرات کی وجہ سے ایک حد تک کم ہے لیکن جنوب کا علاقہ جو عدن و حضرموت پر مشتمل ہے جنوبی یمن اور ڈیماکریٹک یمن کہلاتا ہے، وہاں یہ مذکورہ بالا حالات پوری طرح کارفرما ہیں، وہاں کی حکومت و زعماء روس اور دیگر کمیونسٹ ممالک سے براہ راست وابستہ ہیں اور وہیں سے رہنمائی اور مدد حاصل کرتے ہیں۔

عالم اسلام میں انقلابات اور بغاوتوں کا اصل سبب!

صحیح دینی شعور (جو اسلامی تعلیم و تربیت کا لازمی نتیجہ ہے) ان حالات کی اصلاح اور خوشگوار تبدیلی کے لئے بالکل کافی اور اس کا ضامن تھا لیکن بدقسمتی سے وہ خود اپنی طاقت کھو چکا تھا، دوسری طرف مغرب کی مادہ پرست تہذیب مبالغہ اور بلند آہنگی کے ساتھ

"حریت و مساوات" کا نعرہ بلند کر رہی تھی، اور قدیم طرزِ زندگی اور ماحول کو یکسر بدل دینے کے درپے تھی (خواہ وہ کسی شکل میں بھی ہو) اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سوسائٹی میں ایک عام بے چینی اور بددلی پھیل گئی، ان حالات کے خلاف دلوں میں نفرت کراہت اور بغاوت کا لاوا پھوٹ پڑا، اور انجام اور نتائج سے قطع نظر یہ آگ برابر تیز ہوتی گئی، اسلامی ممالک میں جو آئے دن فوجی انقلابات اور بغاوتیں ہوتی رہتی ہیں، اس کا راز اور اصل سبب یہی بے چینی اور بددلی ہے۔

شاید عالمِ اسلام میں ان انقلابات کی صلاحیت دوسرے ممالک کے مقابلہ میں اس لئے بھی زیادہ ہے کہ عالمِ اسلام میں ہزار کمزوریوں کے باوجود دینی شعور اور دینی جذبہ بہر حال موجود ہے، جو احتجاج و بغاوت اور اصلاحِ حال کی عملی جدوجہد پر کسی نہ کسی وقت آمادہ کر دیتا ہے، اور لوگ غلط اور صحیح طریقہ پر موجودہ صورتِ حال سے چھٹکارا حاصل کر لیتے ہیں۔

بہر حال جب تک عالمِ اسلام کے کسی حصہ میں عام پسماندگی اور کمزوری پائی جاتی ہے، جب تک اس کے بعض طبقوں کی غربت و افلاس کا یہ عالم ہے کہ اس کے لاکھوں افراد کو ایک وقت کا کھانا اور بدن ڈھکنے کے لئے کپڑا میسر نہیں، جب تک ایک حلقہ میں بے اندازہ دولت اور مجرمانہ زراندوزی اور عوام کی دولت کا بے حیائی کے ساتھ استعمال بے عقلی اور جنون کی حد تک جاری ہے، جب تک امراء و اہلِ ثروت کے تعیش اور فسق و فجور کے افسوسناک قصے زیبِ داستان و نُقلِ محفل بنے رہتے ہیں، جب تک جہالت و ناخواندگی عام ہے اور عوام کا بڑا حصہ تعلیم سے محروم ہے، اور عالمِ اسلام (جس کا بڑا حصہ مشرق میں واقع ہے) یا اس کے کسی حصہ کی وہی صورتِ حال قائم رہتی ہے جس کی تصویر بیسویں صدی کی ابتداء میں ترکی کے مشہور اسلامی الفکر شاعر و ادیب محمد عاکف نے بڑی خوبصورتی سے کھینچی ہے تو حساس طبیعتوں کا اس دردناک صورتِ حال کے خلاف جنگ کرنے کے لئے آمادہ ہو جانا ہر طرح قرینِ قیاس ہے، محمد عاکف اپنی ایک نظم میں کہتے ہیں:-

"لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ تم نے مشرق کی اتنے عرصہ تک سیاحت کی، آخر تم نے کیا دیکھا؟
میں کیا بتاؤں کیا دیکھا، میں نے اس سرے سے اس سرے تک ویران بستیاں، بے سری قومیں، ٹوٹے پھوٹے پل، بند نہریں، سنسان سڑکیں دیکھیں، میں نے جھریاں پڑے چہرے، جھکی ہوئی کمریں، خالی دماغ، بے حس دل، الٹی عقلیں دیکھیں، میں نے ظلم، غلامی، خستہ حالی، ریاکاری، قابلِ نفرت برائیاں، طرح طرح کی بیماریاں، جلے ہوئے جنگل، ٹھنڈے چولھے، بنجر کھیت، میلی صورتیں، نکمے ہاتھ پاؤں دیکھے، میں نے بے جماعت کے امام دیکھے، بھائی کو بھائی کا دشمن دیکھا، دن دیکھے جن کا کوئی مقصد نہیں، راتیں دیکھیں جن کی کوئی صبح نہیں۔"[1]

جب تک ان ممالک کے علماء دین اور رہنمایانِ ملت اپنے دینی فریضہ کی ادائیگی اور امراء و اغنیاء کے سامنے کلمۂ حق کہنے کی جرأت سے محروم ہیں، اور مناصب و عہدوں کے لئے کشمکش یا غیر اہم اختلافی مسائل پر جنگ و جدال اور زور آزمائی اور رسہ کشی ان کی روایت بنی رہتی ہے، جب تک دینی تربیت، زہد و تقویٰ، عزتِ نفس اور اخلاقی و دینی جرأت کی عملی مثالیں تقریباً مفقود ہیں، جب تک مخالفت پروپیگنڈا اور مخالف تحریکیں اور نظریات اسلامی معاشرہ میں چور دروازے سے (اور بعض اوقات علی الاعلان) برابر داخل ہوتے رہتے ہیں اور ان کو عالمِ اسلام کی اس آبادی میں کام کرنے کا پورا موقع مل سکتا ہے، وہاں کے اجتماعی، اقتصادی و اخلاقی حالات ان کو سہارا دیتے ہیں اور ان کے مقصد کو تقویت پہونچانے کا باعث بنتے ہیں، جب تک یہ غیر فطری اور غیر اسلامی صورتِ حال ان اسلامی ممالک میں برقرار رہے گی، اس وقت تک یہ ممالک اخلاقی و سیاسی انتشار سے دوچار اور سیاسی و فوجی انقلابات کے لئے ہر وقت تیار رہیں گے، یہ ممالک آتش فشاں پہاڑ کے دہانہ پر کھڑے ہوئے ہیں، جو کسی وقت بھی پھٹ سکتا ہے۔

---

[1] ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش ص ۱۹۳

اس صورتِ حال کا علاج

اس صورتِ حال کو کوئی فوجی طاقت، کوئی تعزیر اور سزا اور کوئی احتساب و نگرانی روک نہیں سکتی، اور نہ اخباری اور ریڈیائی پروپیگنڈا، مال و دولت کے ذریعہ قلب و ضمیر کی خریداری، سفارتوں کی پُرتکلف اور شاندار تقریبات، اہلِ دین کو خوش کرنے کے لئے کچھ منصوبے، بین الاقوامی اسلامی کانفرنسیں اور سیمینار جن سے ان ملکوں کی اسلام سے دلچسپی کا وقتاً فوقتاً اعلان کیا جاتا رہتا ہے، محدود دائرے اور دینی مظاہر اس انقلاب اور بغاوت کا راستہ روک سکتے ہیں۔

اس کا واحد راستہ یہ ہے کہ حقائق اور واقعات کا جرأت و دوراندیشی اور صحیح دینی روح اور دینی بصیرت کے ساتھ سامنا کیا جائے، اور ملک میں دین کی صحیح تعلیم کے مطابق ہمہ گیر، صالح اور ضروری تبدیلی کے لئے صدقِ دل اور اخلاص کے ساتھ کوشش شروع کی جائے، جن چیزوں کا ازالہ اور سدّباب ضروری ہو ان کا سدِّباب کیا جائے، جن اصلاحات کا نفاذ اور جن اسکیموں کا آغاز ضروری ہو، ان کے آغاز میں دیر نہ کی جائے، اسلام، قرآن اور سنتِ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں اور اسلامی حدود کے مطابق معاشرہ میں مساوات اور انصاف قائم کیا جائے، اہلِ ملک کی خوش حالی اور فارغ البالی کے لئے ضروری قدم اٹھائے جائیں، کم از کم جمہور کے ہر فرد کے لئے امکانی حد تک ضروریاتِ زندگی کا بندوبست ہو، اس بے جا اسراف اور حد سے بڑھی ہوئی فضول خرچی کو ختم کیا جائے جو عوام کی حقیقی ضروریات بھی پوری ہونے نہیں دیتی، اغنیاء و اہلِ ثروت میں ایثار کا مادہ، اور ضروریات سے فاضل مال کے خرچ کا جذبہ اور "یَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ" پر عمل کرنے کا شوق ہو، اور فقراء میں استغناء و خودداری اور اپنے گاڑھے پسینہ اور محنت و قابلیت سے اپنی ضروریاتِ زندگی کے بندوبست کا جذبہ ہو، نظامِ

تعلیم کو نئے سرے سے اس طرح ڈھالا جائے کہ وہ اسلام کے عقائد و اصول اور عصر جدید کے تغیرات اور علوم و وسائل دونوں کے ساتھ ہم آہنگ ہو اور دونوں کے تقاضے پورے کرتا ہو اور نئی نسل میں ایک طرف ایمان و یقین اخلاقی قوت، استقامت، خود اعتمادی و خودداری اپنے دین پر غیر متزلزل یقین اور اس کے لئے قربانی کا جذبہ، دوسری طرف قوتِ ایجاد، فکری استقلال، بلند ہمتی اور اولوالعزمی پیدا کرے اور جرأت و ذہانت کے ساتھ مغرب کا مقابلہ کرنے کا جوہر اور اوصاف پیدا کر سکے۔

اس انتشار اور بغاوت سے بچنے کے لئے عوام میں دینی روح، طاقت ور ایمان، اخلاقی حس اور اسلامی شعور پیدا کرنا ہوگا، اس ذہنی انتشار اور بے دلی اور بغاوت کے جراثیم کا خاتمہ کرنے کے لئے ان کے اسباب و محرکات کا مکمل ازالہ، حالات کی عمومی اصلاح اور سیرت و کردار میں تبدیلی کی ضرورت ہے، مغرب سے وہ لینا ہوگا جو اسلامی ممالک اور معاشرہ کے لئے مفید اور اس کے عقیدہ سے ہم آہنگ ہے اور بجائے خود کوئی عملی اور ایجابی افادیت رکھتا ہے اور قوم و ملک کو مضبوط کر سکتا ہے اور زندگی کی جدوجہد، سرفروشی اور دعوت الی اللہ کے مقصد میں مفید ہو سکتا ہے۔

واحد راہ

اسلامی مشرق میں قیام امن کے لئے اور مسلمان اقوام کو اپنے عقیدہ و اسلامی زندگی پر قائم رکھنے کے لئے آج کوئی اور دوسرا راستہ نہیں ہے زیادہ ٹھوس علمی تعبیر میں "عالم اسلام کو دراصل ایک ایسی ترقی پذیر عادلانہ اسلامی سوسائٹی کی تشکیل کی ضرورت ہے جس میں اسلامی طریقۂ زندگی کو اپنے علمی و ثقافتی اظہار اور نمود کا پورا موقع مل سکے۔"[1]

---

[1] یہ تعبیر محمد اسد صاحب کی کتاب ROAD TO MECCA سے لی گئی ہے!

عالَمِ اِسلام میں
تجدُّد و مغربیّت کی تحریک
اس کے حامی اور اس کے ناقد

دوسرا موقف

دوسرا موقف شکست خوردگی، مکمل سپردگی اور ایک عقیدت مند اور سرگرم مقلد اور ایک ایسے ہونہار و سعادت مند شاگرد کا ہے جو ابھی سن بلوغ کو نہیں پہونچا، اور وہ یہ ہے کہ عالم اسلام کا کوئی حصہ اس مادی، مشینی اور اپنا مخصوص مزاج و ذہن رکھنے والی تہذیب کو جوں کا توں قبول کرے اور اس کے سارے بنیادی عقائد، فکری رجحانات، مادی افکار و خیالات اور سیاسی و اقتصادی نظام پر ایمان لے آئے (جو عالم اسلام کے ماحول سے بہت دور، نہایت مختلف حالات میں پیدا ہوئے اور ان ہی حالات میں ان کی تشکیل اور پرورش ہوئی) پھر اپنے ملک میں اس کی مکمل نقل کرنا چاہے اور اس کے لئے ہر قسم کی قربانی کرنے اور اس کے لئے بڑی سے بڑی قیمت ادا کرنے پر آمادہ ہو۔

ترکی کو "مغرب" بنانے کی کوشش اور اس کے اسباب!

اس طرز فکر اور طریقہ کار کا سب سے پہلے ترکی میں تجربہ کیا گیا، ترکی میں یہ رجحان بہت سے طبعی عوامل اور ایک طویل تاریخ کا نتیجہ تھا۔

ترکی نے ایک طویل عرصہ تک کسی تیاری اور دشمن کے علمی و صنعتی ہتھیاروں سے مسلح ہوئے بغیر یورپ کا مقابلہ کیا، اس نے یورپ سے مفید علوم، ضروری صنعتوں، فوجی تنظیم کے طریقوں کو

اخذ کرنے اور ملک کو جدید طریقہ پر منظم کرنے کے ضروری کام میں کوتاہی اور تغافل سے کام لیا، علماء اور دینی رہنماؤں نے ملک و قوم کی علمی و فکری رہنمائی کے سلسلہ میں اس ذہانت و جرأت اور محنت کا ثبوت نہیں دیا جس کی ان کے منصب کے لحاظ سے ان سے توقع تھی، اور وہ ان رجحانات کی نگرانی نہ کرسکے جو اس ملک میں تیزی سے داخل ہو رہے تھے، جن میں سے بعض فطری اور حق بجانب تھے، وہ اچھے بُرے اور مفید و غیر مفید تقاضوں میں تمیز نہ کرسکے، اور علم و فکر کی اسی سرحد پر کھڑے رہ گئے جس سرحد سے علم کا قافلہ اٹھارویں صدی میں گزرا تھا[1]، اور ان سب چیزوں سے بڑھ کر یہ کہ ترکی کے آخری سلاطین نے مذہب اور خلافت کو اپنے مخصوص مصالح اور ذاتی مفاد کے لئے استعمال کیا، ملک کی پسماندگی، فوجی انحطاط، مسلسل شکستوں اور ذلت انگیز ناکامیوں میں ان سلاطین کا بھی کبھی کبھی دخل ہوتا تھا، بعض اوقات ان سلاطین اور ان کے وزراء، اور ارکانِ سلطنت نے دشمن سے بھی سازباز اور قوم فروشی سے بھی احتراز نہیں کیا، یہ واقعات اگرچہ انفرادی تھے، لیکن چھپے ڈھکے نہیں تھے، اور نوجوان طبقہ کی برافروختگی کا اپنے اندر خاصا سامان رکھتے تھے۔

دشوار اور نازک مرحلہ!

انیسویں صدی کے آخر میں ترکی کو جس صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا، وہ فطری اور قدرتی ہونے کے باوجود ایک اسلامی ملک کے لئے اپنی نوعیت کا پہلا تجربہ تھا، اسلامی معاشرہ کو اس سے پہلے دو طرح کے تجربوں سے گزرنا پڑا تھا، پہلا تجربہ وہ تھا جو پہلی اور دوسری صدی کے اسلامی معاشرہ کو پیش آیا تھا، اس کی نوعیت یہ تھی کہ اسلامی معاشرہ طاقتور، تازہ دم اور زندگی اور ترقی کی صلاحیتوں سے بھرپور تھا، اس کی حیثیت فاتح اور غالب طاقت کی تھی، اس کے بالمقابل دنیا کی دو قدیم و عظیم

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو مصنف کی کتاب "انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر"

تہذیبیں تھیں، ایک مغرب کی رومی و یونانی تہذیب دوسری مشرق کی ایرانی تہذیب، دونوں تہذیبیں
قدیم دنیا کے علوم و فنون، ثقافت و ادب، فلسفیانہ نظاموں کے ذخیرے اور تمدن و معاشرت
کے ترقی یافتہ طریقوں سے مالا مال تھیں، اسلامی معاشرہ نے جو ہر طرح کے احساس کہتری سے محفوظ اور
خود شناسی اور خود اعتمادی کی دولت سے بھرپور تھا، بغیر کسی ذہنی غلامی اور مرعوبیت کے اپنی ضرورت
اور اپنے حالات کے مطابق ان ذخیروں سے استفادہ کیا، جس چیز کو مناسب سمجھا اس کو بجنسہٖ اخذ کر لیا اور جس چیز
کو نامناسب سمجھا اس کو پہلے اپنے سانچے میں ڈھالا پھر اس کو اپنی صحیح جگہ فٹ کر لیا، آزاد اور غالب ہونے
کی بنا پر یہ استفادہ اور اقتباس اس معاشرہ کی روح اور اس کے اخلاقی رجحان پر اثر انداز نہیں ہو سکا۔

دوسرا تجربہ وہ تھا، جو اس اسلامی معاشرہ کو ساتویں صدی میں اس وقت پیش آیا جب تاتاریوں
نے عالمِ اسلام کے مرکزی حصہ پر قبضہ کر لیا، اور مسلمان سیاسی طور پر ان کے مفتوح اور زیرنگیں ہو گئے،
اس وقت اسلامی معاشرہ کو جس فاتح سے سابقہ پڑا وہ تہذیب و تمدن، علم و فن، قانون و دستور
میں بالکل فرومایہ اور تہی دست تھا، اس کے پاس نہ کوئی تہذیب تھی، نہ زندگی کا کوئی فلسفہ، معاشرتی
اجتماع اور ذہنی نشو و نما کے اعتبار سے وہ اس ابتدائی حالت میں تھا، جو صحرائی اور جنگجو اقوام کی ہوا کرتی
ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مفتوح اسلامی معاشرہ کے سامنے فاتح کی تہذیب، معاشرت، فلسفۂ حیات
اور افکار و اقدار سے متاثر و مستفید ہونے کا کوئی حقیقی سوال نہیں تھا، اس کے برخلاف فاتح قوم روز
بروز اپنی مفتوح اقوام سے متاثر ہوتی چلی جارہی تھی، وہ بتدریج اپنی مفتوح اقوام کی تہذیب، معاشرت،
علوم و فنون، اس کے ترقی یافتہ طریقۂ زندگی اور اس کے اعلیٰ دینی عقائد اور خیالات سے متاثر ہوتی
چلی گئی، بالآخر اس نے اپنی مفتوح اقوام کا دین اور ان کی تہذیب پورے طور پر قبول کر لی اور ان کے
سانچے میں ڈھل کر حرم کی پاسبان اور اسلام کی پرجوش علمبردار اور محافظ بن گئی۔

لیکن عثمانی ترکوں کو انیسویں صدی کے وسط میں جس صورتِ حال سے سابقہ پڑا وہ ان دونوں

سابقہ صورتوں سے مختلف تھی، وہ اگرچہ آزاد اور ایک بڑی سلطنت کے مالک تھے، لیکن مرورِ زمانہ کے ساتھ خود شناسی اور خود اعتمادی کا جوہر بہت کچھ کھو چکے تھے، ان میں نہ تو قرونِ اولیٰ کا جوش تھا، نہ ایمان و یقین کی وہ طاقت، اس کے بالمقابل مغربی تہذیب نئی زندگی، نئی قوت سے معمور اور نئے جوش اور نئی امنگوں سے مخمور تھی، وہ اپنے ساتھ ایک ایسا صنعتی، علمی و فکری انقلاب لائی تھی، جس کے حدود روز بروز وسیع سے وسیع تر ہوتے چلے جارہے تھے، اور جس سے صرفِ نظر کرنا ان ترکوں کے لئے ممکن نہ تھا جن کا مرکزِ سلطنت یورپ کے قلب میں تھا، اس تجربہ کو کامیابی سے گزارنے کے لئے اور اس سے فتح مندانہ طریقہ سے نکلنے کے لئے ان کو رہنمائی نہ گذشتہ اسلامی تاریخ سے مل سکتی تھی جس میں اس قسم کی کوئی نظیر نہیں پائی جاتی، نہ موجودہ عالمِ اسلام سے جس کے لئے یہ پہلا تجربہ تھا، اور جو خود ترکی کے میدان میں پیش آرہا تھا اور پورے عالمِ اسلام کی ترکی ہی پر نظر جمی ہوئی تھی کہ وہ اس سلسلہ میں کون سا موقف اختیار کرتا ہے اور ممالکِ اسلامیہ کو کیا رہنمائی دیتا ہے؟

اس نازک اور دشوار تجربہ سے عہدہ برآ ہونے کے لئے اعلیٰ درجہ کی ذہانت اسلام اور مغربی تہذیب سے گہری واقفیت، اور بہت بڑی جرأت کی ضرورت تھی، یہ درحقیقت ایک مجتہدانہ کام تھا، جس کو ترکی کو چار و ناچار انجام دینا تھا، جس میں سارا عالمِ اسلام اس کی تقلید اور پیروی کے لئے تیار تھا، اسی کام کی تکمیل پر عالمِ اسلام کے تہذیبی و فکری اور کسی حد تک دینی و سیاسی مستقبل کا بھی انحصار تھا، اس ضرورت کو نہ تو ٹالا جاسکتا تھا، نہ سرسری طور پر اس سے گزرا جاسکتا تھا، نہ اس کے لئے کوئی مہلت لی جاسکتی تھی، یہ ایک ناگزیر فریضہ تھا، جس کو جلد سے جلد ادا ہونا چاہئے تھا، اور جس کو ہر مسئلہ پر مقدم رکھنا چاہئے تھا۔

قدیم و جدید گروہ

اس فریضہ کی تکمیل کے لئے ترکی کے دو گروہوں پر نظر پڑتی تھی، ایک قدیم علماء کا گروہ جو افسوس

ہے کہ جدید تقاضوں اور جدید تبدیلیوں سے بہت حد تک ناواقف تھا، اور اس خطرہ کی سنگینی سے بہت حد تک بے خبر تھا جو یورپ کی بڑھتی ہوئی طاقت نے ترکی کے لئے پیدا کر دیا تھا، اس گروہ نے سلطان سلیم ثالث (۱۷۸۹ء۔۱۸۰۷ء) اور اس کے جانشین سلطان محمود (۱۸۰۸ء۔۱۸۳۹ء) کی نئی فوجی تنظیمات اور جدید اصلاحات کی بھی مخالفت کی تھی، جو انھوں نے ترکی کو عسکری و علمی لحاظ سے یورپ کی ابھرتی ہوئی طاقتوں کے دوش بدوش لے چلنے کے لئے نافذ کی تھیں۔

جہاں تک نئی نسل کا تعلق ہے (جو پیرس، برلن اور لندن یا خود اپنے ملک کی بعض جدید و مغربی طرز کی تعلیم گاہوں میں زیر تعلیم تھی) اس کا نشوونما، دین کی بے وقعتی، دینی مستقبل سے مایوسی، اہل دین کی تحقیر، مغربی تمدن کی غیر محدود تقدیس و عقیدت، مادی اقدار اور مغربی رجحانات و خیالات کے سامنے مکمل سپر افگندگی پر ہوا تھا، اس نسل میں دوررس اور بالغ نظر فکر کا فقدان تھا، جو مغربی فلسفۂ حیات کی تنقید پر قادر ہو، اور محسوس کر سکتا ہو کہ اس کے کمزور حصے کیا ہیں کس جگہ افراط و تفریط سے کام لیا گیا ہے، کیا چیزیں ترکی کے لئے (جو عالم اسلام کا قائد و رہنما تھا) مفید ہیں، اور ان سے استفادہ و اقتباس جائز بلکہ ضروری ہے، اور کیا چیزیں اس کے مزاج اور تاریخ، دنیا میں اس کے مقام اور کردار سے مطابقت نہیں رکھتیں اور اس کے بلند قامت پر راست نہیں آتیں؟

اس نسل کی قیادت زیادہ تر ان معلمین یا فوجی تعلیم حاصل کرنے والوں پر مشتمل تھی جن کی ثقافت نہ وسیع تھی، نہ گہری، نہ آزاد، یا وہ لوگ تھے جنھیں ان کی زندگی کے کچھ خاص تجربات، علماء اور قدامت پرستوں کی سرد مہری، بے توجہی اور جمود و تنگ نظری، قدیم نسل اور اس کے رہنماؤں میں نفاق اور قول و عمل کے تضاد کا تجربہ کرنے اور ملک میں انحطاط و پسماندگی کے عام مناظر کے مشاہدہ نے ہر قدیم چیز اور ہر قسم کے موجود نظام سے متنفر و باغی بنا دیا تھا، اور ترکی کو جلد سے جلد

"مغرب" بنا دینے کے کام پر آمادہ و کمربستہ کر دیا تھا۔[1]

ضیاء گوک الپ اور ان کا نظریہ!

فکری و ذہنی تعمیر کے میدان میں ترکی کو ضیاء گوک الپ جیسے لوگ ملے جنھوں نے بلند آہنگی اور جوش کے ساتھ ترکی کو اپنے ماضی قریب سے علیحدگی اور خالص قومی اور مادی بنیادوں پر تعمیر و تشکیل جدید کی دعوت دی۔

ضیاء گوک الپ کی ولادت دیار بکر میں ۱۸۷۵ء یا ۱۸۷۶ء میں ہوئی، اس کا خاندان حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر فائز رہا ہے، ملٹری سکنڈری اسکول کے بعد دیار بکر کے سکنڈری اسکول میں داخل ہوا، اس کو ادب و ریاضی کا خاص ذوق تھا، تاریخ سے بھی اچھی واقفیت تھی، اسکول ہی میں ضیاء نے فرنچ اور مشرقیات کی تعلیم شروع کی، اپنے فاضل چچا کی مدد سے مفکرینِ اسلام، غزالی، رومی، ابن عربی، ابن رشد، ابن سینا اور فارابی وغیرہ کا مطالعہ کیا، وہ امام غزالی کے "المنقذ من الضلال"

---

[1] مشہور ترک فاضلہ خالدہ ادیب خانم اپنی کتاب "ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش" میں انجمن اتحاد و ترقی کے ارکان پر تبصرہ کرتی ہوئی لکھتی ہیں:۔

"اتحاد و ترقی کے نوجوان ترک چھوٹے درجہ کے سرکاری ملازم یا فوجی افسر تھے، ابتداء میں ان میں ایک بھی شخص نہ تھا جو اعلیٰ علمی قابلیت رکھتا ہو اور تحلیل و تنقید سے کام لے کر پرانے اور نئے زمانہ کے فرق کو سمجھ سکے، مگر یہ لوگ جمہور سے زیادہ قریب اور خالص دیسی پیداوار تھے، ان میں زیادہ تعداد مقدونیہ کے باشندوں کی تھی جو واقعیت پسندی اور بے رحمی میں مشہور ہیں، اور اپنے مقصد کے حاصل کرنے کے لئے سب کچھ کر گزرتے ہیں، اس لئے گو وہ اعلیٰ مقصد رکھتے تھے مگر ہر طرح کے وسائل بے تکلف اختیار کر لیتے تھے۔" (ص ۱۰۱، ترجمہ شائع کردہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی)

سے زیادہ متاثر ہوا، اس لئے کہ وہ کبھی ذہنی کشمکش سے دوچار تھا، یہ وہ زمانہ تھا کہ انقلاب فرانس کے افکار و خیالات ترکی کی جدید نسل کے خون میں جوش پیدا کر رہے تھے، ضیا، کے اسکول کا ہیڈ ماسٹر آزاد خیالی اور حریت پسندی کے خیالات رکھتا تھا، اس وقت دیار بکر میں ترکی رہنماؤں اور حریت پسندوں کا ایک جلاوطن گروہ موجود تھا جس سے ضیا، نے روابط پیدا کئے، ضیا، نے اسی سلسلہ میں نامق کمال، ضیا پاشا، احمد مدحت آفندی وغیرہ کے مضامین پڑھے، عبداللہ جودت کی آمد کے بعد اس کا خفیہ تحریک سے ارتباط بڑھ گیا، یہ کرد ڈاکٹر ملحد تھا، اور ہیکل (HAECKEL) بشنر (BUCHNER) اسپنسر (SPENCER) اور لی بون (LE BON) سے بہت متاثر تھا، اسی زمانہ میں ایک یونانی استاد کے اثر سے اس کے اندر عقیدے اور عقلیت کی کشمکش پیدا ہوئی، اس نے اسلامی فلسفہ اور تصوف سے تشفی حاصل کرنی چاہی مگر بقول اس کے اس میں اس کو کامیابی نہیں ہوئی اور وہ ارتیابیت (AGNOSTICISM) میں گرفتار ہو گیا ۱۸۹۶ء میں وہ قسطنطنیہ گیا اس کو صرف ویٹرینری کالج (VETERINARY COLLEGE) میں وظیفہ مل سکا لیکن وہ تعلیم سے زیادہ سیاست سے دلچسپی لیتا تھا، اسی بنا پر انجمن اتحاد و ترقی کا رکن چن لیا گیا جو فری میسن کی طرح خفیہ کام کرتی تھی، اس کی بعض باغیانہ تحریروں کی بنا پر کالج سے اس کا اخراج ہوا اور وہ گرفتار کر لیا گیا، جیل سے چھوٹنے کے بعد اس کو دیار بکر میں نظر بند کر دیا گیا، اس عرصہ میں اس نے گہرا مطالعہ کیا، اس کی توجہ اور دلچسپی کے خاص مضامین مغربی بالخصوص فرانسیسی فلسفہ، سائیکالوجی اور سوشیالوجی تھے، وہ جلد دیار بکر کی حریت پسند عنصر کی مرکزی شخصیت بن گیا، ۱۹۰۶ء میں اس عنصر نے ضیا، کی قیادت میں جابرانہ نظام اور انتظامی شتیزی کے خلاف بغاوت کر دی ۱۹۰۹ء میں سلطان عبدالحمید خان کی معزولی کے بعد ضیا، اور اس کے رفقا، آزادی سے کام کرنے کے قابل ہوئے اس نے دو اخبارات "پیام" اور "DEGLE" جاری کئے۔

سالونیکا میں مستقل قیام اختیار کرنے کے بعد ضیا ترکی کا ایک قوم پرست لیڈر بن گیا، یہاں ترکی کے اس مغربی سرحدی علاقہ میں رہ کر اس کو روشن خیال ترک اور مغربی فضلاء سے زیادہ قریب ہونے کا موقع ملا اور اس کے اندر ترکی قومیت کی بنیاد پر اتحاد و تنظیم کے فکر نے نشو و نما حاصل کیا جس میں اسلام بنیادی عامل (FACTOR) کی حیثیت نہیں رکھتا، ۱۹۱۲ء میں جنگ بلقان کے نتیجہ میں ترکی کے زیر حکومت متعدد اسلامی ممالک (۱۹۱۲ء میں البانیہ اور ۱۹۱۶ء میں حجاز) نکل گئے جس سے تحریک قومیت وطنیت قدرۃً زیادہ مقبول اور حقیقت پسندی پر مبنی نظر آنے لگی، ترکی کی نئی نسل پر گوک الپ کا ذہنی اثر اس وقت بہت مستحکم اور وسیع ہو گیا جب وہ ۱۹۱۵ء میں (محض اپنی ذاتی قابلیت اور مضامین کی بنا پر بغیر کسی علمی سند و فراغت کے) استنبول یونیورسٹی میں علوم عمرانیہ کا استاد اول مقرر ہوا، ۱۹۱۸ء میں دوسرے محب وطن ترکوں کی طرح اس کو بھی استنبول چھوڑنا پڑا، ۱۹۲۲ء میں جب مصطفےٰ کمال نے یونانیوں پر فتح حاصل کی تو وہ رہا ہوا ۱۹۲۳ء میں وہ ہیئتِ تالیف و ترجمہ کا صدر نامزد ہوا، وہ کمال کا پر جوش حامی تھا، اور انتخاب میں اس نے اس کے لئے بڑا کام کیا تھا، اگرچہ ان سے اس کے ذاتی تعلقات کبھی گہرے نہیں ہوئے ۱۹۲۳ء میں جب پارلیمنٹ منتخب ہوئی اس میں وہ دیار بکر کا نمائندہ تھا، ۱۹۲۴ء میں وہ علیل ہوا، کمال اتاترک نے یورپ میں اس کے علاج کے مصارف کی ساری ذمہ داری لینے کا وعدہ کیا، گوک الپ نے صرف اس خواہش کا اظہار کیا کہ اس کے خاندان کا خیال رکھا جائے اور اس کی اس تصنیف کی اشاعت کا انتظام کیا جائے جو ترکی تہذیب کے موضوع پر ہے، ۲۵ / اکتوبر ۱۹۲۴ء کو ۴۸ یا ۴۹ سال کی عمر میں انتقال کیا اور مقبرہ سلطان محمود میں دفن ہوا۔[1]

ضیا گوک الپ نے مغربی تہذیب کو اختیار کرنے کی وجہ یہ بتائی کہ وہ دراصل اس

---

[1] ماخوذ از کتاب FOUNDATIONS OF TURKISH NATIONALISM از HEYD. U.

قدیم تمدن کے امتداد و تسلسل کی ایک شکل ہے جس کے نشو و نما اور حفاظت میں (بقول اس کے) ترکوں کا خاص حصہ رہا ہے، وہ اپنے ایک مضمون میں لکھتا ہے :-

"مغربی تہذیب درحقیقت بحرِ روم کی تہذیب کا امتداد (CONTINUATION) ہے، اس تہذیب (جس کو ہم بحیرۂ روم کے منطقہ کی تہذیب کہتے ہیں) کے بانی سماری (SUMERIANS) سیتھی (SCYTHIANS) فنیقی (PHOENICIANS) رعاۃ (HYKSOS) ترکی نسل سے تعلق رکھتے تھے۔

تاریخ میں قدیم زمانوں سے پہلے ایک طورانی دور کا وجود ملتا ہے، اس لئے کہ وسطِ ایشیا کے قدیم باشندے ہمارے اجداد تھے، اس کے عرصہ بعد مسلمان ترکوں نے اس تہذیب کو ترقی دی اور اس کو یورپ تک پہنچایا، پھر مغربی و مشرقی سلطنت روما کے خاتمہ کے بعد ترکوں نے یورپ کی تاریخ میں انقلاب پیدا کیا، اور اسی بنیاد پر ہم مغربی تہذیب کا جزو ہیں اور ہمارا اس میں حصہ ہے۔"[1]

مغربی تہذیب کا اختیار کرنا کیوں ضروری ہے، اس انتخاب و اختیار کے نتیجہ میں کیا انقلاب رونما ہوگا اور ترکی کے جسدِ مردہ میں کس طرح نئی قوت اور نئی روح پیدا ہو جائے گی؟ اس کا جواب دیتے ہوئے وہ لکھتا ہے :-

"جب کوئی قوم اپنے نشو و ارتقاء کا ایک بڑا فاصلہ طے کر چکتی ہے تو اپنی تہذیب کا تبدیل کرنا بھی ضروری سمجھتی ہے، جب ترک خانہ بدوش قبائل کی حیثیت سے وسط ایشیا میں تھے تو اس وقت وہ مشرق بعید کی تہذیب کے اثر میں تھے، جب سلطنت (عثمانی) کے عہد میں آئے تو بیزنطینی دائرہ اثر میں داخل رہے، اور جبکہ وہ عوامی دورِ حکومت کی طرف منتقل ہو رہے ہیں، انھوں نے مغربی تہذیب کو قبول کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا ہے۔"[2]

وہ ثابت کرتا ہے کہ اس انتخاب سے ترکی کی اسلام سے علیحدگی ضروری نہیں۔

---

[1] TURKISH NATIONALISM AND WESTERN CIVILIZATION, GOKALP. ZIA: P.267

[2] TURKISH NATIONALISM AND WESTERN CIVILIZATION P. 271

"معاشرے، مذاہب وثقافت کے اختلاف کے باوجود ایک مشترک تہذیب اختیار کرسکتے ہیں، جاپانی اور یہودی، مذہب وعقیدہ میں اختلاف کے باوجود اہلِ مغرب کے ساتھ ان کی تہذیب میں برابر کے شریک ہیں۔"[1]

وہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ مذہب اور تہذیب دو مختلف چیزیں ہیں "اسلامی تہذیب" یا "مسیحی تہذیب" ایک قسم کا مغالطہ ہے، مذہب عقیدے اور بعض عبادات و مراسم تک محدود ہے، جس کا علوم وفنون سے کوئی رشتہ نہیں۔

"کوئی ادارہ ایسا نہیں ہو سکتا جو ان گروہوں کے درمیان مشترک ہو جو مختلف مذاہب سے تعلق رکھتے ہیں، جب واقعہ یہ ہے کہ مذہب صرف ان مقدس اداروں، عقائد اور مراسم کے مجموعہ کا نام ہے تو وہ ادارے جو مذہبی تقدس نہیں رکھتے (مثلاً سائنسی افکار، صنعتی آلات و اوزار، جمالیاتی معیار) ایک علیحدہ نظام کی تشکیل کرتے ہیں، جو مذہب کے دائرہ سے خارج ہوتا ہے، ایجابی علوم جیسے ریاضیات، طبیعات، علم الحیات، نفسیات، عمرانیات، صنعتی طریقے اور فنون لطیفہ کا مذاہب سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، چنانچہ کسی تہذیب کا بھی مذہب سے انتساب درست نہیں ہے، نہ مسیحی تہذیب کا وجود ہے، نہ اسلامی تہذیب کا، ٹھیک جس طرح سے مغربی تہذیب کو مسیحی تہذیب کہنا صحیح نہیں اسی طرح مشرقی تہذیب کو اسلامی تہذیب کہنا بھی درست نہیں۔"[2]

اس انقلاب انگیز اقدام کے لئے وہ روس کی مثال دیتا ہے جس نے قدامت پسند کٹر مسیحی کلیسا کی پیروی اور مشرقی رنگ کی تہذیب سے تعلق رکھنے کے باوجود ترقی یافتہ مغربی تہذیب کو اختیار کیا اور مغرب کی آزاد و طاقت ور قوموں کی صف میں کھڑا ہو گیا، وہ لکھتا ہے:۔

---

[1] ایضاً ص ۲۷۰، ۲۶۹ [2] ایضاً ص ۲۷۲، ۲۷۱

"جب اہلِ مغرب نے اپنے کو قرونِ وسطیٰ کے اثرات سے آزاد کیا اس وقت روس کے آرتھوڈکس عیسائی اپنے کو آرتھوڈکس چرچ کا غلام سمجھتے تھے، چنانچہ روسی قوم کو بیزنطینی تہذیب سے آزاد کرنے میں اور مغربی تہذیب سے آشنا کرنے میں پطرس اعظم کو سخت دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا، یہ جاننے کے لئے کہ کسی ملک کو نمونۂ مغرب بنانے اور اس کو یورپ کے رنگ میں رنگنے کے لئے کیا وسائل و اسباب اختیار کئے جاسکتے ہیں، تاریخ اصلاحات پطرس کا مطالعہ کرنا چاہئے، اس زمانہ میں لوگوں کا خیال تھا کہ روسی ترقی کے اہل نہیں ہیں، لیکن اس انقلاب کے بعد انھوں نے بڑی تیزی کے ساتھ ترقی کے مراحل طے کئے، یہ تاریخی حقیقت اس بات کے ثبوت کے لئے بالکل کافی ہے کہ مغربی تہذیب ہی ترقی کی واحد شاہراہ ہے"۔[1]

پھر وہ یہ ثابت کرتے ہوئے کہ آزادی اور قومی وقار کی حفاظت کے لئے مغربی تہذیب پر اپنا اقتدار قائم کرنا ضروری ہے، لکھتا ہے:۔

"ہم کو دو میں سے ایک راستہ لامحالہ اختیار کرنا ہوگا، یا تو ہم مغربی تمدن قبول کریں، یا مغربی طاقتوں کا غلام رہنا پسند کریں، ہمیں ایک بات کا فیصلہ کرنا ضروری ہے، ہمارے لئے لازم ہے کہ ہم اپنی حریت کی حفاظت کے لئے مغربی تہذیب پر اپنی سیادت قائم کریں"۔[2]

ضیا گوک الپ ترکیِ جدید کے فکری معماروں میں اہم ترین حیثیت رکھتا ہے، اس نے وہ فکری اساس اور جدید نقطۂ نظر مہیا کیا جس پر ذہنی و اصولی حیثیت سے اس جدید ریاست اور جدید معاشرہ کی بنیاد رکھی گئی، پروفیسر نیازی برکس نے اس کے منتخب مضامین کا جو مجموعہ شائع کیا ہے، اس کے مقدمہ میں اس حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ ترکی کی جدید اصلاحات کے اساسی نکات پر اسی کا انداز فکر اب تک چھایا ہوا ہے، وہ کہتے ہیں:۔

---

[1] ایضاً صـ۲۷۶ [2] ایضاً صـ۲۶۶

"اگرچہ ضیا گوک الپ کا انتقال اتاترک کے انقلابی اصلاحات کے ابتدائی دور ہی میں ہو گیا تھا لیکن ان کی تحریروں میں وہ خیالات پائے جاتے ہیں جنھیں ان اصلاحات کی بنیاد کہا جا سکتا ہے، اسلامی اصلاح کے سلسلہ میں ان کے خیالات کو سب سے زیادہ نقصان شدت پسند سیکولرازم کے اس عہد میں ہوا جو ان کے بعد فوراً ہی شروع ہو گیا تھا پھر بھی بہر حال میرے نزدیک اگر وہ زندہ رہتے تو اتاترک کی پالیسی سے اپنے کو رضامند کر لینے میں کامیاب ہو جاتے، کیونکہ خلافت کے متعلق ان کے تصورات ان کے مغربی قومیت کے نظریہ کے منطقی نتائج سے یوں ہی مختلف تھے، خلافت کے موضوع پر ان کے تصورات زیادہ تر ترکی قوم پرستی کو ایک آفاقی اور بین الاقوامی بنیاد دینے کی کوشش میں "خیالستانی" پر مبنی تھے، اس کے علاوہ ہم جانتے ہیں کہ دستور میں سیکولرازم اور آزادیٔ ضمیر اور آزادیٔ فکر کی جو دفعات ہیں وہ انھیں کے قلم سے نکلی ہوئی ہیں، کیونکہ ۱۹۲۲ء میں جو نیا دستور اساسی بنانے کے لئے کمیٹی مقرر کی گئی تھی، وہ اس کے ایک ممبر تھے، اتاترک نے مثالی اصلاح کی جو انقلابی پالیسی اختیار کی تھی اس سے وہ اپنے کو شاید ہم آہنگ نہ کر پاتے اگرچہ عمل میں ان کے بعض نظریات سے ہٹ لیا گیا ہو پھر بھی ترکی کی جدید اصلاحات کے اساسی نکات پر انھیں کا اندازِ فکر اب تک چھایا ہوا ہے"[1]

آگے چل کر وہ ضیا گوک الپ کا فکری و علمی کردار بیان کرتے ہوئے ایک فکری قائد اور ایک مکتبِ فکر کے بانی کی حیثیت سے اس کی اہمیت کو اس طرح واضح کرتے ہیں:۔

"اگرچہ موجودہ عہد کے ترکی اور بیرونی عالموں کی تصنیفات کے مقابلہ میں تاریخ عوامی تمدن اور اجتماعیات پر ان کی خود تحقیقات زیادہ وقعت نہیں رکھتی ہیں، لیکن اس سکے راستہ کے امام اور بانی ہونے کی حیثیت سے ان کے مرتبہ میں مطلق کوئی فرق نہیں آتا ہے، اگر ان کے بعض تصورات

---

[1] BERKES. NIYAZI TURKISH NATIONALISM AND WESTERN CIVILIZATION (ZIYA GOKALP) P. 13, 14.

جدید ترکی میں آج بھلا دیے گئے ہیں یا اگر وہ آج معمولی سمجھے جاتے ہیں اور ان میں پوری ندرت نہیں نظر آتی ہے، جبکہ ان کے زمانہ میں وہ نئے اور اچھوتے خیال کیے جاتے تھے تو اس کا سبب یہ ہے کہ یہ نظریات اب حقائق بن گئے ہیں، اس سبب سے ان کے اثر کی گہرائی اور ان کی نظر کی وسعت کا پتہ چلتا ہے۔"[1]

ترکی کا تقلیدی کردار

مغربی تہذیب پر سیادت قائم کرنے کی دعوت کے حامل و رہنما (جن کی قیادت ضیا گوک الپ کر رہے تھے) عالمِ اسلام کے آزاد فکر اشخاص اور منصف مورخین کے حلقہ میں بڑے احترام کے مستحق تھے، اور دنیا کے سیاسی، ثقافتی اور اجتماعی نقشہ میں ترکی ایک اہم ترین کردار ادا کر سکتا تھا، اگر وہ مغربی تہذیب پر واقعی اپنی سیادت قائم کر لیتا اور اس پر قابو پانے کے بعد اس کو اعلیٰ انسانی و اسلامی مقاصد کے لئے استعمال کرتا اور اس آزاد خیال قائد کی طرح اس میں ترمیم و تصرف کرتا جو اپنے ارادہ کا مالک و مختار ہے، یا اس مجتہد عالم کی طرح جو اپنی عقلِ خداداد سے سوچتا ہے، وہ مشرق کی ان اسلامی اقوام کے لئے ایک قابلِ تقلید نمونہ اور قابلِ صد احترام پیش رو اور پیشوا بن جاتا، جو مشرق و مغرب کی اس زبردست کشمکش کا شکار ہیں اور تہذیب جدید کے کھلے ہوئے چیلنج کا سامنا کر رہی ہیں اور جن کے نزدیک ترکی ہی وہ سب سے پہلا مسلمان ملک ہے جس کو مغرب و مشرق کی کشمکش کے اس معرکہ خونیں سے گزرنا پڑا اور مغربی تہذیب اور جدید فلسفۂ زندگی کے بڑھتے ہوئے سیلاب کا رُو در رُو سامنا کرنا پڑا۔

لیکن افسوس کہ یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوا جو کچھ ہوا وہ صرف یہ کہ ترکی نے مغربی تمدن

---

[1] ایضاً صفحہ ۳۱۰

کی نقل "مطابق اصل" شروع کردی، وہ مغربی تہذیب کے ان کھوکھلے مظاہر اور سطحی اصلاحات میں الجھ کر رہ گیا جن سے قوموں اور تہذیبوں کی زندگی میں کوئی خاص فرق واقع نہیں ہوتا اور نہ اس کا حقیقی قوت اور سیاسی عظمت سے کوئی اصولی تعلق ہے' اس اقدام نے ترکی کو اپنے ماضی قریب اور اس شاندار علمی ترکہ اور ذخیرہ سے بے تعلق اور محروم کر دیا جس کی تعمیر و ترقی میں کثیر التعداد لائق ترکی نسلوں اور دماغوں نے شاندار حصہ لیا تھا، اس نے اس ترکی کو جس کے مضبوط ہاتھوں میں کل تک دنیائے اسلام کی سیاسی قیادت و تولیت تھی' اس کے لئے کلیۃً اجنبی اور پردیسی بنا دیا اور ملک کے سربراہوں اور ان عوام کے درمیان ایک زبردست خلیج حائل کر دی جو ایمان و محبت اور دینی جذبہ سے معمور و مخمور تھے' جن کے جذبہ کی قوت و عظمت کے سامنے دنیا کو بارہا عزت و احترام کے ساتھ سر جھکانے پر مجبور ہونا پڑا تھا، اور جنھوں نے (ملک کی داخلی کمزوریوں اور فوجی حکام کی بددیانتی اور خیانت کے باوجود بھی) یورپ کے متواتر حملوں اور مسلسل سازشوں کا مقابلہ کیا تھا، اس غیر دانشمندانہ و مقلدانہ اقدام نے قوم سے اعتماد و سرخوشی اور جوش و گرمجوشی کی وہ دولت بے بہا چھین لی جو اس عظیم مسلم قوم کا امتیاز و خصوصیت رہی ہے' اس نے ترکی معاشرہ میں اضطراب و انتشار، نیم دلی، افسردگی اور مایوسی پیدا کر دی۔

جدید معاشرہ کی تشکیل کے لئے ترکوں کے دینی شعور اور اسلامی جذبہ کو کچلنے کے لئے اور قوم کا رخ مادیت' قوم پرستی اور مغربی تمدن کی نقالی کی طرف پھیر دینے اور اس کو ایک محدود دائرہ کے اندر محصور کر دینے کے لئے اس سنگ دلی اور تشدد سے کام لیا گیا جس کی نظیر کم ملے گی، اس کا شکار زیادہ تر وہ لوگ ہوئے جن سے ملک و قوم کو بے حد فائدہ پہونچ سکتا تھا، ترکی کے حکمرانوں اور بے بس و مجبور عوام کے درمیان عقلیت اور طرز فکر کی یہ کشمکش آج بھی موجود ہے' ایمان کی چنگاری دلوں میں اب بھی پوشیدہ ہے' اور ادنیٰ اشارہ اور معمولی تحریک سے وہ دلوں کے اندر بھڑک اٹھنے

کے لئے تیار ہے۔

مغربی تہذیب سے استفادہ کے میدان میں ترکی کا پارٹ خالص تقلیدی پارٹ تھا، جو ہر قسم کی تخلیقی قوت، جدتِ فکر، خود کفالتی، بلند خیالی اور حوصلہ مندی سے خالی تھا، اس نے اس تہذیب پر اپنی سیادت (SUPREMACY) قائم کرنے کے لئے جو مادہ پرست مغرب سے آئی تھی، اور جس کا خواب ضیا، گوک الپ نے اپنے گذشتہ مقالہ میں دیکھا تھا کوئی ٹھوس اور سنجیدہ کوشش نہیں کی، وہ اس کی قیادت پر قبضہ کرنے اور اس پر قابو حاصل کرنے میں پوری طرح ناکام رہا، اس کا پارٹ صرف "درآمد" (IMPORT) کرنے، مستعار لینے یا نقل کرنے کا تھا، نہ اس سے زیادہ نہ اس سے کم چنانچہ اس دور میں نہ تو سائنسی علوم میں کوئی ممتاز عالم ترکی میں پیدا ہوا، نہ دوسرے علوم و فنون میں کوئی اہم شخصیت نمودار ہوئی، نہ فکر اور فلسفہ کے شعبہ میں کسی نئے مدرسہ اور مکتبِ خیال کا بانی ترکی کو نصیب ہوا نہ کوئی ایسی شخصیت سامنے آئی جو اس تہذیب میں کسی ایسی چیز کا اضافہ کرے جس کی بجائے خود کوئی علمی قیمت اور افادیت ہو، یہی وجہ ہے کہ آج یہ قوم ایک تیسرے درجہ کی قوم کی حیثیت سے مغربی ممالک کے زیر سایہ پل رہی ہے، ترکی کا موجودہ انقلاب اس سیاسی عظمت، بین الاقوامی وقار، دینی حمیت اور گرم جوشی، اخلاقی اقدار و محرکات اور عالم اسلام کی قیادت و رہنمائی کی قیمت کسی طرح نہیں بن سکتا جس کی قربانی ترکی کو دینی پڑی ہے۔

نامق کمال

مغربی تہذیب و علوم سے استفادہ کی زیادہ متوازن دعوت اور ترکی و مغرب جدید کے تعلق کی نوعیت کی بہتر وضاحت ترکی کے ایک پیش رو مفکر نامق کمال[1] کے خیالات و مضامین میں

---

[1] نامق کمال ۱۸۴۰ء میں (RHOBOSTO) میں پیدا ہوا وہ ایک خوش حال اور امیر خاندان کا فرد تھا گھر پر (باقی ص۱۰۴پر)

ملتی ہے جنھوں نے مغرب سے ان شعبوں میں استفادہ کی دعوت دی جن کی وجہ سے مغربی اقوام کو ترقی،

(باقی صـ۶۹ کا) عربی، فارسی اور فرنچ کی تعلیم پائی، سترہ سال کی عمر میں حکومت کی ملازمت میں داخل ہوا، وہ نوجوانی میں ترکی کے مشہور مفکر اور محب وطن رہنما ابراہیم شیناسی (۱۸۲۶ء تا ۱۸۷۱ء) سے متاثر ہوا، اور ان کے مشہور رسالہ "تصویر افکار" کی ادارت میں شامل ہوگیا، ۱۸۶۵ء میں جب شیناسی نے فرانس میں پناہ لی تو اس نے اس رسالہ کی ادارت سنبھالی اور ایک سیاسی اخبار نویس اور مقالہ نگار کی حیثیت سے نمایاں ہوا، اپنے جرأت مندانہ خیالات اور مضامین کی پاداش میں ۱۸۶۷ء میں اسے بھی ترک وطن کرنا پڑا، اس نے جلاوطنی کے تین سال لندن، پیرس اور وی آنا میں بسر کئے، وہاں اس نے جدید قانون اور اقتصادیات کا مطالعہ کیا، ۱۸۷۰ء میں ترکی واپس ہوا اور اپنے شہرۂ آفاق ڈرامہ "وطن" کے نتیجہ میں جس نے آزادی اور حب الوطنی کا عام جوش پیدا کردیا تھا، وہ قبرص جلاوطن کردیا گیا، ۱۸۷۶ء میں سلطان عبدالعزیز کی معزولی کے بعد واپس ہوا لیکن پھر جلد حکومت کا معتوب ہوا اور اپنی زندگی کا آخری سال نظربندی یا جلاوطنی میں گذار کر ۱۸۸۸ء میں وفات پائی۔

برنارڈ لوئیس (BERNARD LEWIS) اپنی کتاب (THE EMERGENCE OF MODERN TURKEY) میں لکھتا ہے۔

"اپنی پرجوش حب الوطنی اور آزاد خیالی کے باوجود نامق کمال سچا اور پرجوش مسلمان تھا اس کے مضامین میں جس مادر وطن (ترکی) کا تذکرہ آتا ہے اگرچہ اس کی بنیاد فرقہ کے بجائے علاقہ پر ہے وہ اس کے تصور میں ایسا ہی خالص اسلامی ہے جیسے عثمانی سلطنت کا تصور تھا، وہ اپنی پوری زندگی میں شدت کے ساتھ مسلمانوں کے روائتی اقدار و عقائد سے وابستہ رہا ہے اس نے بسا اوقات "تنظیمات" کے رہنماؤں پر بڑی تیز و تند تنقید کی کہ وہ قدیم اسلامی روایات کے تحفظ میں ناکام رہے اور انھوں نے یورپ سے جدید خیالات اور اداروں کو درآمد کیا۔

نامق کمال نے اسلامی اقدار کی علم برداری کی اور جب یورپین مصنفوں نے اسلام کو گھٹا کر پیش کرنے کو اپنا

(باقی صـ۷۱ پر)

فارغ البالی اور فوقیت حاصل ہوئی ہے" پروفیسر نیازی برکس "مجموعۂ مضامین ضیا گوک الپ" کے فاضلانہ مقدمہ میں لکھتے ہیں:۔

"جس شخص نے جدید صورت حال کی غیر صحت مندی کی تشخیص کی اور اس کو ایک جدید ریاست کے قیام کے راستہ کی سب سے بڑی رکاوٹ تسلیم کیا وہ نامق کمال (۱۸۴۰ء۔۱۸۸۸ء) تھے انھوں نے ان دینی، اخلاقی اور قانونی اداروں کی اصلی یا مثالی شکل پیش کرنے کی کوشش کی جو اسلام سے منسوب کیے جاتے ہیں، اور قدیم عثمانی روایات کے عروج کے زمانہ کے سیاسی اداروں کی بھی اصلی اور مثالی شکلیں پیش کیں، اور مغربی تہذیب کے ان پہلوؤں کو بھی نمایاں کیا جن کی وجہ سے مغربی اقوام کو ترقی، فارغ البالی اور فوقیت حاصل ہوئی تھی، ان تینوں عناصر پر بحث کر کے وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ ان میں کوئی بنیادی اختلافات نہ تھے، ان کے نزدیک اسلام معاشرہ کی اخلاقی اور قانونی بنیادیں فراہم کرتا ہے، ریاستی امور میں عثمانی روایت اور اس کی متعدد قومیتوں اور متعدد مذاہب کے درمیان رواداری کی آفاقی پالیسی کو عثمانی روایت (ترکی ریاست نہیں) کے سیاسی ڈھانچہ کی بنیاد بنایا جاتا اور مغربی تہذیب کے وہ مادی اور علمی طریقے اور اسلوب سیکھے جاتے جس سے اس نظام کو طاقت اور معاشی ترقی کی ہم عصر دنیا میں استحکام حاصل ہوتا۔

اس طرح نامق کمال نے انیسویں صدی کی ترکی کے تینوں عناصر کو الگ الگ کیا اور ان کے حدود کی نشان دہی کی، ان کے خیال میں تنظیمات کی ناکامی کا سب سے بڑا سبب ان تینوں عناصر کے بارے میں ذہنی انتشار تھا، مثلاً شریعت یعنی اسلامی قانون کو تو فرانس سے ضابطہ قانون

(باقی ص ۶۹ کا) پیشِ نظر رکھا ہے ان کے مقابلہ میں اس کے کارناموں کو نمایاں کیا، حتیٰ کہ عثمانی قیادت میں بین الاقوامی اسلامی اتحاد کا بھی تصور پیش کیا، تاکہ اس تحریک کو ایشیا اور افریقہ میں اپنا کر اور اس کی اشاعت کر کے یورپ کے مقابلہ میں ایک مشرقی طاقتی توازن پیدا کیا جا سکے۔" (ص ۱۳۳ تا ۱۳۵)

مستعار لینے کی خاطر ترک کر دیا گیا، جبکہ تعلیم، حکومت، سائنس، معاشیات اور زراعت کے سلسلہ میں مغربی طریقوں اور اسلوبوں کو جاری نہیں کیا گیا۔

ترکی ریاست کو ایک جدید ریاست بنانے کی طفلانہ خواہش میں تنظیمات کے اصلاحات کے بانیوں نے بلا سبب یورپین طاقتوں کے احسانات، معاشی اور سیاسی معاملات میں قبول کرلئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ریاست عثمانی اپنی آزادی اور سالمیت کھو بیٹھی، انھوں نے انتظامی معاملات میں جدید جمہوری نظاموں کا ایک بھی اصول رائج نہیں کیا جبکہ نہ تو قدیم عثمانی سیاسی ادارے اور نہ اسلامی قانون میں کوئی بات ایسی تھی جو جمہوریت یا ترقی یا جدید سائنس سے ہم آہنگ نہ کی جا سکتی۔[1]

لیکن باوجود نامق کمال کی عام مقبولیت اور اس گہرے اثر کے جو اس نے ترکی کی جدید نسل اور خود ضیا گوک الپ اور ان کے معاصرین پر ڈالا اور جس کا اعتراف خالدہ ادیب خانم نے ان الفاظ میں کیا ہے کہ "نامق کمال ترکی جدید کی محبوب ترین شخصیت تھی، ترکی کے افکار و سیاسیات کی تاریخ میں ان سے زیادہ کسی دوسری شخصیت کی پرستش نہیں کی گئی"[2] اس کا متوازن فکر اور نسبتاً معتدل دعوت ترکی کی جدید تشکیل میں اتنی مؤثر ثابت نہیں ہوئی، جیسی ضیا گوک الپ کی مغربی تہذیب اور اصولِ سیاست کے اختیار کرنے کی پرجوش دعوت، ضیا کے فلسفہ اور فکر کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ترکی کو ایک نہایت طاقتور اور عملی آدمی مل گیا، جس نے اس کے تصور اور منشا سے بھی آگے بڑھ کر ترکی کو مغربیت کے سانچہ میں ڈھالنے کا عزم کر لیا، یہ کمال اتاترک کی شخصیت تھی۔

BERKES, NIYAZI: TURKISH NATIONALISM AND WESTERN CIVILIZATION ۱؎
(GOKALP, ZIYA) P. 17-18

KHALIDE EDIB: TURKEY FACES WEST P, 84 ۲؎

کمال اتاترک کا فکری نشو ونما، ذہن ومزاج اور طبعی خصوصیات

مصطفےٰ کمال کے والد کا نام علی رضا بے تھا، ۱۲۹۸ھ ۱۸۸۱ء میں سالونیکا میں پیدا ہوئے، ان کا اصل خاندان اناطولیہ کے ایک گاؤں میں آباد تھا، پہلے ایک ایسے ابتدائی مدرسہ میں داخل ہوئے جو یورپین طرز پر چلایا جا رہا تھا، پھر ایک ہائی اسکول میں رہ کر ایک سال تعلیم حاصل کی پھر اس کو چھوڑ کر فوجی کالج میں داخلہ لیا اس کے بعد استنبول کے فوجی کالج میں داخل ہوئے، اور فوجی افسر کی حیثیت سے ملک کے سامنے آئے، یہ سلطان عبدالحمید ثانی کا عہد تھا، ان کے خلاف مصطفےٰ کمال بعض سازشوں میں ماخوذ ہوئے اور گرفتار ہو کر دمشق جلاوطن کر دیئے گئے، وہاں سے خفیہ طور پر سالونیکا بھاگ آئے اور انجمن اتحاد وترقی میں شامل ہو کر فوج میں بھرتی ہو گئے اور مقدونیہ کی ریلوے لائن کی تعمیر ان کے سپرد ہوئی، ۱۳۲۷ھ ۱۹۰۹ء میں سلطان عبدالحمید معزول ہو گئے ۱۹۱۰ء میں وہ اماجی بن کر فوجی مشن پر فرانس گئے، اس سفر نے ان کو ترکی کی ترقیات اور انتظامات کی طرف سے غیر مطمئن اور جرمنی کے بڑھتے ہوئے اثرات کی طرف سے بے چین کر دیا، اس وقت ترکی پر عملاً چار آدمیوں کی حکومت تھی انور، طلعت، جاوید اور جمال، مصطفےٰ کمال کا ان سے سخت اختلاف تھا، کمال کو بین الاقوامی مقاصد یا ترکی کے باہر عثمانی سلطنت کی توسیع سے کوئی دلچسپی نہ تھی، وہ اس پالیسی کو ملک کے لئے مہلک اور تباہ کن سمجھتے تھے، ادھر انور ان کو ناپسند کرتے تھے، ۱۹۱۲ء میں جنگ بلقان شروع ہوئی، وہ بلقانی شہروں سے مہاجرین اور پناہ گزینوں کے ہجوم، ان کی بے بسی اور ناگفتہ بہ حالت سے سخت متاثر ہوئے، بلقان کی ریاستوں میں اختلاف ہو جانے کی وجہ سے ترکوں نے اڈریانوپل پر دوبارہ قبضہ کر لیا، انور وزیر جنگ ہوئے اور وہ اپنی ترقی واعزاز کے آخری مدارج پر پہونچے، انور کی کوشش تھی کہ تمام مسلمانوں کو خلیفۃ المسلمین کے جھنڈے کے نیچے لے آئیں انور نے جرمنوں کو ترکی کی

فوجی تنظیم کا کام سپرد کیا، مصطفےٰ کمال کو یہ بات سخت ناپسند تھی، ۱۹۱۴ء میں جنگِ عظیم شروع ہوئی اور انور اور ان کے رفقاء کے دباؤ سے ترکی، جرمنی کے ساتھ باقاعدہ جنگِ عظیم میں شریک ہو گیا، کمال کی رائے تھی کہ ترکی کو غیر جانبدار رہنا چاہیے اور جس فریق کی فتح ہو اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے، کمال نے اپنی مرضی کے خلاف اس جنگ میں بہادرانہ حصہ لیا اور ۱۹۱۵ء میں گیلی پولی کے معرکہ میں زبردست کارنامہ انجام دیا اور اسی سے ان کی شہرت شروع ہوئی، ۱۹۱۶ء میں وہ قفقاز کے محاذ پر بھیجے گئے، ۱۹۱۷ء کے آغاز میں ان کو حجاز کی کمان سپرد ہوئی، لیکن ان کے کمان سنبھالنے سے پہلے حجاز کا تخلیہ ہو چکا تھا، اس سال سے وہ جنرل کے عہدہ پر فائز ہو کر دیار بکر قائم مقام کمانڈر بنا کر بھیجے گئے، ۱۹۱۸ء میں جرمنی اور ترکی کی شکست کے ساتھ یہ جنگ ختم ہوئی، سابق وزراء اور ترکی کے رہنما ملک چھوڑنے پر مجبور ہوئے اور کمال کے لئے میدان صاف ہو گیا، برطانیہ اور اس کے اتحادیوں نے استنبول پر قبضہ کر لیا، اناطولیہ میں بڑی بدامنی پھیل گئی، اس وقت امن قائم کرنے کے لئے مصطفےٰ کمال کا انتخاب ہوا، انھوں نے یونانیوں کے خلاف جنھوں نے ازمیر پر قبضہ کر لیا تھا، اعلانِ جنگ کر دیا اور ۱۹۱۹ء میں سقاریہ کے معرکہ میں ان کو شکستِ فاش دی اور غازی کا لقب حاصل کیا، اس کے بعد انگورہ میں ایک آزاد حکومت قائم کی، خلافت اور عثمانی سلطنت کے خاتمہ کا اعلان کیا اور ایک غیر مذہبی جمہوریہ قائم کیا جس کے ۱۹۲۳ء میں وہ پہلے صدر منتخب ہوئے اور اسی حالت میں ۱۹۳۸ء میں انتقال کیا۔[1]

کمال اتاترک کی قیادت میں ترکی نے لا مذہبیت (سیکولرازم) اپنے ماضی سے انحراف بلکہ بغاوتِ شدید جذباتی مغربیت اور عسکری آمریت کا جو رخ اختیار کیا، اس کے وجوہ و اسباب سمجھنے کے لئے اس تحریک و رجحان کے فکری و سیاسی قائد اور ترکی جدید کے معمارِ اعظم کمال اتاترک کے ذہنی ارتقاء، فکری نشو و نما اور اس کی مزاجی کیفیت کے سمجھنے کی ضرورت ہے۔

---

[1] ملاحظہ ہو ATATURK (IRFAN ORGA), GREY WOLG (ARMSTRONG)

اس لئے کہ جمہوریت و عوامیت کے ادعا کے باوجود وہ ممالک جو کسی فوجی آمر کے قبضۂ تصرف میں آجاتے ہیں، وہ بہت حد تک اس کی شخصیت و مزاج کا عکس بن کر رہ جاتے ہیں، اور ان کی جدید تشکیل کو سمجھنے کے لئے ان آمرین (DICTATORS) اور ان کے عناصر ترکیبی کو سمجھنے کی ضرورت ہوتی ہے، اس موقع پر ہم کمال اتاترک کے مستند و ہمدرد ترک سوانح نگار عرفان اورگا (IRFAN ORGA) کی کتاب "اتاترک" (ATATURK)[۱] کے ان اقتباسات کے پیش کرنے پر اکتفا کریں گے جو کمال کے کیرکٹر اور مزاج پر روشنی ڈالتے ہیں۔

"وہ کالج کی زندگی میں کم آمیز اور حلقۂ احباب میں نامقبول تھا، اس کے قریبی دوست بہت کم تھے، وہ جلد اشتعال میں آجاتا تھا، وہ اپنے درجہ کا ایک مثالی و بے نقص طالب علم، شوقین و ذہین تھا، جنس (SEX) اس کے لئے مقناطیس کی کشش رکھتی تھی۔

وہ شراب نوشی سے تسکین حاصل کرتا تھا، اس لئے کہ روحانی تسکین کے لئے اس کے اندر نہ خدا کا اعتقاد تھا نہ زندگی بعد موت کا یقین۔[۲]

دوسروں پر ظلم کر کے خوشی حاصل کرنے کی جو فطری خصوصیت اس کے اندر تھی اس کا اظہار ہوا، وہ دوسروں کے جذبات کو کبھی تسلیم نہیں کرتا تھا، اس لئے کہ وہ کسی کو اپنا ہمسر نہیں سمجھتا تھا، اس کے اندر دوسروں کو مفتوح و مغلوب بنانے اور ان کو اپنی مرضی کے سامنے سرنگوں کرنے کی فطری خواہش پائی جاتی تھی، وہ ہمیشہ چوٹی پر رہنا پسند کرتا تھا۔

مناستر میں اس کا تعارف والٹیر اور روسو کی تحریرات سے ہوا جنھوں نے اس کو اپیل کیا اور اس کے خوابیدہ جذبۂ بغاوت کو بیدار کر دیا۔[۳]

---

۱ IRFAN ORGA MARGARETE: "ATATURK" (MICHAEL JOSEPH LTD. LONDON) 1962

۲ P. 251

۳ IBID P. 251

جوانی میں اس نے اپنے انقلابی افکار کے ساتھ ضیا گوک الپ کی تعلیمات کو بھی اچھی طرح جذب کیا تھا، ضیا گوک الپ نے روشن خیالی اور مذہبی خیالات کی آزادی کے لئے جنگ کی تھی، وہ مغربی روشن خیالی کا بہت بڑا نقیب تھا، اس نے ۱۹۱۸ء ہی میں اس خیال کا اظہار کر دیا تھا کہ سلطنت عثمانیہ کے لئے زوال و انتشار مقدر ہو چکا ہے، اس لئے کہ اس نے شخصی حکومت کے اصول کو آنکھ بند کر کے پکڑ رکھا ہے، وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ "دینی حکومت، شخصی حکومت کی وفادار حلیف ہوتی ہے" اس نے مذہبی اقتدار سے آزادی حاصل کرنے کی پرزور حمایت کی تھی، وہ علماء کے اختیارات کو محدود کر دینے کے حق میں تھا، مختلف مذہبی برادریاں اور مذہب کے پرجوش حامیوں کے حلقے جو (بقول اس کے) شیطان کے آلۂ کار بن کر جہاد کا نعرہ لگاتے رہتے ہیں، مقید و پابند ہونے چاہئیں، اس نے شریعت کے خاتمہ اور ان قاضیوں کی دینی عدالتوں کی منسوخی کی پرزور وکالت کی تھی، جو اسلامی قانون کے شارح و ترجمان ہیں، اس کے نزدیک ان کی جگہ پر نئی قانونی عدالتوں اور سول کورٹس کو آنا چاہیے۔[1]

مذہب اور بالخصوص اسلام کے بارے میں اس کے عقیدہ اور نقطۂ نظر اور اس کے اصلی خیالات و احساسات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

"اس نے اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ اس کی اصلی جنگ مذہب کے خلاف ہے، بچپن سے اس کے نزدیک خدا کی کوئی ضرورت نہیں تھی، وہ محض ایک پراسرار اور مغالطہ آمیز مجرد نام تھا، جس میں کوئی حقیقت نہیں تھی، وہ صرف اس چیز پر یقین رکھتا تھا جو دیکھنے میں آسکتی تھی،[2] اس کا خیال تھا کہ زمانۂ ماضی میں اسلام محض ایک تخریبی طاقت رہا ہے، اور اس نے ترکی کو بہت نقصان پہنچایا ہے، اس نے اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا تھا کہ اسلام ہی کی عطا کی ہوئی وحدت نے

---

[1] ص ۲۹۶ [2] اس کتاب میں مصنف نے ایک جگہ یہ بھی لکھا ہے کہ آخری زمانہ میں کبھی کبھی کمال آسمان کی طرف منہ کا اٹھا کر اشارہ کرتا تھا

وسیع عثمانی سلطنت کی تعمیر کی تھی اس کا خیال تھا کہ اسلام کی بدولت لوگ جمود و اوہام کی دلدل میں دھنسے رہے" اس کو اس آدمی سے سخت نفرت تھی جو تقدیر کے سامنے ہاتھ پھیلاتا ہے اور کہتا ہے کہ "یہ خدا کی مرضی تھی" "یہ مقدر کی بات ہے" اس کا عقیدہ تھا کہ خدا کا کہیں وجود نہیں، اور انسان ہی اپنی تقدیر بناتا ہے، وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ دماغ کی طاقت اور قوت ارادی خدا کی "بے حسی" اور "بے رحمی" پر غالب آجاتی ہے، لیکن مذہبی لوگوں کا کہنا ہے کہ "خدا کے یہاں دیر ہے اندھیر نہیں" وہ کہتا تھا "کیا ان مذہبی لوگوں کو ابھی تک برقی طاقت کی اطلاع نہیں جو بہت تیزی سے کام کرتی ہے؟" اس کا مصمم ارادہ تھا کہ مذہب کو ممنوع قرار دے دے خواہ اس کے لئے طاقت استعمال کرنی پڑے، خواہ دھوکہ اور فریب سے کام لینا پڑے۔"[1]

ایک دوسری جگہ لکھتا ہے:۔

"اس کے نزدیک نفسیاتی اصول و نظریات اور فلسفیانہ اصطلاحات کے کوئی معنی نہیں تھے، اسی لئے قدرتی طور پر ترکی قوم کے لئے مذہب کو غیر ضروری اور بے کار قرار دینے میں اس کو کوئی تامل نہیں تھا، لیکن مذہب کی جگہ پر اس نے اگر کوئی چیز ترکی قوم کو دی تو وہ "نیا دیوتا" تھا یعنی مغربی تہذیب اس میں اچنبھے کی بات نہ تھی کہ قوم نے اپنی روح کے لئے جنگ کی، دوسری تہذیبوں کی گذشتہ تاریخ سے اس نے یہ سبق حاصل کیا تھا کہ پرانے دیوتا ذرا مشکل سے مرتے ہیں (اس لئے خدا کا خیال ترکی قوم کے دل سے دیر ہی میں نکلے گا)۔"[2]

دوسری جگہ لکھتا ہے:۔

"اسلام اور راسخ العقیدہ مذہبیت سے اس کو شدید نفرت تھی جس خدا کا وہ قائل تھا، وہ اس کے نزدیک کسی قید و بند کا محتاج نہ تھا، اس کے نزدیک وہ خدا ہر چیز میں تھا، وہ کہتا تھا کہ

---

[1] IBID. P. 237-238

[2] IBID P. 246

ہم کو ہر پہلو سے مرد بننا ہے، ہم نے بڑی مصیبتیں اٹھائی ہیں، ہماری مصیبتوں کا سبب یہ تھا کہ ہم نے یہ سمجھنے کی کوشش نہیں کی کہ دنیا کس راستہ جارہی ہے، ہم کو اس کی کوئی پرواہ نہیں کرنی چاہئے کہ کوئی کیا کہتا ہے، ہم مہذب وشائستہ بن رہے ہیں اور ہم کو اس پر فخر کرنا چاہئے، عالم اسلام کے بسنے والے دوسرے مسلمانوں پر نظر ڈالو، وہ کس تباہی، مصیبت اور حوادث کا شکار ہیں، کیوں؟ اس لئے کہ وہ اپنے دماغ سے کام لے کر اپنے کو اس روشن وبلند پایہ تہذیب میں فٹ نہیں کرسکے یہی سبب ہے کہ ہم بھی اتنے طویل عرصہ تک پسماندگی وتنزل کا شکار رہے، اور اب آخری گڑھے میں گرگئے، ان پچھلے برسوں میں اگر ہم اپنے کو بچانے میں کچھ کامیاب ہوئے ہیں تو وہ اس وجہ سے کہ ہماری ذہنیت تبدیل ہوگئی، مگر اب ہم کسی جگہ ٹھہر نہیں سکتے، ہم آگے بڑھنے کے لئے اٹھے ہیں اور ہم برابر آگے بڑھ رہے ہیں، خواہ کچھ بھی واقع ہو، اب ہمارے لئے کوئی دوسرا راستہ نہیں، قوم کو سمجھ لینا چاہئے کہ تہذیب ایک ایسی جلتی ہوئی آگ ہے، جو ان سب کو جلا اور خاک سیاہ کردیتی ہے، جو اس کو خراج عقیدت نہیں ادا کرتے۔[1]

ایک دوسری جگہ اس کی نفرت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے :۔

"یہ کوئی راز کی بات نہیں تھی کہ مصطفےٰ کمال ایک غیر مذہبی آدمی تھا، اس بنا پر یہ افواہ گرم تھی کہ خلافت کی تنسیخ جلد عمل میں آنے والی ہے، اس بات سے اور سنسنی پھیل گئی کہ مصطفےٰ کمال نے شیخ الاسلام کے سر پر جو اسلام کے بڑے عالم اور ایک قابل احترام بزرگ تھے، قرآن مجید پھینک کر مارا، اس کا نتیجہ مصطفےٰ کمال کی فوری موت کے سوا کچھ نہیں ہوسکتا تھا، لیکن یہ واقعہ پیش نہیں آیا اور یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ زمانہ بہت بدل گیا ہے۔"[2]

مغربی تہذیب سے جو اس کو عشق وشیفتگی اور اس کی نظر میں اس کا جو تقدس اور احترام

---

[1] IBID P. 297

[2] IBID P. 239

تھا، اور جس طرح وہ اس کے اعصاب و جذبات پر مستولی تھی، اس کا ذکر کرتے ہوئے مصنف مذکور لکھتا ہے:

"بڑی حد تک مصطفےٰ کمال جس چیز کی تلقین کرتا تھا اس پر وہ خود بھی عامل تھا، وہ اس نئے
خدا (تہذیب جدید) کا پرجوش پجاری اور اس کا ایک وفادار حواری تھا، اس نے اس لفظ
"تہذیب" کو ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیلا دیا، جب وہ اس تہذیب کے
متعلق کوئی گفتگو کرتا تو اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو جاتی تھی اور اس کے چہرے پر ایسی کیفیت
نمودار ہوتی تھی جو کسی صوفی کے مراقبۂ جنت کے وقت اس کے چہرے پر نظر آتی ہے۔"[1]

تہذیب سے متعلق اس کا تخیل کیا تھا، اور وہ ترکی قوم کو کیا دیکھنا چاہتا تھا؟ اس کا
اندازہ حسب ذیل بیانات سے ہوگا، مصنف لکھتا ہے:۔

"مصطفےٰ کمال اپنی قوم سے کہتا تھا، ہم کو ایک مہذب و شائستہ قوم کا سا لباس پہننا چاہئے
ہم کو دنیا کو دکھانا چاہئے کہ ہم ایک بڑی قوم ہیں، ہم کو دوسری قوم کے ناواقف لوگوں کو اپنے پرانے
فیشن کے لباس پر ہنسنے کا موقع نہ دینا چاہئے، ہم کو زمانہ کے ساتھ ساتھ چلنا چاہئے۔"[2]

"اس کے بعد ذہن میں ایک اصلاح شدہ نئے سانچے میں ڈھلے ہوئے ترکی کا تخیل تھا، لیکن اس کے
حصہ میں جو انسانی کچا مال (قوم) آئی تھی وہ ایک بیزار اداس اور ایک ان گھڑ انسانی مجموعہ تھا،
جیسے جنگ کے دوران میں فوج میں بھرتی ہونے والے نئے رنگروٹ ہوتے ہیں، اس نے ایک ایسے
آدمی کی حیثیت سے تنہا کام کرنا شروع کیا جو طاقت کا سرچشمہ تھا، جس کو اپنے سوا کسی کے فیصلہ
پر اعتماد نہیں تھا، جس کو دوسروں کے کاموں میں مداخلت کرنے کا خبط تھا، اور جس کے اندر لڑا
کے ساتھ ذہنی طاقت بھری ہوئی تھی۔"[3]

ترکی قوم کو جلد سے جلد مغربی اقوام کے رنگ میں رنگ دینے اور مکمل طور پر ان کا ایسا ہم رنگ

---

[1] IBID P. 273
[2] IBID P. 260
[3] IBID P. 244

بنا دینے کے لئے جس کے بعد کوئی امتیاز نہ رہے۔

تا کس نہ گوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

اس نے ترکی ٹوپی اور سر کے ہر لباس کو خلافِ قانون قرار دیا اور ہیٹ کا استعمال لازمی کر دیا، اور اس بارے میں اتنی شدت برتی کہ گویا اس سے بڑھ کر کوئی اصلاح اور ترکی قوم کی زندگی اور عزت کے لئے کوئی شرط نہ تھی، یہ ہیٹ کی وہ خوں ریز جنگ تھی جس نے جنگ صلیبی کی شکل اختیار کر لی، ترک سوانح نگار اس معرکہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

• فسادات اور بلوے اس قدر سخت تھے اور صورت حال اتنی خطرناک ہو گئی کہ ایک کروزر کو بحرِ اسود کے ساحل پر ہر وقت چوکنا رہنے کی ہدایت ہوئی، ملک میں جا بجا عدالتیں قائم ہوئیں اور انھوں نے اپنا کام شروع کیا، ان باتوں نے بلوائیوں کو اور زیادہ مشتعل کر دیا، مذہبی حلقہ کے افراد جنھوں نے لوگوں میں جوش پیدا کیا تھا یا تو پھانسی پر چڑھا دیئے گئے یا روپوش ہونے پر مجبور ہوئے، کہیں رحم و رعایت سے کام نہیں لیا گیا، مصطفےٰ کمال نے منصوبے کی تکمیل کا فیصلہ کر لیا، اس کو اس کی پرواہ نہیں تھی کہ وہ اس کے لئے کیا ذرائع اور طریقے استعمال کر رہا ہے، لوگ گرفتار کئے جاتے تھے اور محض اس الزام میں کہ انھوں نے مذاق کیا ہے، پھانسی پر چڑھا دیئے جاتے تھے، بے خطا اور مجرم دونوں یکساں اس کا نشانہ بنے اس نے نہ تو ان تحقیقاتی عدالتوں کو ان کی عاجلانہ کارروائی پر سرزنش کی اور نہ قوم کی مرضی کو شکست دینے میں تامل سے کام لیا، اس زمانہ میں وہ متکبرانہ طریقہ پر اکثر کہا کرتا تھا "میں ہی ترکی ہوں، مجھے شکست دینا ترکی کو شکست دینا ہے" اس خود پرستانہ جنون نے ان لوگوں کو بھی مشتعل کر دیا جو اس کو ترکی کا نجات دہندہ سمجھتے تھے۔

ہیٹ کی جنگ بالآخر جیت لی گئی، عدالتیں کامیاب ہوئیں اور عوام نے اپنی شکست تسلیم کر لی

مصطفیٰ کمال نے اپنی اس فتح کو دنیا پر نمایاں کرنے کے لئے مکۂ معظمہ کے موتمر اسلامی (۱۹۲۶ء) میں شرکت کرنے کے لئے پارلیمنٹ کے ایک ممبر ادیب ثروت کو اپنا نمائندہ بنا کر بھیجا، ادیب ثروت واحد مسلمان نمائندہ تھا، جو ہیٹ پہنے ہوئے اس موتمر میں شریک ہوا اور دوسرے مسلمان نمائندوں نے انقباض کے ساتھ اس کا استقبال کیا۔[۱]

بہر حال اتاترک کی زندگی پر اجمالی روشنی ڈالتے ہوئے اس کی مزاجی خصوصیات اور اس کا کردار و کارنامہ بیان کرتے ہوئے مصنف مذکور لکھتا ہے:۔

"اس کا اپنی زندگی میں رنج و مایوسی سے بھی سابقہ پڑا، اس کو بہت کم مسرت کے مواقع نصیب ہوئے، وہ غریبوں سے محبت کرتا تھا، اور دولت مندوں سے نفرت، وہ مفکرین اور علماء سے خائف رہتا تھا، اس لئے کہ ان کی طاقت اس سے زائد تھی، وہ شراب عورتوں اور موسیقی کا شائق تھا، وہ ان سب لوگوں سے نفرت کرتا تھا جو اس سے اختلاف رکھتے تھے، اگرچہ وہ بھی کبھی ان کو اپنے اغراض کے لئے استعمال کر لیتا تھا، اس کے عزم کی قوت اس کی ضد اور کٹرپن اور اس کے ذہن کی صفائی نے اس کو بلند ترین مقام تک پہنچایا، اس کا مزاج اور عہد دونوں ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہو کر بڑھے اور ترقی کی، اس کی عظمت کا راز یہ تھا کہ اس کے مقاصد محدود و معین تھے، ایک عصری ریاست کو اپنے واضح اور معین حدود کے اندر قائم کرنا، اسی کے ساتھ اس کی یہ خصوصیت کہ وہ شکست اور تباہی کے منھ میں پہنچنے کے بعد بھی اپنے خیال پر جما رہتا تھا، اور اس سے ہٹنے کے لئے تیار نہیں تھا۔"[۲]

کمال اتاترک کی اصلاحات اور اس کے انقلابی اقدامات

کمال اتاترک کا مشہور انگریز سوانح نگار (H.C. ARMSTRONG) کمال اتاترک کے

---

[۱] IBID P. 265

[۲] IBID P. 296-297

اصلاحی و انقلابی کردار پر روشنی ڈالتے ہوئے حسب ذیل الفاظ لکھتا ہے۔

"اتاترک نے توڑ پھوڑ کی اس زبردست اور عمومی کارروائی کی تکمیل کرنی شروع کی جس کا آغاز وہ کرچکا تھا، اس نے فیصلہ کیا تھا کہ ترکی کو اپنے بوسیدہ اور تعفن ماضی سے علیحدہ کرنا ہے اور اس تمام ملبہ کو ہٹانا ہے جس نے اس کو گھیر رکھا ہے، اس نے اس قدیم سیاسی ڈھانچہ کو واقعی توڑ پھینکا، سلطنت کو جمہوریت سے آشنا کیا اور اس ترکی کو جو ایک شہنشاہی (EMPIRE) تھا ایک معمولی ملک میں تبدیل کر دیا اور ایک "مذہبی ریاست" کو حقیر درجہ کا جمہوریہ بنا دیا، اس نے سلطان (خلیفہ) کو معزول کر کے قدیم عثمانی سلطنت سے سارے تعلقات ختم کر لئے تھے، اب اس نے قوم کی عقلیت اس کے قدیم تصورات، اخلاق و عادات لباس، طرز گفتگو آداب معاشرت اور گھریلو زندگی کے جزئیات تک تبدیل کرنے کی مہم شروع کی جو اس کو اپنے ماضی اور مشرقی ماحول سے وابستہ کرتی ہیں کلی انقلاب اور تبدیلی کا یہ کام نیا سیاسی ڈھانچہ بنانے سے بھی زیادہ مشکل تھا اس کو اس کام کی دشواری کا پورا احساس تھا ایک مرتبہ اس نے کہا کہ "میں نے دشمن پر فتح پائی اور ملک کو فتح کیا، لیکن کیا میں قوم پر بھی فتح پا سکوں گا؟"[1]

کمال اتاترک نے واقعۃً قوم پر فتح پائی، ملک کو سیکولر (لا مذہبی) اسٹیٹ میں تبدیل کر دیا جس میں اسلام کو سرکاری مذہب کی حیثیت حاصل نہیں رہی، دین و سیاست میں تفریق ہو گئی اور یہ فیصلہ کر لیا گیا کہ مذہب انسان کا ذاتی معاملہ ہے، ہر شخص اپنے لئے کسی مذہب کا انتخاب کر سکتا ہے بغیر اس کے کہ سیاست میں بھی اس کو دخل ہو، خلافت کے ادارہ کو ختم کر دیا گیا، شرعی اداروں اور محکموں اور اسلامی قانون شریعت کو ملک سے بے دخل کر کے سوئٹزرلینڈ کا قانون

---

[1] GREY WOLF P. 287

دیوانی، اٹلی کا قانونِ فوجداری اور جرمنی کا قانون بین الاقوامی تجارت نافذ کیا گیا اور پرسنل لا کو یورپ کے قانونِ دیوانی کے مطابق و ماتحت کر دیا، دینی تعلیم ممنوع قرار پائی، پردہ کو خلافِ قانون قرار دے دیا، مخلوط تعلیم کا نفاذ کیا گیا، عربی حروف کی جگہ لاطینی حروف جاری ہوئے عربی میں اذان ممنوع قرار پائی، قوم کا لباس تبدیل ہو گیا، ہیٹ کا استعمال لازمی قرار پایا غرض کہ کمال اتاترک نے سابق انگریز مورخ کے الفاظ میں ترکی قوم اور حکومت کی دینی اساس کو توڑ پھوڑ کے ختم کر دیا اور قوم کا نقطۂ نظر ہی بدل دیا۔[1]

ریاست کو نامذہبی بنانے کا بل پیش کرتے ہوئے کمال نے پارلیمنٹ میں جو تقریر کی تھی اس کا خلاصہ پیش کرتے ہوئے عرفان اُورگا لکھتا ہے:-

"اس بنیاد پر خاموشی اور خوبصورتی کے ساتھ عمل کرتے ہوئے مصطفیٰ کمال نے ۳ مارچ ۱۹۲۴ء کو ایک بل پیش کیا، اس بل نے ترکی کی ریاست کو نامذہبی تشکیل (SECULAR) دے دی اور خلیفہ کے منصب کو ختم کر دیا، بل کو پیش کرتے ہوئے مصطفیٰ کمال نے اس موضوع پر کھل کر بحث کی، اس نے کہا کہ عثمانی سلطنت، اسلام کے اصول پر قائم ہوئی تھی، اسلام اپنی ساخت اور اپنے تصورات کے لحاظ سے عرب ہے، وہ پیدائش سے لے کر موت تک اپنے پیرؤوں کی زندگی کی تشکیل کرتا ہے، اور ان کو اپنے مخصوص سانچے میں ڈھالتا ہے، وہ ان کی امنگوں کا گلا گھونٹ دیتا ہے، اور ان کی جرأت و اقدام پسندی میں روڑے اٹکاتا ہے، ریاست کو اسلام کے مسلسل باقی رہنے سے خطرہ لاحق رہے گا۔"[2]

نئے فیصلوں اور ان اصلاحات کا اسلام کے مستقبل پر جو اثر پڑا اور ان سے جو دور رس تبدیلیاں واقع ہوئیں ان کی نشان دہی کرتے ہوئے لکھتا ہے:-

---

[1] ATATURK P. 280

[2] P. 241

"پارلیمنٹ نے جو فیصلے کئے اور جن کا بہت کم نوٹس لیا گیا حقیقت میں وہ اسلام کے حق میں کاری ضرب اور پیام موت کی حیثیت رکھتے تھے، تعلیم کی وحدت کا قانون نظامِ تعلیم میں دوررس تبدیلیوں کا باعث بنا، تمام تعلیمی نظم ونسق جو اس جمہوریہ کے حدود کے اندر پایا جاتا تھا، وزارت تعلیم کے قبضہ واقتدار میں آگیا اس تبدیلی نے مدرسوں کی سرگرمیوں اور ان علماء واساتذہ کی آزادی کو ختم کردیا جو ان میں تعلیم دیتے تھے، دوسرا قدم امور مذہبی کے محکمے کا قیام تھا، جو ایک ڈائرکٹر کے ماتحت تھا، اور جو شریعت اور اوقاف کی قدیم وزارت کی قائم مقامی کرتا تھا، اس وزارت کا کام مذہبی یا خیراتی مقاصد کی تکمیل اور مسجد اور یتیم خانے کی دیکھ بھال تھا، لیکن اس کے نظام اور طریقۂ کار کا نہایت غلط اور شرمناک استعمال ہوتا تھا۔"[1]

تنہا عربی رسم الخط کے بجائے لاطینی رسم الخط کے اجراء نے ترکی قوم کی زندگی میں انقلاب عظیم برپا کردیا اور ایک ایسی نئی نسل کو جنم دیا جس کا رشتہ اپنی قدیم تہذیب وثقافت سے کٹ چکا ہے، قدیم تہذیب وثقافت اور علم وادب پر اس کا جو انقلاب انگیز اثر پڑا ہے اس کو ہمارے زمانہ کے مقبول مغربی مورخ ومفکر آرنلڈ ٹائنبی (ARNOLD TOYNBEE) نے اپنی کتاب (A STUDY OF HISTORY) میں بڑی خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے، وہ لکھتا ہے:۔

"ایک قدیم روایت کے مطابق اسکندریہ کی لائبریری کا کل ذخیرہ جو نو سو سال سے زائد کی محنت کا نتیجہ تھا پبلک حماموں کو گرم کرنے کے لئے ایندھن کے کام میں لے آیا گیا،[2] ہمارے زمانہ میں کتابوں کے جلا ڈالنے کے سلسلہ میں ہٹلر نے وہ سب کچھ کیا جو وہ کرسکتا تھا، اگرچہ چھاپے خانوں کے

---

[1] P. 442 .ibid

[2] کتب خانہ اسکندریہ کے جلانے کی چلی ہوئی روایت یا کہانی کی طرف اشارہ ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کے حکم سے اس علمی ذخیرہ کو آگ لگادی گئی، تاریخی طور پر اب یہ روایت بے اصل افسانہ ثابت ہوچکی ہے، مولانا شبلی مرحوم نے اپنی فاضلانہ تصنیف "کتب خانہ اسکندریہ" میں اس کی علمی وتاریخی حیثیت کو بالکل ختم کردیا ہے۔

قیام کے باعث آج کل کے ظالم حکمرانوں کے لئے جو اس سمت قدم اٹھائیں نتائج کے اعتبار سے مکمل کامیابی حاصل کرلینا بہت زیادہ دشوار ہوگیا ہے۔

ہٹلر کے ہم عصر مصطفےٰ کمال اتاترک نے ایک زیادہ موزوں طریقہ اختیار کیا ترکی ڈکٹیٹر کا مقصد اپنے ہم وطنوں کے ذہن کو ایرانی تمدنی ماحول سے رہا کرکے جوان کو ورثہ میں ملا تھا زبردستی مغربی تمدن کے سانچے میں ڈھالنا تھا، اور انھوں نے کتابیں سوخت کرنے کے بجائے حروف تہجی کو بدل ڈالنے پر قناعت کرلی، اس قانون کے نفاذ کے بعد ترکی غازی کے لئے چینی شہنشاہ یا عرب خلیفہ کی نقل کرنا غیر ضروری ہوگیا تھا، فارسی، عربی اور ترکی لٹریچر کے کلاسیکی ذخائر اب نئی نسلوں کی دسترس کے باہر ہوگئے تھے اب کتابوں کے جلانے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہی تھی کیونکہ وہ حروف تہجی جو کہ ان کی کنجی کی حیثیت رکھتے تھے، وہی منسوخ کردیئے گئے تھے اب یہ ذخائر اطمینان کے ساتھ الماریوں میں بند پڑے رہ سکتے تھے، علاوہ چند سن رسیدہ علماء کے ان کو ہاتھ لگانے والا اب کوئی نہ تھا۔[1]

اتاترک نے ترکی زندگی سے اسلامی اور عربی عنصر کو دور کردینے میں حیرت انگیز و بے نظیر کامیابی حاصل کی، ترکوں کے علاوہ اگر کوئی دوسری قوم ہوتی تو اس کا رشتہ اسلام سے اور اپنے ماضی سے ہمیشہ کے لئے کٹ چکا ہوتا اور اسلامی دنیا میں ایک دوسرے اسپین کا تجربہ ہوتا لیکن ترک قوم موروثی و نسلی طور پر اسلام کی ایسی وفادار ہے اسلام کے ساتھ نبی عربی صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم، دین حجازی اور اس کے مرکز اور اس کی ملت کے ساتھ اس کو ایسا جذباتی، روحانی اور قلبی لگاؤ ہے اسلام کے ساتھ اس کے تعلق کی بنیاد ایسے مخلص ہاتھوں سے اور ایسی مبارک گھڑی میں رکھی گئی کہ ترک مجموعی اور ملی طور پر ابھی تک اسلام سے وابستہ ہیں ایک سیاح کو ان کے اندر محبت کی جو حرارت ایمان کی جو طاقت اور اسلام کے لئے جو گرم جوشی محسوس ہوتی ہے وہ کم مسلمان قوموں میں نظر آتی ہے اسی کا نتیجہ ہے کہ کمال اتاترک

---

[1] P. 510-510 ol.

کے بعد دینی بیداری کے آثار برابر نمایاں ہوتے چلے گئے، آنے والی حکومتوں نے بھی بہت سی بندشیں ڈھیلی کرنی مناسب سمجھیں، عوام نے دوبارہ اسلام کے ساتھ اپنے گہرے تعلق کا اظہار کیا اور متعدد بار اپنے انتخاب اور ووٹ کی طاقت سے اپنے لئے بہتر حالات اور ماحول پیدا کرنے کی کوشش کی، اگر کوئی غیر معمولی بات پیش نہ آئی تو اب بھی اس کا امکان ہے کہ ترکی اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لئے کوئی مفید خدمت انجام دے سکے، اور اسلام کو وہاں دوبارہ پھلنے پھولنے کا موقع ملے۔

عالم اسلام میں اتاترک کی غیر معمولی مقبولیت

یہ حالات تھے جنھوں نے ترکی کو تحریک تجدید بلکہ تجدّد اور مغربیت کا امام اور اسلامی ملکوں اور حکومتوں کے "ترقی پسند" زعماء کے لئے ایک قابلِ تقلید نمونہ اور مثال، اور کمال اتاترک کو عالم اسلام کے ترقی پسند معاشرہ اور نئی آزادی حاصل کرنے والے ممالک میں ترقی وانقلاب کا رمز (SYMBOL) اور اہلِ سیاست اور اہلِ فکر دونوں کے لئے ایک ہیرو اور آئیڈیل بنا دیا، آزاد اسلامی ممالک کے برسرِ اقتدار طبقہ اور سیاسی زعماء میں ہمیں کوئی ایسا لیڈر نظر نہیں آتا جس نے اتنی محدود وسطحی ذہنی وعلمی صلاحیت اور اخلاقی پستی[1] کے باوجود لوگوں کے دل ودماغ کو اس درجہ مسحور اور اپنی شخصیت اور کارناموں سے اس قدر متاثر کیا ہو اور اپنی تقلید وپیروی کی اتنی زبردست خواہش لوگوں کے دلوں میں پیدا کر دی ہو جتنی کہ کمال اتاترک نے اس عہدِ آخر میں کی۔

---

[1] عرفان اُورنگا نے اپنی کتاب (ATATURK) میں اس پر بڑی روشنی ڈالی ہے خصوصیت کے ساتھ ملاحظہ ہو ص۲۸۱

اس کی سب سے بڑی وجہ یہ شہرت تھی کہ اس نے ترکی کو بہت نازک وقت میں ایک ایسے خطرہ سے بچایا جو اس کے لئے موت وزیست کا سوال بن گیا تھا، اور ایک مضبوط حکومت قائم کی اور مغربی حکومتوں اور اس کے سیاسی لیڈروں کو اپنی عزیمت اور عظمت کے سامنے سرنگوں کر دیا، مشرق کے مسلمان اس عہد میں سیاسی قوت کے پیاسے اور عزت و آزادی کے حصول کے لئے بے چین تھے، اور جس میں ان کو یہ صفات نظر آتیں وہ ان کا محبوب ہیرو بن جاتا اور اس کے سامنے وہ بصد نیاز سر تسلیم خم کر دیتے۔

کمال اتاترک کے ساتھ یہی واقعہ پیش آیا کہ مسلمانوں کے دلوں میں اس کی طرف سے مبالغہ آمیز عقیدت و محبت کے جذبات پیدا ہو گئے۔

اس کا دوسرا سبب یہ تھا کہ اس کی اصلاحات اسلامی ممالک کے قومی لیڈروں کی امنگوں کے عین مطابق ثابت ہوئیں، اور اس نے ان کے اصلی خیالات و جذبات کی ترجمانی کی، ان کے دلوں میں تغیر و انقلاب اور دین کی گرفت سے آزادی کی جو شدید خواہش اور اپنی قوم کو مکمل طور پر مغربی تہذیب کے سانچہ میں ڈھالنے کا جو دیرینہ جذبہ موجزن تھا، ان "اصلاحات" نے ان کے لئے ایک شاندار اور کامیاب تجربہ اور نمونہ فراہم کر دیا۔

بہر حال اس کے جو بھی اسباب رہے ہوں، نتیجہ یہ ہوا کہ کمال اتاترک کو اسلامی مشرق میں وہ مقام حاصل ہو گیا جو ایک طویل عرصہ سے کسی مشرقی لیڈر کو حاصل نہ ہو سکا تھا، اسلامی اقوام کے ابھرتے ہوئے رجحانات و میلانات اور مغربی تہذیب کے بارے میں ان کے رویہ اور موقف پر ترکی کے انقلاب کا گہرا اثر پڑا اور یہ اثر پڑنا قدرتی اور لازمی تھا۔

ہندوستان میں مغرب و مشرق کی کشمکش

دوسرا میدان ہندوستان تھا، جہاں مشرق و مغرب کی یہ کشمکش مختلف سیاسی اور تہذیبی اسباب کی بنا پر اس طریقہ پر سامنے آئی کہ اس کے سامنے دو راستوں کے علاوہ کوئی اور راستہ باقی نہ رہ گیا تھا، اسلامی زندگی کی ترجیح عقیدہ و ایمان کی بنا پر یا مغربی زندگی کا انتخاب مادی قوت اور ترقی کی بنیاد پر۔

ہندوستان میں انگریزی حکومت (جو مشرق میں تہذیب مغرب کی نمائندہ اور وکیل تھی) کے قدم اچھی طرح جم چکے تھے، وہ اپنے ساتھ جدید علوم اور جدید تنظیمات اور اس کے متعلقہ آلات و مصنوعات اور افکار و خیالات کا ایک بڑا لشکر ساتھ لائی، ہندوستانی مسلمان اس وقت زخم خوردہ، مضمحل اور شکستہ خاطر تھے، ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں ان کی عزت و خودداری پر ضرب کاری لگی تھی، دوسری طرف ان کو نئے فاتح کا رعب، نئے حالات کی دہشت، ناکامی کی شرم اور مختلف شکوک و شبہات اور تہمتوں کا سامنا تھا، ان کے روبرو ایک ایسا فاتح تھا جو قوت و خود اعتمادی سے لبریز تھا، ایک ایسی تہذیب تھی جو جدت و نشاط انگیزی اور تخلیقی صلاحیتوں سے مالا مال تھی، بہت سے ایسے مشکلات اور مسائل تھے، جو فوری اور دور اندیشانہ حل اور فیصلہ کن اور واضح موقف (پالیسی) کے طلب گار تھے۔

دینی قیادت اور دار العلوم دیوبند

اس پیچیدہ نفسیاتی کیفیت اور نازک حالت میں دو قسم کی قیادتیں ابھر کر

سامنے آئیں، پہلی قیادت دینی قیادت تھی جس کے علمبردار علماء دین تھے، دوسری قیادت کے علمبردار سرسید احمد خاں، ان کے حلقہ بگوش اور جدید مکتب خیال کے افراد تھے۔

جہاں تک علماء کا تعلق ہے ان کو رسوخ فی الدین، زہد و تقویٰ، ایثار و اخلاص، دینی غیرت و حمیت اور اس کی راہ میں قربانی کے میدان میں عالمِ اسلام کی سب سے طاقتور دینی شخصیت اور عنصر قرار دیا جا سکتا ہے، لیکن اس ظلم و بربریت اور غیر معمولی سنگ دلی اور بے رحمی کی وجہ سے جس کا مظاہرہ انگریزی حکومت نے مسلمانوں کے معاملہ میں کیا تھا، جن کو وہ ۱۸۵۷ء کے غدر کا اولین رہنما اور حقیقی قائد تسلیم کرتی تھی[1]، نیز عیسائیت کی ترویج و اشاعت میں حکومت کی سرگرمی اور گرمجوشی اور مغربی تہذیب کی عوام میں غیر معمولی تیزی کے ساتھ مقبولیت اور مسلمانوں کے عقائد اور اخلاق و معاشرت میں اس کے اثرات کی وجہ سے ان لوگوں کو اقدام کے بجائے دفاعی پوزیشن اختیار کرنے پر مجبور ہونا پڑا، انھوں نے اس کی فکر شروع کی کہ دینی جذبہ، اسلامی روح، اسلامی زندگی کے مظاہر اور تہذیب اسلامی کے جتنے بچے کھچے آثار باقی رہ گئے ہیں، ان کو محفوظ رکھنے کی کوشش کی جائے، اور اسلامی تہذیب اور ثقافت کے لئے قلعہ بندیاں کر لی جائیں اور پھر ان قلعوں میں (جن کو عربی مدارس کے نام سے پکارا گیا ہے) مبلغ اور داعی تیار کئے جائیں۔

اس عظیم اصلاحی اور تعلیمی تحریک کے (جس کا آغاز ۱۲۸۳ھ مطابق ۱۸۶۶ء میں ہوا) سربراہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ بانی دار العلوم دیوبند تھے۔

مولانا سید مناظر احسن گیلانی، مولانا محمد قاسم صاحبؒ کے تذکرہ "سوانح قاسمی"

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "ہندوستانی مسلمان" از مؤلف۔

میں لکھتے ہیں :-

"۱۸۵۷ء کی کشمکش کی ناکامی کے بعد قتال اور آویزش کے نئے محاذوں اور میدانوں کی تیاری میں آپ کا دماغ مصروف ہوگیا، دارالعلوم دیوبند کا تعلیمی نظام اسی لائحہ عمل کا سب سے زیادہ نمایاں اور مرکزی و جوہری عنصر تھا۔

شاملی[1] میدان سے واپسی کے بعد سوچنے والوں نے نہ تو مایوس ہو کر سوچنا چھوڑ دیا تھا اور نہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئے تھے، بلکہ "بقاء اسلام اور تحفظ علم دین" کے نصب العین کو آگے بڑھانے کے لئے ان کے دماغ بھی مصروف فکر و نظر تھے، اور ان کے قلوب بھی کائنات کی مرکزی قوت سے لو لگائے غیبی لطیفہ کے ظہور کا انتظار کر رہے تھے"[2]

مولانا محمد قاسم صاحب کے شاگرد رشید اور جانشین مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی (شیخ الہندؒ) نے ایک موقع پر مصنف "سوانح قاسمی" ہی سے سوال کرتے ہوئے فرمایا :-

"حضرت الاستاذ نے اس مدرسہ کو کیا درس و تدریس، تعلیم و تعلم کے لئے قائم کیا تھا؟ مدرسہ میرے سامنے قائم ہوا، جہاں تک میں جانتا ہوں ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کی ناکامی کے بعد یہ ادارہ قائم کیا گیا کہ کوئی ایسا مرکز قائم کیا جائے جس کے زیر اثر لوگوں کو تیار کیا جائے تاکہ ۱۸۵۷ء کی ناکامی کی تلافی کی جائے"[3]

---

[1] شاملی ضلع مظفر نگر میں دہلی، سہارنپور کی چھوٹی لائن پر واقع اور ایک آباد قصبہ اور غلہ کی بڑی منڈی ہے یہاں ۱۸۵۷ء میں حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ، مولانا محمد قاسم صاحبؒ اور ان کے رفقاء نے انگریزوں سے جنگ کی تھی اور حافظ ضامن صاحبؒ شہید ہوئے تھے۔ [2] سوانح قاسمی حصہ دوم ص ۲۲۳-۲۲۴ [3] ایضاً ص ۲۲۶

اس تحریک اور اس کے قائدین نے ہندوستانی مسلمانوں کے اندر دین کی محبت شریعت کا احترام اور اس کے راستہ میں قربانی کی طاقت اور مغربی تہذیب کے مقابلہ میں زبردست استقامت وصلابت (جو کسی اور ایسے اسلامی ملک میں دیکھنے میں نہیں آئی جس کو مغربی تہذیب اور مغرب کے اقتدار سے واسطہ پڑا ہو) پیدا کردی، دیوبند اس رجحان کا علمبردار اور ہندوستان میں قدیم اسلامی ثقافت وتہذیب وتربیت کا سب سے بڑا مرکز تھا۔

تحریک ندوۃ العلماء

ندوۃ العلماء کی فکری تحریک (۱۳۱۱ھ مطابق ۱۸۹۳ء) جس کے بانی مولانا محمد علی مونگیری[۱] تھے اور جس کی رہنمائی ان کے بعد عرصہ تک مولانا شبلی[۲] اور ان کے نامور رفقاء نے کی اور اس کے قائم کردہ دارالعلوم میں اس کی صلاحیت تھی کہ وہ اسلامی اور مغربی ثقافت اور علماء دین وجدید طبقہ کے درمیان پل کا کام کرسکے اور ایک ایسا متوازن فکر تیار کرسکے جو قدیم وجدید دونوں کے محاسن کا جامع ہو اور اس مدرسۂ فکر کے ذمہ داروں کے الفاظ میں "اصول ومقاصد میں سخت اور بے لوچ اور فروع اور وسائل میں وسیع اور لچکدار ہو"۔

ان کے نزدیک دینی نصاب تعلیم ایک تغیر وترقی پذیر ذریعۂ تعلیم وتربیت تھا، جس کو زمانہ کی تبدیلیوں اور تقاضوں کے مطابق (اپنی روح ومقاصد اور اساسی علوم

---

[۱] مولانا کے حالات وسوانح کے لئے ملاحظہ ہو "تذکرۂ مولانا محمد علی مونگیریؒ" از محمد الحسنیؒ شائع کردہ ندوۃ العلماء

[۲] ملاحظہ ہو "حیات شبلیؒ" از مولانا سید سلیمان ندویؒ۔

کی حفاظت کے ساتھ) بدلتے اور ترقی کرتے رہنا چاہیئے، وہ ان کے نزدیک ایک جامد متحجر (FOSSILISED) نصاب ہونے کے بجائے ایک زندہ و نامی جسم کی طرح زندگی، ترقی اور وسعت کی صلاحیتوں سے بھرپور ہے، دوسرے الفاظ میں دین ایک ابدی حقیقت ہے جس میں کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں، لیکن علم ایک پھلنے پھولنے والا درخت ہے جس کا نشو و نما برابر جاری رہے گا، اسلام ان کے نزدیک ایک عالمگیر اور جاوداں دین اور زندگی ہے، اس لئے ذہنِ انسانی کے ارتقاء و تنزّل اور تغیرات کی مختلف منزلوں سے اس کا سابقہ پڑنا اور ان بدلے ہوئے حالات و تصورات و افکار میں رہنمائی کا فرض انجام دینا اور پیدا ہونے والے شکوک و شبہات کو رفع کرنا ایک قدرتی امر ہے، اس کے لئے اس ذریعۂ تعلیم کو بھی (جو اسلام کے نمائندوں اور اس کے شارحین کو تیار کرتا ہے) اپنے دائرہ کو برابر وسیع کرتے رہنے اور اپنی صلاحیت اور زندگی کا ثبوت دیتے رہنے کی ضرورت ہے، ندوۃ العلماء کے بانیوں نے اصلاح و توسیع نصاب کی آواز بلند کی، یہ آواز ہندوستان میں (جو قدیم نصابِ تعلیم پر مضبوطی سے جما ہوا تھا) نامانوس آواز تھی، دوسرے اسلامی ممالک میں بھی ابھی اصلاح نصاب کی دعوت کا غلغلہ بلند نہیں ہوا تھا، اور جامع ازہر نے بھی ابھی کوئی قدم اس سمت میں نہیں بڑھایا تھا، اس کا کسی قدر اندازہ ان دو اقتباسات سے ہوگا جن میں ایک بانی ندوۃ العلماء مولانا سید محمد علی مونگیریؒ کی ایک تحریر سے ماخوذ ہے، دوسرا مولانا شبلی نعمانی کے قلم سے ہے :-

"اس زمانہ میں حالت بدل گئی ہے، وہ اعتراضات جو پہلے فلسفہ میں کئے گئے اب انھیں کوئی نہیں پوچھتا، اور نہ وہ فرقے اعتراضات کرنے والے باقی رہے،

اب ان کے اعتراضات اور جوابات سیکھنے کی ضرورت نہ رہی اب نیا عالم، نیا دانہ، نیا پانی ہے، جدید فلسفہ کی بنا پر اس زمانہ کے مخالفین اسلام نے نئے نئے قسم کے اعتراضات کئے ہیں جو پہلے نہ تھے ان کا شافی طور پر جواب دینا قدیم فلسفہ کے جاننے سے نہیں ہو سکتا اگرچہ کوئی کیسا ہی دعویٰ کرے وجہ اس کی یہ ہے کہ معترض کا جواب شافی اس وقت ہو سکتا ہے جب کہ اس کے منتہائے اعتراض کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے اور یہ بھی معلوم ہو جائے کہ کس بنا پر اس نے اعتراض کیا ہے"[1]

"یہ یونانی علوم نہ ہمارے مذہبی علوم ہیں نہ ہمارے مذہب کی فہم و معرفت ان پر موقوف ہے امام غزالیؒ نے اپنے زمانہ سے ان علوم کو علماء کے نصاب میں اس لئے داخل کیا تاکہ ان یونانی علوم کے اثر سے جن کو اس زمانہ میں زیادہ تر باطنیوں نے پھیلا رکھا تھا علماء اسلام واقف ہو کر اس زمانہ کے الحاد کا مقابلہ کر سکیں، لیکن اب نہ وہ ملحد رہے، نہ وہ یونانی علوم رہے، نہ ان کے مسائل کی صحت کا یقین عقل کے مدعیوں کو رہا اس لئے ان کا اثر خود بخود زائل ہو گیا اور اب ان سے اسلام کو کسی گزند کا خوف نہیں رہا، اب اس کی جگہ نئے علوم ہیں، نئے مسائل ہیں، نئی تحقیقات ہیں، اب اس بات کی ضرورت ہے کہ ہمارے علماء ان نئی چیزوں سے واقف ہو کر اسلام کی نئی مشکلات کا حل نکالیں اور نئے شبہات کا تحقیقی جواب دیں"[2]

یہ ایک بہت مبارک قدم اور ایک نیا زاویۂ نگاہ تھا، ندوۃ العلماء کی تحریک

---

[1] مکاتیب محمدیہ۔ [2] حیات شبلی ص ۲۰۲

محض اصلاحِ نصاب کی ایک تحریک نہ تھی، وہ مستقل ایک دبستانِ فکر بھی تھا جس کی تقلید ہر اس ملک کو کرنی چاہئے تھی جو قدیم و جدید کے معرکہ میں مبتلا اور اس کشمکش کا شکار تھا۔

لیکن اس تحریک کو قدیم و جدید دونوں طبقوں کا (اس وسیع خلیج کی وجہ سے جو ان کے درمیان حائل تھی) وہ مؤثر و پرجوش تعاون حاصل نہ ہو سکا جس کی وہ مستحق تھی، اس کا بڑا سبب ان اہلِ فکر و اہلِ دعوت کی کمی تھی، جو ان دونوں ثقافتوں کے حامل ہوں اور دونوں کو اچھی طرح ہضم کر چکے ہوں اور ان اجزاء سے جو بظاہر متضاد نظر آتے ہیں، ایک پاکیزہ، معتدل، خوشگوار، اور مفید آمیزہ بنا سکتے ہوں جس طرح شہد کی مکھی مختلف پھولوں اور درختوں سے حاصل کر کے شہد تیار کرتی ہے۔

غرض کہ قوم کا ایک بڑا حصہ ان دونوں طبقوں کے درمیان ہچکولے کھاتا رہا جس میں سے ایک طبقہ قدیم طرزِ تعلیم اور مسلک سے سرمو انحراف ایک قسم کی تحریف اور بدعت سمجھتا تھا، دوسرا طبقہ مغرب سے ہر آنے والی چیز کو عظمت و تقدیس کی نگاہ سے دیکھتا تھا، اور اس کو ہر عیب اور نقص سے پاک سمجھتا تھا یہاں تک کہ اہلِ مغرب کے افکار اور فکری رجحانات بھی اس کو عظمت و عصمت کا پیکر نظر آتے تھے، اور ان کو وہ ذہنِ انسانی کی پرواز کی آخری منزل تصور کرتا تھا، ان دونوں طبقوں کے درمیان فکر و معیار کا جو تضاد تھا، اور جس طرح وہ دو انتہائی سروں پر تھے، اس کی تصویر لسان العصر اکبر الہ آبادی نے اس شعر میں کھینچی ہے ؎

ادھر یہ ضد ہے کہ لمنڈ بھی چھو نہیں سکتے
ادھر یہ رٹ ہے کہ ساقی صراحئ مے لا

اس سب کے باوجود ندوۃ العلماء کا تخیل وہ معتدل و متوازن تخیل ہے، جو اب بھی

اس بات کی صلاحیت رکھتا ہے کہ دینی نظامِ تعلیم کو زندگی کی ایک نئی قسط عطا کرے اور اس کے ذریعہ سے ملت قدیم وجدید کی اس کشمکش اور دو برسرِپیکار طبقوں کی آویزش سے نجات پائے جس نے اکثر اسلامی ممالک میں انتشار برپا کر رکھا ہے، اور جس کی بنا پر بعض ممالک کا رخ سیکولرزم کی طرف ہوتا جارہا ہے۔

ندوۃ العلماء کی تحریک کے رہنماؤں اور اس درسگاہ کے متعدد فضلاء نے اسلامی ثقافت کی نشر واشاعت، سیرت نبوی کی تحریر وتدوین، اسلام کے کارناموں اور اس کی تعلیمات کو جدید علمی اور ادبی اسلوب میں پیش کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے؛ علامہ شبلی نعمانی کی علمی وادبی تحریرات بالخصوص ان کی عظیم کتاب سیرت النبی، الفاروق، الغزالی، مولانا جلال الدین رومی اور ان کے متکلمانہ اور مؤرخانہ مضامین نے ہندوستان کی جدید نسل کو متاثر کیا اور اس کے احساسِ کہتری کے دور کرنے میں مفید خدمت انجام دی، اسی طرح ان کے شاگرد رشید وجانشین مولانا سید سلیمان ندوی کی خدمات اور ان کے علمی کارناموں سے صرفِ نظر نہیں کیا جاسکتا "سیرت النبی" کی چار ضخیم جلدیں سیرت نبوی اور علمِ کلام کا ایک قیمتی کتب خانہ ہے، ان کی کتاب: خطباتِ مدراس "سیرت کی موثر ومفید ترین کتابوں میں شمار ہونے کے قابل ہے" اسی طرح ان کے محققانہ علمی وادبی مضامین نے اسلامی کتب خانہ کو مالا مال کیا، انھوں نے اور ان کے بعض رفقاء نے ملک کی علمی، ادبی اور بعض اوقات سیاسی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیا، جس سے اس الزام کی تردید ہوئی کہ علماء ملک کی عام زندگی، جدید تحریکوں اور سرگرمیوں سے کنارہ کش رہتے ہیں، اور ان میں جدید رجحانات کے سمجھنے اور ملک کی تعمیر وترقی میں حصہ لینے کی صلاحیت نہیں، دارالمصنفین

اور اس کا ماہنامہ معارف (جو عرصۂ دراز تک مولانا سید سلیمان ندوی کی ادارت میں نکلا ہے) عالم اسلام میں خاصی شہرت اور عزت رکھتے ہیں۔

سرسید احمد خاں کی قیادت اور ان کا مکتب خیال

دوسری قیادت جس کا علم سرسید احمد خاںؒ مرحوم نے بلند کیا وہ مغربی تہذیب اور اس کی مادی بنیادوں کی تقلید اور جدید علوم کو اس کے عیوب ونقائص کے ساتھ اور بغیر کسی تنقید وترمیم کے اختیار کر لینے کی داعی تھی، وہ اسلام اور قرآن کی اس طرح تفسیر اور توجیہ کرتی تھی جو انیسویں صدی کے آخر کے سائنسی معلومات اور مغربی تمدن کے معیاروں کے مطابق ہو اور اہل مغرب کے ذوق ومزاج کے ساتھ ہم آہنگ ہو وہ ان غیبی حقائق اور طبعی اسرار کے انکار پر قائم تھی، جو حواس اور تجربہ کی دسترس سے بہت دور ہیں، اور بادی النظر میں جدید علوم کے مطابق نظر نہیں آتے ہیں۔[2]

سرسید احمد خاں نے آخری مغل سلطنت کا زوال (جو مسلمانوں کی عظیم حکومت کی ایک دھندلی اور پھیکی سی تصویر تھی) اور ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کو اپنی آنکھوں سے دیکھا، انھوں نے اس ہزیمت، اہل ہند کی دل شکستگی، ان کی عظیم جماعت کے مقابلہ میں مٹھی بھر غیر ملکیوں کی فتح کا مشاہدہ کیا، مسلمانوں کو اس کوشش کی جو بھاری قیمت ادا کرنی پڑی اس کو بھی دیکھا، وہ قوم جو کل اس ملک کی

---

[1] حالات وسوانح کے لئے ملاحظہ ہو "حیاتِ جاوید" از خواجہ الطاف حسین حالی، و علی گڑھ میگزین سرسید نمبر۔ [2] یہ زمانہ جیسا کہ سب جانتے ہیں طبعی علوم کے طفولیت کا زمانہ تھا، اور اس کا نشوونما ہو رہا تھا، اور یہ علوم ابھی اپنے مکمل نتائج تک نہیں پہنچے تھے۔

حاکم تھی، اس کی ذلت وپستی، بڑے بڑے خاندانوں اور گھرانوں کی فلاکت اور انگریزوں کی شان وشوکت (جو مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ کے ملبہ پر قائم ہو رہی تھی) نیز ان کی حکومت اور ساحرانہ تہذیب کے مناظر بھی دیکھے، اس کے علاوہ ملازمت، رفاقت اور دوستی وتعارف کے ذریعہ ان کو انگریزوں سے طویل واسطہ پڑا تھا، اور بہت قریب سے ان کی زندگی کے مطالعہ کا موقعہ ملا تھا، وہ ان کی ذہانت، قوتِ عمل اور ان کے تمدن سے متاثر ہوئے وہ ایک ذہین، نہایت ذکی الحس سریع الانفعال اور دردمند قسم کے آدمی تھے، انھوں نے متوسط درجہ کی دینی تعلیم پائی تھی، اور دینی علوم اور کتاب وسنت پر ان کی نظر گہری اور وسیع نہ تھی، جلد رائے قائم کر لینے اور جرأت کے ساتھ اس کا اظہار کرنے کے عادی تھے، وہ انگریزوں سے اس طرح متاثر ہوئے جس طرح کوئی مغلوب غالب سے، یا کوئی کمزور طاقتور سے متاثر ہوتا ہے، انھوں نے شخصی طور پر انگریزی تہذیب اور طرزِ معاشرت کو اختیار کیا اور دوسروں کو بھی بڑی گرمجوشی اور قوت کے ساتھ اس کی دعوت دی، ان کا خیال تھا کہ اس ہم رنگی، حاکم قوم کی معاشرت وتمدن اختیار کرنے اور ان کے ساتھ بے تکلف رہنے سے وہ مرعوبیت، احساسِ کہتری اور احساسِ غلامی دور ہو جائے گا، جس میں مسلمان مبتلا ہیں، اور حکام کی نظر میں ان کی قدر ومنزلت بڑھ جائے گی اور وہ ایک معزز مساوی درجہ کی قوم کے افراد معلوم ہونے لگیں گے، یہ خیال اور یہ نقطۂ نظر ان کے بعض مضامین میں بہت صفائی کے ساتھ ملتا ہے، ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

"ہندوستان کے مسلمانوں کو کامل درجہ سویلیزیشن یعنی تہذیب اختیار کرنے پر راغب کیا جاوے تاکہ جس حقارت سے سویلزڈ یعنی مہذب قومیں ان کو دیکھتی ہیں،

وہ رفیع ہو اور وہ بھی دنیا میں معزز مہذب کہلاویں۔[1]

اپنے رسالہ "احکام طعام اہل کتاب" میں جو ۱۸۶۸ء کی تالیف ہے، کھانے پینے اور معاشرت میں انگریزوں کا طریقہ اختیار کرنے کی ترغیب دیتے ہوئے عربی میں لکھتے ہیں (جس کا ترجمہ یہ ہے):۔

"پس اے مسلمانو! اس پر عمل کرو، خود پسندی و تکبر کی نیت سے نہیں بلکہ اس نیت سے کہ مسلمانوں کی حالت میں رفعت و بلندی پیدا ہو جائے تاکہ اس ذلت و مسکنت کی بنا پر جس کے لوگ عادی ہو گئے ہیں کوئی قوم ان کو حقارت کی نظر سے نہ دیکھے، اللہ تعالیٰ کو ہمارے سینوں کا حال معلوم ہے اور وہ ہمارے قلوب کے متعلق صحیح فیصلہ کرتا ہے"[2]

اپریل ۱۸۶۹ء میں سرسید نے انگلینڈ کا سفر کیا، اس ابتدائی دور میں وہ پہلے نامور مسلمان تھے جنھوں نے جزائر برطانیہ کا سفر کیا، اس وقت نہر سویز زیر تعمیر تھی[3]، انھوں نے اس کے انجینیر اور بانی (FERDINAND DE LESSEPS) سے بھی ملاقات کی جو اس جہاز میں سفر کر رہے تھے۔

لندن میں سرسید کا بڑی گرمجوشی سے استقبال ہوا، انھوں نے وہاں ۱۷ مہینے قیام کیا، اور ایک معزز مہمان، قابل احترام مسافر اور عزیز دوست کی حیثیت سے لندن کے ممتاز حلقوں میں ان کو ممتاز جگہ حاصل ہوئی، وہ بڑی بڑی شاہی پارٹیوں اور اعلیٰ و معزز دعوتوں اور مجلسوں میں شریک ہوئے جہاں مغربی تہذیب حاکم طبقہ اور اشراف شہر کا اخلاق و کردار پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر تھا، ان کو سی، ایس، آئی کا معزز خطاب

---

[1] تہذیب الاخلاق مضامین سرسید جلد دوم ص ۱۰ [2] ایضاً ص ۵

[3] ۱۷ ار نومبر ۱۸۶۹ء میں اس کا افتتاح ہوا اور باقاعدہ جہازوں کی آمد و رفت شروع ہوئی، اس اہم تاریخی واقعہ پر شاندار جشن منایا گیا، اس وقت سرسید احمد خاں انگلستان میں تھے۔

اور تمغہ بھی ملا، ملکہ، ولی عہد اور بڑے بڑے وزراء سے انھوں نے ملاقاتیں کیں، ایتھم کلب جیسی معزز مجلس اور بڑی بڑی علمی انجمنوں نے ان کو اپنا اعزازی رکن بنایا، سمٹو میں سوسائٹی آف سول انجینیرس کے عظیم الشان جلسہ اور ڈنر میں بھی وہ شریک ہوئے، اس میں سالِ گذشتہ کی مختلف ترقیات کا جو انجینیرنگ میں ہوئی تھیں ذکر سنا اور ان ترقیاتی منصوبوں کا مطالعہ کیا جو پورے ہو چکے تھے یا ہو رہے تھے، اور جنھوں نے انگلستان کے اقتصادی اور سیاسی نقشہ میں ایک زبردست انقلاب اور ملک کے معیار میں عظیم تبدیلی پیدا کر دی تھی، اور اس کے حدود کی توسیع اور فکری و سیاسی برتری کے لئے راہ ہموار کر دی تھی۔[1]

سرسید نے فرانس اور انگلستان کو اس وقت دیکھا جس وقت وہ اپنے تمدن و ترقی کے شباب پر تھے، جدید علوم اور جدید صنعت اپنے عروج پر تھی، اس وقت مغربی معاشرہ اور سوسائٹی میں زوال و انحطاط کے وہ آثار نمودار نہیں ہوئے تھے، جو جنگِ عظیم اول کے بعد اہلِ نظر کو صاف نظر آنے لگے تھے، مغربی تمدن اس وقت تک زندگی اور تخلیقی صلاحیت سے بھرپور تھا، اس کے سینہ میں پوری دنیا کو فتح کر لینے اور تمام اقوامِ عالم کو اپنے زیرنگیں لے آنے کا حوصلہ موجزن تھا، چنانچہ یہ روشن اور تابناک پہلوان کو مغربی تمدن و معاشرہ کے تاریک اور کمزور پہلو کی طرف توجہ کرنے سے باز رکھتا رہا، اخلاق و روحانیت کے فقدان، ہوس ملک گیری، تکبر اور قومی انانیت نے انگریزوں کو جس طرح ایک بین الاقوامی جرائم پیشہ قوم بنا دیا تھا، اور خود ہندوستان میں اس کا جس طرح ظہور ہوا تھا، یہ حقیقت اور پہلو ان کی نگاہ سے اوجھل رہا۔

---

[1] قیامِ انگلستان کے سلسلہ کی تفصیلات اور سرسید کی مصروفیات کے لئے ملاحظہ ہو حیاتِ جاوید کا چوتھا باب از صفحہ ۱۳۱ تا ۱۴۹

وہ اس تہذیب اور معاشرہ سے اس طرح متاثر ہوئے کہ ان کے دل و دماغ اعصاب اور ساری فکری صلاحیتیں اس سے وابستہ ہوگئیں ۱۲؍ اکتوبر ۱۸۷۰ء میں وہ اس تہذیب کے گرویدہ اور ہندوستان کی مسلم سوسائٹی میں ان اقدار اور اصولوں کی بنیاد پر اصلاح و تعمیر کے پرجوش داعی اور مبلغ بن کر اپنے ملک واپس ہوئے اور پورے خلوص اور گرم جوشی کے ساتھ انھوں نے اس تحریک و دعوت کا علم بلند کیا اور اپنی ساری صلاحیتیں اور قوتیں اس کے لئے وقف کر دیں، ان کا نقطۂ نظر خالص مادی ہوگیا، وہ مادی طاقتوں اور کائناتی قوتوں کے سامنے بالکل سرنگوں نظر آنے لگے، وہ اپنے عقیدہ اور قرآن مجید کی تفسیر بھی اسی بنیاد پر کرنے لگے، انھوں نے اس میں اس قدر غلو سے کام لیا کہ عربی زبان و لغت کے مسلمہ اصول و قواعد اور اجماع و تواتر کے خلاف کہنے میں بھی ان کو باک نہ رہا چنانچہ ان کی تفسیر نے دینی و علمی حلقوں میں سخت برہمی پیدا کر دی، ڈاکٹر محمد البہی نے اپنی کتاب "الفکر الاسلامی الحدیث" میں ان کے اس رجحان پر کلام کرتے ہوئے صحیح کہا ہے کہ:-

> "سید احمد خان کی تحریک علوم طبعیہ اور مغرب کی مادی تہذیب کے عشق و شیفتگی پر قائم تھی، اسی طرح جس طرح زمانہ حال کے بعض مفکرین سائنس اور اس کی ان ایجادات و فتوحات سے ضرورت سے زیادہ مرعوب ہیں جن پر موجودہ مغربی تہذیب قائم ہے علوم طبعیہ یا طبعیات سے اس قدر وابستگی اور عشق، روحانی اور مثالی اقدار کی قیمت کم کر دیتا ہے، حالانکہ یہ قدریں وہ ہیں جن پر آسمانی مذاہب کی بنیاد ہے، اور جس کی نمائندگی سب سے زیادہ وضاحت کے ساتھ اسلام نے کی ہے، علوم طبعیہ سے یہ غیر معمولی لگاؤ بعض اوقات ہر اس چیز کے انکار تک پہونچا دیتا ہے، جو انسانی حس اور مشاہدہ میں نہ آسکے، یہی چیز تھی جس کا رشتہ سید جمال الدین افغانی نے سرسید احمد خاں کے الحاد اور ان کے

مذہب نیچری سے جوڑا ہے، اور باوجود ان کے بار بار یہ کہنے کے کہ وہ اسلام کا دفاع کر رہے ہیں، انھوں نے ان پر الحاد کا الزام لگایا[1]، سرسید کا کہنا یہ تھا کہ ان کی کوشش یہ ہے کہ موجودہ مسلمانوں کے لئے ایک ایسا طریقہ پیدا کریں جس میں وہ اپنے اسلام پر قائم رہتے ہوئے اس جدید زندگی کو اپنا سکیں جو علوم طبعیہ کی ترقی کی بنیاد پر وجود میں آئی ہے"[2]

یہ انتہا پسندانہ مادی رجحان، عقل انسانی کی تقدیس اور اس کے حدود اور دائرہ عمل کی ضرورت سے زائد توسیع، خدا کی قدرت و مشیت کو قوانین فطرت اور اسباب ظاہری کا پابند سمجھنا، قرآن کی جسارت کے ساتھ تاویل و تشریح، وہ چیزیں تھیں، جنھوں نے ایک نئے فکری انتشار اور بے راہ روی اور بے باکی کا دروازہ کھول دیا اور آگے چل کر لوگوں نے اس سے ایسا غلط فائدہ اٹھایا کہ دین کی تشریح اور قرآن کی تفسیر بازیچۂ اطفال بن گئی۔[3]

سرسیّد کے نقطۂ نظر کے کمزور پہلو

سرسید کے تعلیمی و اصلاحی منصوبہ کے دو پہلو ایسے تھے جن کی وجہ سے وہ عالم اسلام کے لئے کوئی ایسی انقلاب انگیز دعوت اور ایجابی و تعمیری قدم ثابت نہ ہو سکا جو عقیدہ و ایمان اور رسالتِ محمدی پر قائم ہونے والی سوسائٹی کے حالات سے

---

[1] العروۃ الوثقیٰ (جس کے نگراں و روح رواں سید جمال الدین افغانی تھے) کے ان مضامین میں جو سرسید کی تردید میں لکھے گئے ہیں، کسی قدر غلط فہمی اور غلو شامل ہے جس کا سبب غالباً زبان سے ناواقفیت اور سرسید کی عام شہرت ہے (بقیہ) [2] ایضاً ص۱۵-۱۶ [3] نمونہ کے طور پر ملاحظہ ہو مولوی محمد علی لاہوری کی تفسیر "بیان القرآن" اور انگریزی ترجمہ قرآن کے نوٹس!

مطابق ہو اور عالمِ اسلام کے اس خلا کو پُر کر سکے جو مغربی تہذیب اور علوم طبعیہ کی ترقی نے ذہنوں میں پیدا کر دیا تھا۔

پہلی بات یہ ہے کہ انھوں نے اس نظامِ تعلیم کو (جس کو مغرب میں آخری شکل دی گئی تھی) ہندوستان کے مسلم معاشرہ کے حالات اور تقاضوں کا پابند و ماتحت نہیں بنایا جہاں اس کو نافذ کرنا تھا، انھوں نے اس کو نئے سرے سے ڈھالنے اور اسلامی شکل دینے پر غور نہیں کیا، نہ اس کو مغربی تمدن اور اس کی اس مادی روح سے پاک کرنے کی طرف کوئی توجہ کی جس کی ایک مشرقی اسلامی ملک کو کوئی ضرورت نہ تھی، انھوں نے اس نظام کو مغرب سے اس کی ساری تفصیلات، خصوصیات اس کی روح و مزاج اور اس ماحول و روایات کے ساتھ جو اس سے وابستہ تھیں جوں کا توں "درآمد" کیا انھوں نے صرف مغرب کے تعلیمی نظام ہی پر اصرار نہیں کیا بلکہ مغربی تمدن اور روح کے قبول کرنے پر بھی شدید اصرار کیا، کالج کے قواعد میں یہ اصول قرار دیا گیا کہ کم سے کم ایک پرنسپل اور دو پروفیسر کالج میں اور ایک ہیڈ ماسٹر اسکول میں ہمیشہ یورپین ہونا چاہئے اور جہاں تک کالج کی آمدنی میں گنجائش ہو اس تعداد میں اور اضافہ کیا جائے[1]۔

چنانچہ بڑے اساتذہ میں کم سے کم چار پانچ ضرور انگریز ہوتے تھے جو مختلف شعبوں میں تنظیم و نگرانی کے فرائض انجام دیتے تھے، کالج کے نظام اور طلبہ کے اخلاق پر ان کا گہرا اثر تھا اپنے ان اثرات کو استعمال کرتے ہوئے انھوں نے ملکی سیاسیات میں بہت اہم رول ادا کیا، کالج کے پرنسپل مسٹر بک مشہور سیاست داں اور ہندوستان کی اسلامی سیاست کے پہلے انگریز رہنما تھے، اس رہنمائی کے سیاسی نتائج مسلمانوں کے

---

[1] حیات جاوید صفحہ ۲۳۸ (دوسرا حصہ) انجمن ترقی اردو ایڈیشن۔

سیاسی رجحان کے حق میں بہت افسوسناک ثابت ہوئے[۱]۔

غرضکہ سرسید کی دعوت اور تعلیمی نظریہ مغربی تہذیب کی دعوت کے ساتھ لازم و ملزوم سا ہو گیا، اور اس وجہ سے اس کی طرف سے لوگوں کے دلوں میں بہت سے شبہات پیدا ہو گئے، دینی حلقوں میں اس کے خلاف نفرت و بیزاری کی ایک لہر دوڑ گئی اور اس تحریک کے ساتھ اس کے مقاطعہ اور بائیکاٹ کی تحریک بھی شروع ہو گئی اور اس نے اس کے راستہ میں بہت سی غیر ضروری مشکلات پیدا کر دیں، علماء دین نے جو انگریزی تعلیم اور مفید علوم کے حصول کے ابتدا میں مخالف نہ تھے[۲] یہ دیکھ کر کہ یہ تحریک ابتدا ہی سے غلط رخ پر پڑ گئی ہے اور اس میں بہت سے غیر ضروری اور غلط عناصر شامل ہو گئے ہیں، مثلاً اس میں مغربی تمدن سے کھلی ہوئی مرعوبیت اور اس کی دعوت ہے، اخلاق و عقائد پر اس کے مضر اثرات پڑ رہے ہیں، انگریز پروفیسروں اور پرنسپل کے غیر محدود اثر و نفوذ کی وجہ سے ملتِ اسلامیہ کے منتخب اور ذہین نوجوان جو اس کالج میں زیر تعلیم ہیں، انگریزی معاشرت و تمدن اور برطانوی سیاست سے متاثر و مسحور ہوتے جا رہے ہیں، انھوں نے اس کی مخالفت میں پوری سرگرمی کا مظاہرہ کیا، دوسری طرف ان اثرات اور مغربی ماحول کی وجہ سے جو کالج پر چھایا ہوا تھا ایک ایسی اسلامی نسل پیدا ہوئی جو نام کے لحاظ سے مسلمان اور ذہن و دماغ کے لحاظ سے خالص مغربی تھی، معاشرت و تمدن میں انگریزی طور و طریق کی پابند اور حامی، عقائد میں بعض اوقات کمزور اور متزلزل۔

دوسرا کمزور پہلو یہ تھا کہ ان کا سارا زور انگریزی زبان و ادب کے حصول اور

---

[۱] تفصیل کے لئے دیکھئے "ہندوستانی مسلمان" از مصنف۔

[۲] ملاحظہ ہو حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی کا فتویٰ درباب حلّت تعلیم زبان انگریزی (فتاویٰ عزیزیہ)

اعلیٰ تعلیم پر تھا، اور عملی علوم کی طرف (جو ترقی کا زینہ اور مغربی اقوام کی ترقی اور کامرانی کا راز ہیں، اور جن کے انقلاب انگیز اثرات و نتائج کا انھوں نے انگلستان کے قیام میں شاہدہ کیا تھا) انھوں نے خاطر خواہ توجہ نہیں کی، حالانکہ مغرب سے لینے کی اور اس میں کمال حاصل کرنے کی اگر کوئی چیز تھی تو یہی تھی، بلکہ انھوں نے صنعتی تعلیم کی تحریک و تجویز کی سخت مخالفت کی اور اس موضوع پر سخت اور تلخ مضامین لکھے، اس سلسلہ کا آخری مضمون وہ تھا جو ۱۹ر فروری ۱۸۹۸ء میں انھوں نے علی گڑھ گزٹ میں شائع کروایا، جس کا مقصد (مولانا حالی کے بقول) یہ تھا کہ "ہندوستان کی موجودہ حالت کے لحاظ سے سردست ٹکنیکل ایجوکیشن کی چنداں ضرورت نہیں ہے، بلکہ سب سے مقدم اعلیٰ درجہ کی دماغی تعلیم کی ضرورت ہے، جو اب تک بالکل پورے طور پر پوری نہیں ہوئی ہے"[1]

صنعتی تعلیم کے خلاف سرسید کے جذبات اور ان کی کوششوں کا ذکر کرتے ہوئے مولانا حالی لکھتے ہیں:-

> "چند برسوں سے جو اکثر اعلیٰ حکام اپنی اسپیچوں میں ٹکنیکل ایجوکیشن کی ضرورت بیان کرتے تھے، اس سے سرسید کو بھی اندیشہ ہو گیا تھا کہ گورنمنٹ کا منشا ہائی ایجوکیشن یا لٹریری تعلیم کے موقوف کرنے کا ہے، اور اسی وجہ سے جب کوئی ایسی اسپیچ ان کی نظر سے گزرتی تھی، وہ ضرور اس کے برخلاف کچھ نہ کچھ لکھتے تھے، اور اسی بنا پر انھوں نے کانفرنس[2] کے پانچویں اجلاس میں ایک ریزولیشن ٹکنیکل ایجوکیشن کے خلاف پیش کیا تھا، اور ریزولیشن کی تائید میں ایک طویل اسپیچ کی تھی جو کانفرنس کی رویداد میں مندرج ہے"[3]

---

[1] حیات جاوید ص۲۸۱ (حصہ دوم) انجمن ترقی اردو ایڈیشن [2] محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ [3] حیات جاوید ص۲۶۱ (حصہ دوم)

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ اسلامی ادارہ خالص علمی وادبی رجحان کے ساتھ آگے بڑھا اور مغربی تمدن کی تقلید کا ذوق اور انگریزی ادبیات میں کمال حاصل کرنے کا شوق اس کے ذہین اور حوصلہ مند طلبہ پر غالب رہا، اس نے انگریزی کے بعض اچھے مقرر، صاحب قلم، محکموں کے افسر اور انتظامیہ کے عہدہ دار پیدا کئے، لیکن قدرتی طور پر ریاضی، طبعیات، کیمسٹری، ٹکنالوجی اور صنعتی علوم میں جن کی اسلامی ہند کو سخت ضرورت تھی، ممتاز شخصیتیں اور غیر معمولی افراد پیدا نہ ہوسکے، اور اس کی وجہ سے اس کا دائرۂ اثر سرکاری ملازمتوں اور معمولی انتظامی اداروں تک محدود رہا۔

اس تحریک کے نتائج اور اس کی خدمات!

اس ساری تفصیل و تنقید کے باوجود اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سر سید احمد خاں ایسی طاقتور شخصیت کے مالک تھے جس سے زیادہ طاقتور شخصیت اس دور کے قائدین میں کسی کی نظر نہیں آتی، انھوں نے ایک بڑے وسیع محاذ پر جنگ جاری رکھی جس تحریک کی انھوں نے قیادت کی اس کو ایسی کامیابی نصیب ہوئی اور اس نے مسلمانوں کی نئی نسل کو اتنا متأثر کیا جتنا کسی دوسری تحریک نے نہیں کیا تھا، سر سید احمد خاں کی طاقتور شخصیت کے اثر کا ہندوستان کی اسلامی سوسائٹی میں دائرہ بہت وسیع ہے، انھوں نے ادب، زبان، طریق فکر و اسالیب بیان سب کو کم و بیش متأثر کیا، اور ایک ایسے ادبی و فکری دبستان کی بنیاد ڈالی جس کے اندر بڑی بڑی شخصیتیں پیدا ہوئیں۔

اس عظیم تعلیمی تحریک نے جس کی قیادت سر سید احمد خاں نے پوری نصف صدی تک خلوص اور قابلیت کے ساتھ کی تھی بعض ناقابل انکار نتائج پیدا کئے، اس نے

ہندوستان کی اسلامی سوسائٹی میں اس تعلیمی اور اقتصادی خلا کو بڑی حد تک پُر کیا جو انگریزی اقتدار اور انقلاب حکومت کے بعد پیدا ہو گیا تھا، ایک حد تک اس نے مسلمانوں سے مایوسی اور بددلی بھی کم کی، اس ادارہ میں بعض بڑے لائق نوجوان صاحب فکر، صحافی، اہلِ قلم اور ایسے لیڈر پیدا ہوئے جنھوں نے بعد میں تحریک خلافت اور تحریک آزادئ ہند کی پرزور رہنمائی کی، بعد میں جب پاکستان کی تحریک شروع ہوئی اور پھر پاکستان کی اسلامی ریاست وجود میں آئی تو اس کو اسی تعلیم گاہ کے فضلاء میں متعدد رہنما اور لائق منتظم دستیاب ہوئے لیکن مسلمانوں کے جدید نازک ثقافتی و فکری تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے اس ادارہ نے وہ کردار ادا نہیں کیا جس کی اس سے توقع تھی، یہ مغرب کے علمی و عملی تجربوں اور ذخیروں کو مسلم معاشرہ اور ملتِ اسلامیہ کے حالات و ضروریات کے مطابق ڈھالنے کا عظیم اور مجتہدانہ کام تھا، یہ ایک نئی اسلامی نسل کا پیدا کرنا تھا جو عقیدہ اور اصول میں مستحکم و مضبوط اور اس اہم کردار سے واقف ہو جو اس کو تہذیبِ عالم کی قیادت میں ادا کرنا ہے، اس کی نظر میں وسعت اور فکر میں لچک ہو، جدید علوم اور مغربی ثقافت سے اس نے اس کے اچھے پہلو اور اس کا مغز لے لیا ہو اور اس کی کمزوریوں اور غیر ضروری اجزاء سے احتراز کیا ہو جس کے نتائج فکر و تحقیقات اپنے دماغ کا نتیجہ ہوں اور ان میں اسلامی ذہانت اور خود اعتمادی صاف جھلکتی ہو اور جن کے فکر و عمل میں "لذتِ کردار" اور "جرأتِ اندیشہ" پہلو بہ پہلو ہوں، یہ وہ نئی نسل تھی جس کا عالمِ اسلام بڑی بے چینی اور اشتیاق کے ساتھ عرصہ سے منتظر اور اس کے لئے چشم براہ تھا، یہ نسل (اگر اللہ تعالےٰ کی مرضی ہوتی) عالمِ اسلام کو اس تحیر و اضطراب سے نجات دے سکتی تھی جس میں وہ عرصہ سے مبتلا تھا، اور اس کو

اقوامِ عالم کی قیادت اور تہذیبِ حاضر کی رہنمائی میں مرکزی مقام عطا کرسکتی تھی۔

اکبر الٰہ آبادی

سرسید کے تقلیدی ذہن اور رجحان کا مقابلہ ایک ایسے معاصر کے حصہ میں آیا جس نے قدیم طرز پر تربیت پائی تھی، اور جدید سے واقف تھا، اس نے بغیر کسی رُو رعایت کے اس پر نشتر زنی کی، یہ اکبر الٰہ آبادی[1] تھے، انھوں نے اپنے مخصوص و معروف مزاحیہ انداز اور بلیغ اور طاقتور اسلوب میں نئی تعلیم پانے والے نوجوانوں پر (جو اپنے ہی لخت جگر تھے) تنقید کا ناخوشگوار لیکن ضروری فرض انجام دیا اور آخر دم تک اسی کو اپنے شعر و سخن کا موضوع بنائے رکھا، انھوں نے سرسید کے خلوص کے اعتراف کے ساتھ ان کی تعلیمی سیاست، تقلیدِ مغرب کی پرجوش دعوت اور کالج کی مغربی زندگی اور فضا پر بے باکانہ مگر لطیف انداز میں تنقید کی جس میں اس کی مغرب کی اندھی تقلید، عقائد میں کمزوری، دین میں ڈھیلے پن، نوجوانوں کی تن آسانی، ان کے بلند معیار زندگی، فیشن پرستی، اہل دین سے وحشت ملازمتوں پر انحصار، قدیم مشرقی تہذیب اور اس کی روایات اور خصوصیات سے بغاوت، مغربی معاشرہ میں فنائیت اور خالص مادی طرز فکر کو خوب نمایاں کیا، انھوں نے اپنی سحر انگیز شاعری اور فن کار قلم سے نئی نسل کی ایسی بولتی ہوئی تصویر کھینچ کر رکھ دی جس میں سارے خطوط و انداز ایک ایک کرکے ابھر آئے، ان کے کلام کو ہندوستان کے مختلف طبقوں اور مکاتب خیال میں قبول عام حاصل ہوا، اہل ذوق اور نوجوانوں نے اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور اس کو اس کثرت سے سنا اور پڑھا گیا کہ اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔

---

[1] اکبر الٰہ آبادی کی شاعری اور پیغام پر سب سے بہتر کتاب مولانا عبدالماجد دریابادی کے مضامین کا مجموعہ "اکبرنامہ یا اکبر میری نظر میں" ہے۔

لیکن اپنی تاثیر و مقبولیت کے باوجود وہ تقلید کے اس تیز دھارے کو روک نہیں سکا، اور نئے ابھرتے ہوئے معاشرہ کے لئے کوئی مضبوط و مثبت بنیادیں فراہم نہیں کرسکا، اس کی وجہ یہ تھی کہ جس ادب اور اصلاح کی بنیاد طنز و تعریض پر ہوتی ہے، اس کی عمر اور اثرات محدود ہوتے ہیں، اور وہ کوئی تعمیری انقلاب پیدا نہیں کرسکتا لیکن بہرحال وہ افادیت سے خالی نہ تھا، اور ہندوستان کے جدید اجتماعی اور ادبی تصورات و رجحانات کی تشکیل میں اس کا بھی حصہ ہے۔

قومی جدوجہد اور غیر ملکی سامان کا مقاطعہ

یہ تقلیدی رجحان (جس کی قیادت مسلمانوں میں سید احمد خاں کر رہے تھے، اور انگریزی حکومت اور نظام تعلیم اس کا پشت پناہ تھا) تعلیم یافتہ طبقہ میں پوری آزادی کے ساتھ پرورش پاتا اور آگے بڑھتا رہا، اس کے راستہ میں کوئی چیز حائل نہ ہوسکی، ہاں ہندوستانی مزاج کے "رکھ رکھاؤ" جدید تغیرات کے قبول کرنے میں اعتدال، قدامت سے وابستگی اور زندگی و معاشرت کی سادگی کی وجہ سے اس میں وہ تیزی نہ آسکی جو مشرق وسطی کے دوسرے اسلامی و مشرقی ممالک میں نظر آئی، دراصل اس کو ملک کا ہمہ گیر اور سب سے زیادہ طاقتور رجحان ہونا چاہیئے تھا، اور اس کے اثر سے ہندوستانی معاشرہ کو طرز فکر، آداب معاشرت اور تمدن و اجتماع میں خالص مغربی معاشرہ ہونا چاہیئے تھا، لیکن ایک ایسا واقعہ پیش آیا جو اس قدرتی عمل کی راہ میں رکاوٹ بن گیا اور جس نے تاریخ کا رخ بدل دیا۔

اس واقعہ نے انگریزی حکومت کے اثر و اقتدار کو (جو ہندوستان میں تہذیب

جدیدکی علمبرداری) لوگوں کے دلوں سے کم کردیا اور اس تہذیب کی عالمگیر قیادت کی صلاحیت اور عدل وانصاف کی قابلیت اور "جوہر" MERIT کے بارہ میں خاصا اشتباہ پیدا کردیا، اس تہذیب کے سربراہوں اور رہنماؤں کے خلاف نفرت اور کراہیت پیدا کردی اور اس حکومت اور اس سے نسبت رکھنے والی ہر چیز کے مقاطعہ کی تحریک پیدا کردی، خواہ اس کا تعلق تمدن ومعاشرت سے ہو یا مصنوعات اور درآمدی مال سے، یہ پہلی عالمی جنگ (۱۴ئہ سے ۱۸ئہ) تھی جس میں برطانیہ اپنے اتحادیوں کے ساتھ اس عثمانی سلطنت سے برسرجنگ تھا جو مسلمانوں کے نزدیک شوکتِ اسلامی کا آخری رمز، خلافت کی پاسباں اور حامیِ اسلام کی حیثیت رکھتی تھی ۱۹۱۸ئہ میں جب ترکوں کو شکست ہوئی اور انگریزوں نے قسطنطنیہ پر قبضہ کرلیا اور دولتِ عثمانیہ کے مقبوضات کو آپس میں تقسیم کرلیا، اس وقت ہندوستان میں بغاوت کا لاوا پھوٹ پڑا، ہندو اور مسلمان دونوں نے مل کر تحریک خلافت میں دوش بدوش حصہ لیا، اس تحریک میں مولانا محمد علی شوکت علی اور مولانا ابوالکلام آزاد کے ساتھ گاندھی جی بھی نظر آتے ہیں ۱۹۲۰ئہ میں انھوں نے حکومت کے بائیکاٹ اور سول نافرمانی اور زندگی کے ہر شعبہ میں انگریزوں کے ساتھ ترک موالات اور غیر ملکی سامان کے مقاطعہ کی دعوت دی، یہ اس وطنی تحریک کا سب سے زیادہ کارگر اور پُرامن ہتھیار تھا، اس کے نتیجہ میں ملک میں ناراضگی اور نفرت کی ایک لہر دوڑ گئی، اس تحریک کا پیغام اور نعرہ تھا کہ "بدیشی مال اور غیر ملکی مصنوعات کا بائیکاٹ کرو" اور اس کی دعوت وتلقین تھی کہ قومی وعوامی لباس ومعاشرت کا مظاہرہ کیا جائے، سادگی اور کفایت شعاری کو پیش نظر رکھتے ہوئے ملکی مصنوعات پر قناعت کی جائے، دیکھتے دیکھتے پورے ملک میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک آگ سی لگ گئی، لاکھوں

ہندوستانیوں کے دل میں مغربی تہذیب کا جادو ٹوٹ گیا لوگوں نے بڑے بڑے جلسوں اور مجمعوں میں انگریزی لباس اور غیر ملکی کپڑوں میں آگ لگادی بڑے بڑے دولتمندوں اور تعلیم یافتہ اشخاص اور مرفہ الحال طبقہ کے افراد نے مسرفانہ مغربی طرز زندگی کو خیر باد کہہ کر سادہ اور کفایت شعار قومی زندگی اختیار کرلی، ہزاروں آدمیوں کی زندگی میں، جن میں بڑے بڑے وکلاء اہل ثروت اور تاجر تھے انقلاب پیدا ہوگیا، انھوں نے انگریزی حکومت کے جیل بھر دیئے اور طرح طرح کی سختیاں جھیلیں، انھوں نے ایسے ایثار، زہد و قناعت، دینی جذبہ، وطن دوستی، عام ہمدردی اور دینی حمیت و غیرت کا..... ثبوت دیا جس کی اس تحریک سے قبل کوئی توقع نہ تھی۔

اس تحریک کے ساتھ (جو مذہبی رنگ لئے ہوئے تھی) ہندوستان کی تحریک آزادی کا آغاز ہوا جس کا مقصد ملک کی آزادی، سامراج کا مقابلہ اور خود مختار حکومت کا قیام تھا مشرق کی بہت سی سیاسی تحریکوں کے برخلاف یہ ایک ایسی نیم سیاسی نیم معاشرتی تحریک تھی، جو ایک خاص فکری اور اقتصادی فلسفہ رکھتی تھی، اس نے تہذیب جدید کے شکنجہ کو ڈھیلا کرنے اور قومی و وطنی و مذہبی شعور کو مضبوط کرنے میں نمایاں حصہ لیا اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان دونوں عوامی تحریکوں نے ملک سے احساس کہتری ختم کرنے، عزت نفس اور خودداری کا احساس پیدا کرنے اور فکری و تہذیبی استعمار (سامراج) سے نجات حاصل کرنے کی خواہش پیدا کرنے میں وہ خدمت انجام دی ہے جو بڑے بڑے علمی فلسفے بھی نہیں کرسکتے اور یہ ان عوامی اور عملی تحریکات کا خاصہ ہے جو ہر ملک میں سوسائٹی میں گھس کر اپنا کام کرتی ہیں، اور اس کے دل و دماغ پر چھا جاتی ہیں۔

ڈاکٹر اقبال اور مغربی تہذیب پر ان کی تنقید

بیسویں صدی کے آغاز ہی میں مسلم نوجوانوں نے مغربیات کے مطالعہ و تحقیق کا آغاز کر دیا تھا، وہ ہندوستان کی اعلیٰ یونیورسٹیوں اور تعلیم گاہوں میں مغربی علوم و افکار کا گہرا مطالعہ اور تجزیہ کر رہے تھے، فاتح تہذیب اور اس کے علمبرداروں سے مرعوبیت اب روز بروز کم ہو رہی تھی، ہندوستانی مسلمان اعلیٰ تعلیم کے لئے اب یورپ آنے جانے لگے تھے، جن میں سے بعض یورپ کے بڑے بڑے تعلیمی مرکزوں میں طویل عرصہ تک قیام کر کے وہاں کے علمی سرچشمہ سے سیراب ہوتے اور جدید علوم کو ممتاز اور آزاد فکر اساتذہ کی رہنمائی میں حاصل کرتے، وہ مغربی تہذیب سے محض کتابوں کے ذریعہ نہیں بلکہ اس کے بہترین نمائندہ اشخاص کے ذریعہ تعارف حاصل کرتے اور اس کے قلب و جگر میں اتر کر اور اس کی تہ میں پہونچ کر اس سے اس طرح واقف ہونے کی کوشش کرتے جس طرح کوئی تعلیم یافتہ یورپین کر سکتا ہے، وہاں کے فلسفوں، نظاموں اور مختلف مکاتب خیال کا جائزہ لیتے اور ان کے مضمرات حقائق و اسرار تک پہونچنے کی کوشش کرتے، ان کو مغرب کے ذہن و مزاج، اس کے قومی غرور اور احساس برتری اور اس کے عوام کی خود پسندی اور انانیت کو قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملتا، اس سوسائٹی میں زوال و انحطاط اور ذہنی افلاس کی ابتدائی علامتیں اور آثار ان پر واضح ہوئے، وہ صالح اور تعمیری اجزاء بھی ان کی نظر میں آئے جو انسانیت کے لئے فلاح بخش ہو سکتے ہیں، اسی طرح وہ تخریبی اور انسانیت دشمن اجزاء بھی (جو اس تہذیب کے خمیر میں شروع سے موجود ہیں) ان کی نگاہوں سے اوجھل نہ ہو سکے، ان سب مشاہدات نے ان کے دل و دماغ میں ایسے احساسات اور معانی اجاگر کئے، جن کا حصول اتنے طویل قیام

کے بغیر اور اس کے نظریات و افکار کے تقابلی مطالعہ، جرأت مندانہ اور گہری نظر، تقلید (مغرب) کی بندش سے خلاصی اور اس ایمان کی چنگاری کے بغیر جو ابھی بجھی نہ تھی بلکہ راکھ کے ڈھیر میں دب گئی تھی، اور کسی وقت بھی بھڑک اٹھنے کی منتظر تھی، ناممکن تھا، ان سب چیزوں کے مشاہدہ کے بعد ان میں بہت سے فاضل مغربی تہذیب سے مایوس ہو کر اس کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرتے ہوئے بڑی گہرائی اور جرأت کے ساتھ اس پر تنقید کا ارادہ لے کر واپس ہوئے، ان کے فکر اور تنقید میں نہ انتہا پسندی تھی نہ واقعات کا انکار نہ حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے کا جذبہ۔

ان انقلابی ناقدین میں سب سے نمایاں نام علامہ محمد اقبال کا ہے، جن کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ تعلیم جدید نے اس صدی کے اندر ان سے بہتر نمونہ پیش نہیں کیا، ان کو جدید مشرق کا سب سے زیادہ بالغ نظر مفکر قرار دیا جا سکتا ہے، مشرق کے اہلِ نظر اور ذہین افراد میں (باوجود اس کے کہ ان میں سے اکثر کو مغرب کی سیر اور مطالعہ کا موقعہ ملا) کوئی ایسا نہ تھا جس نے مغربی تہذیب و افکار کا اتنی گہری نظر سے مطالعہ کیا ہو اور اس قدر جرأت کے ساتھ اس پر تنقید کی ہو۔

محمد اقبال نے اس تہذیب کے عناصر ترکیبی اور اس کے کمزور پہلوؤں کا اچھی طرح مطالعہ کیا اور اس فساد کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کی جو اس کے مادی رجحان مذاہب اور اخلاقی و روحانی اقتدار سے اہلِ مغرب کی بغاوت کی وجہ سے اس کے خمیر میں شامل ہو گیا ہے، انھوں نے قلب و نظر کے اس فساد کو جو اس تہذیب کی خصوصیت ہے روحِ تہذیب کی آلودگی و ناپاکی پر محمول کیا ہے، وہ کہتے ہیں۔ؔ

فسادِ قلب و نظر ہے فرنگ کی تہذیب　　　کہ روح اس مدنیت کی رہ سکی نہ عفیف

ضمیرِ پاک و خیالِ بلند و ذوقِ لطیف[۱]
اگر نہ ہو تو جہاں میں کوئی کمال نہیں

اس کا نتیجہ دل کی وہ بے نوری اور زندگی کی وہ بے کیفی ہے، جو اس تہذیب پر پوری طرح مسلّط ہے، اور اس نے اس کو ایک مشینی و مصنوعی رنگ دے کر روحانی قدروں سے اس کا رشتہ منقطع اور خدا کی رحمت سے اس کو دور کر دیا ہے، وہ کہتے ہیں:-

یہ عیشِ فراواں یہ حکومت یہ تجارت
دل سینۂ بے نور میں محرومِ تسلّی
تاریک ہے افرنگ مشینوں کے دھوئیں سے
یہ وادیٔ ایمن نہیں شایانِ تجلّی[۲]

انھوں نے اس تہذیب کی لادینی بنیاد اور اس کے لادینی خمیر کا جابجا ذکر کیا ہے، جس کو مذہب و اخلاقیات سے بیر ہے، اور جو روحِ ابراہیمی سے متنفر ہو کر یادیت کے معبودانِ باطل کی پرستار اور ایک نئے بت خانہ کی معمار ہے، مثنوی "پس چہ باید کرد" میں فرماتے ہیں:-

لیکن از تہذیبِ لادینی گریز!
زاں کہ او با اہلِ حق دارد ستیز
فتنہ ہا ایں فتنہ پرداز آورد
لات و عزّیٰ در حرم باز آورد
از فسونش دیدۂ دل نابصیر
روح از بے آبیٔ او تشنہ میر
لذّتِ بے تابی از دل می برد!
بلکہ دل زیں پیکرِ گل می برد!

کہنہ دزدے غارتِ او برملاست
لالہ می نالد کہ داغِ من کجاست![۳]

اس تہذیب کا شیوہ غارت گری اور آدم دری ہے اور اس کا مشغلہ اور مقصد تجارت اور سوداگری ہے، دنیا کو امن و سکون اور بے غرض محبت اور خلوص کی دولت اسی وقت نصیب ہو سکتی ہے جب اس تہذیب جدید کا نظام تہ و بالا ہو جائے، فرماتے ہیں:-

---

۱؎ ضربِ کلیم ص ۶۹ ۲؎ ایضاً ص ۱۴۱ ۳؎ ص ۱۴

فتنۂ تہذیب نو آدم دری است | پردۂ آدم دری سوداگری است
این فسونکاری فکر چالاک یہود | نور حق از سینۂ آدم ربود!
تانہ و بالانہ گردد این نظام | دانش و تہذیب و دیں سودائے خام[1]

یہ تہذیب اگرچہ (اپنی عمر و تاریخ کے لحاظ سے) جواں سال و نو عمر ہے مگر اپنی غلطیوں اور بنیادی کمزوریوں کی وجہ سے عالمِ نزع میں گرفتار اور مکمل زوال کے لئے تیار ہے، اس تہذیب میں "یہودی شاطروں" نے جو اقتدار حاصل کر لیا ہے اس کے پیشِ نظر بعید نہیں کہ یہودی ہی اس "مقدس ترکہ" کے وارث ہوں، وہ کہتے ہیں:۔

ہے نزع کی حالت میں یہ تہذیبِ جواں مرگ
شاید ہوں کلیسا کے یہودی متولی[2]

لیکن بسترِ مرگ پر طبعی موت مرنے کے بجائے سارے آثار و قرائن اس بات کے شاہد ہیں کہ یہ تہذیب خودکشی کا ارتکاب کرے گی اور خود اپنے خنجر سے اپنا گلا کاٹ کر اپنا کام تمام کرلے گی۔ فرماتے ہیں:۔

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہوگا

اس تہذیب نے دین و اخلاق کی نگرانی اور خوفِ خدا کی رفاقت کے بغیر تسخیرِ کائنات کا جو نازک سفر شروع کیا تھا، اس کی کامیابی نے خود اس تہذیب کے وجود و بقا کو خطرہ میں ڈال دیا ہے اور اندیشہ پیدا ہو گیا ہے کہ وہ خود اپنی آگ میں جل کر خاک نہ ہو جائے، فرماتے ہیں:۔

وہ فکرِ گستاخ جس نے عریاں کیا ہے فطرت کی طاقتوں کو | اسی کی بیتاب بجلیوں سے خطر میں ہے اس کا آشیانہ[3]

---

[1] پس چہ باید کرد صفحہ ۳۰ [2] ایضاً صفحہ ۱۴۱ [3] بال جبریل صفحہ ۱۶۷

"سود و سودا اور مکر و فن" کی یہ دنیا جس کا فرنگی معمار ہے، اب دم توڑ رہی ہے، اور ایک نئی دنیا جنم لے رہی ہے۔ وہ کہتے ہیں:۔

جہانِ نو ہو رہا ہے پیدا وہ عالمِ پیر مر رہا ہے
جسے فرنگی مقامروں نے بنا دیا ہے قمار خانہ[۱]

وہ کہتے ہیں کہ یہ تہذیب علم کی ضیاء سے روشن اور زندگی کی حرارت سے شعلہ زن ہے، وہ طبعیات و صنعت کے دائرہ میں وقتاً فوقتاً اپنے کمالات کا اظہار بھی کرتی رہتی ہے لیکن دراصل وہ انقلابی ایجاد و اجتہاد کی قوت سے محروم ہو چکی ہے، وہاں عقل کا نفع، دل کا "زیاں" ہے، اس کے رہنما خود تقلید کے بندے اور لکیر کے فقیر ہو چکے ہیں، اس کے مرکز اب نعرۂ مستانہ، ادائے قلندرانہ و جرأتِ پیمبرانہ سے محروم ہو چکے ہیں۔ کہتے ہیں:۔

یاد ایامے کہ بودم در خمستانِ فرنگ	جام او روشن تر از آئینۂ اسکندر است
چشمِ مستِ مے فروشش بادہ را پروردگار	بادہ خواراں را نگاہِ ساقی اش پیغمبر است
جلوۂ او بے کلیم و شعلۂ او بے خلیل	عقلِ ناپروا متاعِ عشق را غارت گر است

در ہوایش گرمیٔ یک آہِ بے تابانہ نیست
رندِ ایں میخانہ را یک لغزشِ مستانہ نیست[۲]

ایک موقع پر اس تمدن کے روشن چہرہ لیکن تاریک دل کی تصویر اس طرح کھینچتے ہیں:۔

یورپ میں بہت روشنیٔ علم و ہنر ہے	حق یہ ہے کہ بے چشمۂ حیواں ہے یہ ظلمات
رعنائیٔ تعمیر میں رونق میں صفا میں	گرجوں سے کہیں بڑھ کے ہیں بنکوں کی عمارات
ظاہر میں تجارت ہے حقیقت میں جوا ہے	سود ایک کا لاکھوں کے لئے مرگِ مفاجات

---

[۱] بالِ جبریل صفحہ ۱۷۶ [۲] پیامِ مشرق صفحہ ۲۴۸

یہ علم یہ حکمت یہ تدبّر یہ حکومت
پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیم مساوات

بیکاری و عریانی و مے خواری و افلاس
کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات

وہ قوم کہ فیضانِ سماوی سے ہو محروم
حد اس کے کمالات کی ہے برق و بخارات

مغربی تمدّن، اس کی بنیادوں اور اس کے طرزِ فکر پر یہ تنقید اور جائزہ ان کے علمی خطبات میں جو انھوں نے مدراس میں دیئے تھے، اور جو (RECONSTRUCTION OF RELIGIOUS-THOUGHT IN ISLAM) کے نام سے شائع ہوئے تھے، قدرتی طور پر زیادہ ٹھوس اور گہرا ہے، اس لئے کہ علم و فلسفہ کی زبان شعر و ادب کی زبان کے مقابلہ میں علمی خیالات اور جچی تلی تنقید کی زیادہ صلاحیت رکھتی ہے، وہ مغرب کی مادّی تہذیب کی ساخت اور مزاج اور موجودہ انسان پر (جو اس کا نمائندہ اور علمبردار ہے) نیز ان مسائل اور مشکلات پر جن سے وہ دوچار ہے تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں :-

"عہدِ حاضر کے تنقیدی فلسفوں اور علومِ طبعیہ میں اختصاص نے انسان کی جو حالت کر رکھی ہے، بڑی ناگفتہ بہ ہے، اس کے فلسفۂ فطرت نے تو بیشک اسے یہ صلاحیت بخشی کہ قوائے فطرت کی تسخیر کرے، مگر مستقبل میں اس کے ایمان اور اعتماد کی دولت چھین کر لی۔"[1]

"عصرِ حاضر کی ذہنی سرگرمیوں سے جو نتائج مترتب ہوئے ان کے زیرِ اثر انسان کی روح مردہ ہو چکی ہے، یعنی وہ اپنے ضمیر اور باطن سے ہاتھ دھو بیٹھا ہے، خیالات اور تصوّرات کی جہت سے دیکھئے تو اس کا وجود خود اپنی ذات سے متصادم ہے، سیاسی اعتبار سے نظر ڈالئے تو افراد افراد سے، اس میں اتنی سکت ہی نہیں کہ اپنی بے رحم انانیت اور ناقابلِ تسکین جوعِ زر پر قابو حاصل کر سکے، یہ باتیں ہیں جن کے زیرِ اثر زندگی کے

---

[1] تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ صفحہ ۲۸۷-۲۸۸

اعلیٰ مراتب کے لئے اس کی جدوجہد بتدریج ختم ہو رہی ہے، بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ وہ درحقیقت زندگی ہی سے اکتا چکا ہے اس کی نظر حقائق پر ہے یعنی حواس کے اس سرچشمہ پر جو اس کی آنکھوں کے سامنے ہے لہٰذا اس کا تعلق اپنے اعماق وجود سے منقطع ہو چکا ہے اور پھر جیسا کہ ہکسلے (HUXLEY) کو کبھی خدشہ تھا، اور جس کا بتاسف وہ اظہار بھی کر چکا ہے مادّیات کے اس باقاعدہ نشوونما نے اس کے رگ وپے بھی مفلوج کر دیئے ہیں۔[۱]

"عصر حاضر کی لادینی اشتراکیت کا مطمح نظر بے شک نسبتاً زیادہ وسیع ہے اور اس کے جوش وسرگرمی کا بھی وہی عالم ہے جو کسی نئے مذہب کا، لیکن اس کی اساس چونکہ ہیگل (HEGEL) کے مخالف نظر تبعین پر ہے لہٰذا وہ اس چیز ہی سے برسرپیکار ہے جو اس کے لئے زندگی اور طاقت کا سرچشمہ بن سکتی تھی۔"[۲]

علامہ اقبال مغربی سوسائٹی کو ایک ایسی سوسائٹی قرار دیتے ہیں جس کے پیچھے صرف وحشیانہ رسہ کشی کار فرما ہے، وہ اس کو ایک ایسی تہذیب کہتے ہیں جو دینی اقدار اور سیاسی اقدار کی کشمکش کی وجہ سے اپنی روحانی وحدت کھو بیٹھی ہے۔

وہ ایک واقف کار اور مبصر کی حیثیت سے سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں کو شجر مادیت کی دو شاخیں اور ایک ہی خاندان کے دو گھرانے قرار دیتے ہیں جن میں ایک مشرقی ہے اور ایک مغربی لیکن مادی طرز فکر، زندگی اور انسان کے متعلق محدود نقطۂ نظر میں دونوں "یک جان دو قالب" ہیں، ایک فکری اور تخیلاتی سفر میں جس میں ان کی ملاقات سید جمال الدین افغانی سے ہوئی ہے ان کی زبان سے یہ تبصرہ نقل کرتے ہیں:-

ہر دو را جاں ناصبور و ناشکیب　　　ہر دو یزداں ناشناس آدم فریب

---

[۱] تشکیل جدید الہیات اسلامیہ صفحہ ۲۸۹-۲۹۰　　[۲] ایضاً صفحہ ۲۹۱-۲۹۲

زندگی ایں را خروج آں را خراج
درمیانِ ایں دو سنگ آدم زجاج

ایں بہ علم و دین و فن آرد شکست
آں برد جاں را زتن ناں را زدست

غرق دیدم ہر دو را در آب و گل
ہر دو را تن روشن و تاریک دل

زندگانی سوختن با ساختن
در گلے تخمِ دلے انداختن[1]

○

غربیاں گم کردہ اند افلاک را
در شکم جویند جانِ پاک را

رنگ و بو از تن نگیرد جانِ پاک
جز بہ تن کارے ندارد اشتراک

دینِ آں پیغمبرِ حق ناشناس
بر مساواتِ شکم دارد اساس

تا اخوت را مقام اندر دل است
بیخِ او در دل نہ در آب و گل است[2]

مغربی تہذیب اور اسلامی ممالک

محمد اقبال کا خیال تھا کہ مغربی تہذیب جو خود جاں بلب ہے اسلامی ممالک کو کوئی نفع نہیں پہونچا سکتی اور نہ اس میں دوبارہ زندگی پیدا کرنے کی صلاحیت ہے کہتے ہیں :-

نظر آتے نہیں بے پردہ حقائق ان کو
آنکھ جن کی ہوئی محکومی و تقلید سے کور

زندہ کر سکتی ہے ایران و عرب کو کیونکر
یہ فرنگی مدنیت کہ جو ہے خود لبِ گور[3]

مغرب نے مشرق کو احسان کا جو بدلہ دیا ہے اس کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں :-

---

[1] جاوید نامہ ص۷۰ [2] ایضاً ص۶۹ [3] ضرب کلیم ص۶۸

فرنگیوں کو عطا خاکِ سوریا نے کیا　　نبیؑ عفت و غمخواری و کم آزاری[1]
صلہ فرنگ سے آیا ہے سوریا کے لئے　　مے و قمار و ہجومِ زنانِ بازاری[2]

مشرق میں تجدد کے علمبرداروں پر ان کی تنقید

وہ اسلامی ممالک میں تحریک تجدید (لیکن زیادہ صحیح الفاظ میں "مغربیت") کے علمبرداروں سے بدگمان نظر آتے ہیں اور یہ اندیشہ ظاہر کرتے ہیں کہ تجدید کی دعوت کہیں تقلیدِ فرنگ کا بہانہ اور پردہ نہ ہو — کہتے ہیں :-

لیکن مجھے ڈر ہے کہ یہ آوازۂ تجدید
مشرق میں ہے تقلیدِ فرنگی کا بہانہ[3]

وہ اس تحریکِ اصلاح و تجدید (مغربیت) کے علمبرداروں کی بے بضاعتی اور تہی مائیگی کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں :-

میں ہوں نومید تیرے ساقیانِ سامری فن سے　　کہ بزمِ خاوراں میں لے کے آئے ساتگیں خالی
نئی بجلی کہاں ان بادلوں کے جیب و دامن میں　　پرانی بجلیوں سے بھی ہے جن کی آستیں خالی[4]

وہ دوسروں کی تہذیب و افکار کی اندھی تقلید کی مذمت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ ہر قوم کے لئے عار کی بات ہے لیکن اس قوم کے لئے ناقابلِ معافی گناہ ہے جو قوموں کی قیادت اور عالمی انقلاب کے لئے پیدا کی گئی ہے — کہتے ہیں :-

جو عالمِ ایجاد میں ہے صاحبِ ایجاد　　ہر دور میں کرتا ہے طواف اس کا زمانہ
تقلید سے ناکارہ نہ کر اپنی خودی کو　　کر اس کی حفاظت کہ یہ گوہر ہے یگانہ

---

[1] حضرت عیسیٰ علیہ السلام مراد ہیں [2] ضربِ کلیم صفحہ ۱۵۰ [3] ایضاً صفحہ ۱۷ [4] ایضاً صفحہ ۶۹

اس قوم کو تجدید کا پیغام مبارک　　ہے جس کے تصور میں فقط بزمِ شبانہ
لیکن مجھے ڈر ہے کہ یہ آوازۂ تجدید　　مشرق میں ہے تقلیدِ فرنگی کا بہانہ[1]

وہ مشرق کی اسلامی اقوام کو ملامت کرتے ہیں جن کا منصب قیادت و رہنمائی کا تھا، لیکن وہ پست درجہ کی شاگردی اور ذلیل قسم کی نقالی کا کردار ادا کر رہی ہیں' ——
غالباً ترکوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں :-

کر سکتے تھے جو اپنے زمانہ کی امامت
وہ کہنہ دماغ اپنے زمانہ کے ہیں پیرو[2]

"جاوید نامہ" میں پرنس سعید حلیم پاشا کی زبان سے ترکی میں کمالی اصلاح و انقلاب کی سطحیت، اس کے کھوکھلے پن اور اس کے داعی و زعیم (کمال اتاترک) کی فکری کہنگی اور یورپ کی بے روح نقالی کی مذمت کھلے طریقہ پر کی ہے۔

مصطفےٰ کو از تجدد می سرود　　گفت نقشِ کہنہ را باید زدود
نو نگردد کعبہ را رختِ حیات　　گر ز افرنگ آیدش لات و منات
ترک را آہنگِ نو در چنگ نیست　　تازہ اش جز کہنۂ افرنگ نیست
سینۂ او را دمے دیگر نبود　　در ضمیرش عالمے دیگر نبود
لاجرم با عالمِ موجود ساخت　　مثلِ موم از سوزِ ایں عالم گداخت[3]

تہذیبِ اسلامی اور اس کی حیات انگیزی پر یقین

وہ اسلامی تہذیب اور اسلامی شریعت کی لازوال قوت اور ایک نئی دنیا اور

---

[1] ضربِ کلیم صـ۱۷۰　[2] بالِ جبریل　[3] صـ۱۴۲

نئے معاشرہ کی تشکیل و تعمیر میں ان کے عظیم امکانات پر پورا یقین رکھتے ہیں، انھوں نے اپنے خطبۂ صدارت میں جو ۱۹۳۲ء میں آل مسلم پارٹیز کانفرنس میں دیا تھا، مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:۔

"جس دین کے تم علمبردار ہو وہ فرد کی قدر و قیمت کو تسلیم کرتا ہے اور اس کی اس طرح تربیت کرتا ہے کہ وہ اپنا سب کچھ خدا اور بندوں میں صرف کردے، اس دین قیم کے مضمرات ابھی ختم نہیں ہوئے، یہ دین اب بھی ایک نئی دنیا پیدا کر سکتا ہے، جس میں غریب امیروں سے ٹیکس وصول کریں، جس میں انسانی سوسائٹی معدوں کی مساوات پر نہیں بلکہ روحوں کی مساوات پر قائم ہو۔"

جدید اسلامی تجربہ گاہ

ان کو پورے اخلاص کے ساتھ اس کا یقین اور احساس تھا کہ ایک ایسا خود مختار خطہ مسلمانوں کے لئے بیحد ضروری ہے، جہاں اسلامی زندگی کا "عمل" اپنے سارے شعبوں اور پہلوؤں کے ساتھ جاری رہ سکے اور شریعتِ اسلامی اور زندگی کا اسلامی طریقہ اپنی خداداد صلاحیتوں اور جوہر کا آزادی کے ساتھ اظہار کر سکیں اور چونکہ ہندوستان ہی (جیسا کہ انھوں نے ۱۹۳۰ء میں مسلم لیگ کے اجلاس کے خطبۂ صدارت میں کہا تھا) ایک ایسا ملک ہے جہاں سب سے بڑا اسلامی مجموعہ آباد ہے اس لئے وہ اس تجربہ کے لئے سب سے زیادہ موزوں جگہ ہے اور یہاں وہ اسلامی مرکز (زیادہ گہرے الفاظ میں وہ لیبورٹری) قائم ہو سکتا ہے جہاں صالح سوسائٹی کی تشکیل، اجتماعی زندگی کی تنظیم، اقتصادی مسائل کا حل اور تہذیب کی صحیح و پاکیزہ رہنمائی، عقیدہ اور عمل، مادیت اور روحانیت اور فرد و جماعت کی

ایک ایسی ہم آہنگی پیدا ہو سکے جو لوگوں کو تعجب اعتراف پر مجبور کرے اور اسلامی ممالک کے رہنماؤں کو اس کی تقلید اور دنیا کے مفکرین کو نئے طرز پر سوچنے پر آمادہ کر سکے۔

یہ سیاسی بالغ نظری اور بلند ہمتی جس کی نظیر اس دور میں عالم اسلام میں مشکل سے ملے گی مملکتِ پاکستان کی بنیاد تھی ۱۹۴۷ء میں یہ خواب پورا ہوا اور پاکستان وجود میں آیا، پاکستان کے اوّلین معماروں نے بھی اس فکری بنیاد کو تسلیم کیا جس پر اس عظیم ترین اسلامی ریاست کی تعمیر ہوئی تھی، اور اس کو اسلامی طریقِ زندگی کا ایک معمل یا تجربہ گاہ قرار دیا۔

مسٹر محمد علی جناح نے اپنی ایک تقریر میں جو انھوں نے ۱۱ر اکتوبر ۱۹۴۷ء کو پاکستان کے بری، بحری اور فضائی فوج کے افسران اور سول حکام کے سامنے کی تھی کہا:۔

"پاکستان کا قیام جس کے لئے ہم دس سال سے کوشاں تھے بفضلہ تعالیٰ اب ایک زندہ حقیقت ہے لیکن خود اپنی مملکت کا قیام ہمارے مقصد کا صرف ایک ذریعہ تھا، اصل مقصد نہیں تھا، منشا یہ تھا کہ ایسی مملکت قائم ہو جس میں ہم آزاد انسانوں کی طرح رہیں، جس کو ہم اپنے مزاج اور ثقافت کے مطابق ترقی دیں اور جس میں اسلامی عدلِ اجتماعی کے اصول آزادی کے ساتھ برتے جائیں۔"[1]

لیاقت علی خاں مرحوم نے ۱۴ر جنوری ۱۹۴۸ء کو پشاور کے ایک اجتماع میں کہا:۔

"پاکستان ہمارے لئے ایک تجربہ گاہ ہے اور ہم دنیا کو دکھلائیں گے کہ تیرہ سو برس پرانے اسلامی اصول کس قدر کار آمد ہیں!"

ایک دوسرے موقعہ پر ۱۹۵۱ء میں انھوں نے ایک تقریر میں کہا:۔

"ہم نے پاکستان کا مطالبہ اس بناء پر کیا تھا کہ مسلمان اپنی زندگی اسلامی احکام کے

---

[1] SPEECHES QUAID-I-AZAM MOHAMMAD ALI JINNAH - P. 22

قالب میں ڈھالیں، ہم نے ایک ایسے عمل کے قیام کا مطالبہ کیا تھا، جہاں ایک ایسی حکومت بنائی جا سکے جو اسلامی اصولوں پر مبنی ہو جن سے بہتر اصول دنیا پیدا نہیں کر سکی!![1]

لیکن یہ تجربہ جو اپنی اہمیت، نزاکت اور اپنے دور رس نتائج کے اعتبار سے تاریخ کا ایک اہم ترین اور عہد آفریں (EPOCH-MAKING) واقعہ تھا، ان ہی رہنماؤں کے ہاتھوں کامیاب ہو سکتا تھا، جو اسلامی شریعت کی ابدیت اور اسلامی تہذیب کی برتری پر غیر متزلزل ایمان رکھتے ہوں، جن کا خلوص اور صداقت خود غرضی، مفاد پرستی اور مصلحت کوشی سے پاک اور ہر شبہہ سے بالاتر ہو، ان کا ذہن مغربی اقدار و افکار کی غلامی اور ان کی سیرت غیر اسلامی تعلیم و تربیت کے اثرات سے بالکلیہ آزاد ہو چکی ہو اور ایمان راسخ اور اخلاقی جرأت کے ساتھ وہ جدید علوم کے پیدا کردہ وسائل اور قوتوں کو اپنے اعلیٰ دینی و اخلاقی مقاصد کے لئے استعمال کرنے کی قدرت اور آزاد و جدید اسلامی معاشرہ کے ماحول کے مطابق ان کو ڈھالنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔

نازک امتحان

لیکن اس تجربہ کو کامیاب بنانے اور تاریخ کے اس نادر و زریں موقعہ سے فائدہ اٹھانے کے لئے (جو صدیوں کی مدت میں کسی قوم کو مل سکتا ہے اور مخصوص سیاسی و بین الاقوامی حالات کی بنا پر ہندوستان کی ملت اسلامیہ کو حاصل ہوا تھا) جن وسیع صلاحیتوں اور خصوصیتوں کے اشخاص درکار تھے، ان کے انتخاب پر مناسب توجہ نہیں کی گئی اور ان کی تربیت اور تیاری کے لئے مناسب اور ضروری وقت نہ مل سکا اور نہ اس کو ضروری سمجھا گیا،

---

[1] نوائے وقت ۸ جنوری ۱۹۵۰ء

مشرقی اسلامی ممالک میں جو مغربی نظام تعلیم عرصے سے رائج تھا، اور مغربی تعلیمی مرکز جہاں ان لوگوں نے تعلیم حاصل کی تھی (جن کی تقدیر میں اس نئی اسلامی ریاست کی تشکیل اور رہنمائی کا نازک کام آیا تھا) اس سے بہتر نمونہ پیش کرنے سے قاصر تھے، جو ہمیں پاکستان کی موجودہ شکل میں نظر آتا ہے، وہ اس طرزِ فکر اور طرزِ حیات کے سوا دنیا کو کچھ اور نہیں دے سکتے تھے، اور جس طرح درخت کو اس کے قدرتی پھل پر ملامت نہیں کی جا سکتی، اس نظامِ تعلیم، اس کے مغربی رہنماؤں اور اس ذہنی ماحول سے شکایت بیجا ہے کہ اس نے اس نوزائیدہ اسلامی ریاست کے لئے ایسے رہنما اور سربراہ مہیا نہیں کئے جن کو دین کی ابدیت و کاملیت اور اس کی لافانی صلاحیت پر غیر متزلزل یقین ہو اور اس کی توسیع و تبلیغ کے لئے ان کے اندر قرون اولیٰ کا سا جوش پایا جاتا ہو، جو مغرب کے افکار و اقدار کے سامنے سپر ڈالنے کے بجائے اور اپنے ملک کے قانون و نظام کو ان کے سانچہ میں ڈھالنے کے بجائے مغربی تہذیب کے صالح اجزاء اور وسائل و علوم جدیدہ کے آہن کو اپنے یقین کی گرمی سے پگھلا کر اپنی تہذیب کے سانچہ میں ڈھالیں اور اپنی ضرورت اور اپنے ڈھب کے سانچے تیار کریں۔

افسوس ہے کہ ایجابی اور مثبت طور پر قیام پاکستان کی معتد بہ مدت میں بھی نظامِ تعلیم کو (جو کسی ملک کو کسی خاص رخ پر لے چلنے کے لئے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے) اسلامی روح اور اسلامی مقاصد کے لئے از سرِ نو ترتیب دینے، پاکستانی معاشرہ کو اسلامی سانچہ میں ڈھالنے، آئین کو اسلامی بنانے، ذہنی انتشار اور اخلاقی فساد کے معلوم و معروف ناکوں اور سرچشموں کو بند کرنے کے لئے کوئی جرأت مندانہ قدم نہیں اٹھایا گیا، اور کسی طرح اس کا ثبوت دینے کی مخلصانہ و سنجیدہ کوشش نہیں کی گئی کہ پاکستان ایک نیا اسلامی عمل

اور تجربہ گاہ ہے، جہاں اسلامی طریق زندگی کی افادیت، اسلامی اصول وقوانین کی صلاحیت اور اسلامی تہذیب کی فوقیت کا عملی ثبوت فراہم کیا جائے گا، اور دوسرے ابھرتے ہوئے ممالک کے لئے عملی مثال پیش کی جائے گی، اس کے برخلاف عائلی قانون (MUSLIM-FAMILY LAWS) ۱۹۶۱ء نے یہ ثابت کر دیا کہ پاکستان کے آئین ساز اور سربراہ مغربی افکار و اقدار سے نہ صرف پوری طرح متاثر ہیں بلکہ ان کو آئین سازی کے لئے فیصلہ کن بنیاد سمجھتے ہیں، اور شریعت کی کاملیت اور ابدیت پر ان کو یقین نہیں۔

بالآخر نومبر ۱۹۶۳ء میں قومی اسمبلی نے اپنے ڈھاکہ کے اجلاس میں اس عائلی قانون کو منظور اور ان تمام ترمیمات کو جو اس بنیاد پر تھیں کہ یہ قانون قرآن وسنت کے نصوص و تصریحات اور اجماع و تعامل کے خلاف ہے مسترد کر دیا اور لوگوں نے تعجب کے ساتھ پاکستان اور ہندوستان کے اخبارات میں یہ خبر پڑھی :-

"یہاں قومی اسمبلی نے کل بڑی اکثریت سے "عائلی قانون" میں ترمیم کی کوشش کو رد کر دیا، اس کی بعض دفعات میں ترمیم کا بل ایوان کے سامنے آیا تھا، مارشل لاء کے زمانہ میں نافذ شدہ یہ عائلی قانون مردوں کے ایک سے زیادہ شادی کرنے کے آزادانہ اختیار کو منسوخ کر چکا ہے، ترمیم کے موافقوں نے اس بات کا دعویٰ کیا تھا کہ یہ قانون شریعت اور قرآن شریف کے خلاف ہے جس میں تعدد ازدواج کی کھلی اجازت دی گئی ہے، پاکستان کے روشن خیال طبقہ کا کہنا ہے کہ یہ اجازت وقتی اور ہنگامی تھی اور اس کا مقصد سماج میں تدریجی اصلاح کرنا تھا۔"

اسلام کے منصوص[1] و اجماعی[2] مسائل کے بارہ میں جب پاکستان کا یہ رویہ ہے تو

---

[1] جن کے لئے قرآن مجید میں نص صریح موجود ہے، مثلاً قانون میراث، مرد کے لئے طلاق دینے کی آزادی، تعدد ازدواج وغیرہ۔ [2] جن پر ساری امت کا اتفاق ہے۔

تہذیب و معاشرت، تعلیم و تربیت، سیاست و آئین کے بارہ میں بلند توقعات قائم نہیں کی جاسکتیں، درحقیقت اکثر نئے آزاد یا قائم ہونے والے اسلامی ممالک ترکی کے نقشِ قدم پر سرگرم سفر یا آمادۂ سفر ہیں، اور ان کے سربراہوں میں (ان کی مغربی تعلیم و تربیت کے اثر سے) کمال اتاترک کی تقلید کا کم وبیش شوق پایا جاتا ہے۔

پاکستان میں تجدد، مغربی افکار و اقدار کو اصل معیار مان کر جدید "اصلاحات" اور قوانین، ریڈیو، ٹیلیویژن، صحافت اور ادبیات کے ذریعہ ذہنی اور اخلاقی سانچہ کو تبدیل کرنے اور ایک ایسی نئی نسل کی تیاری کا کام اب زیادہ عزم اور منصوبہ بندی کے ساتھ شروع ہوگیا ہے، جو مغربی تہذیب اور لامذہبی طرزِ حکومت کو آسانی کے ساتھ قبول کرسکے، مدارس اور مساجد کو حکومت کے زیرِ انتظام لینے کے بعد، علمائے دین اور مسلم عوام کی مخالفت، شورش اور کم سے کم عدم تعاون کا وہ خطرہ بھی باقی نہیں رہتا، جو ان منصوبوں کی کامیابی میں مخل ہوسکتا ہے، ایک حقیقت بیں انسان جس کے سامنے تجدد پسند ممالک کی پچھلی تاریخ ہے، آسانی کے ساتھ پیش بینی کرسکتا ہے کہ اس ملک کے سربراہوں کے ارادے کیا ہیں، اور یہ ملک (خواہ تدریجی اور خاموش طریقہ پر) کس منزل کی طرف گامزن ہے۔

بہرحال پاکستان کا اپنے بنیادی مقاصد سے انحراف اور عصرِ حاضر کی دوسری لامذہبی (SECULAR) اور تجدد پسند (MODERNIST) حکومتوں کی تقلید تاریخِ جدید کا ایک عظیم سانحہ ہوگا اور ان کروڑوں افراد کے ساتھ بیوفائی جنھوں نے اس اسلامی معمل اور تجربہ گاہ کے قیام کے لئے شدید ترین تکالیف برداشت کیں اور عظیم قربانی پیش کی، اس سے بڑھ کر اس کا نقصان یہ ہوگا کہ یہ طرزِ عمل ہمیشہ کے لئے اس امنگ اور آرزو کو سرد کردے گا اور اس تجربہ کی کامیابی کے امکان کو اگر ختم نہیں تو نہایت بعید بنادے گا،

اور بے لاگ تاریخ اور انسانی تجربہ اس کی اجازت کبھی نہیں دے گا کہ پھر اس کا نام لیا جائے پاکستان کی اس نازک اخلاقی ذمہ داری کو پروفیسر اسمتھ (WILFRED CANTWELL SMITH) نے بڑے اچھے انداز سے بیان کیا ہے، وہ اپنی کتاب "ISLAM IN MODERN HISTORY" میں لکھتے ہیں:۔

"شاید پاکستانی کسی وقت یہ خیال کریں کہ اسلامی معاشرہ کی تعمیر کا کام ان کے ابتدائی اندازہ سے کہیں زیادہ دشوار طلب ہے لیکن سوچا جائے تو اب ان کے لئے کوئی راہِ مفر باقی نہیں، ان کے وعدے اور دعوے اتنے بلند بانگ اور واضح تھے کہ ان کی تکمیل سے گریز ناممکن ہو گیا ہے، ان کی تاریخ اب "تاریخ اسلام" ہو گی، ان کے کندھوں پر بہت بڑی ذمہ داری آن پڑی ہے، اب خواہ وہ اسے پسند کریں یا اس پر نادم ہوں، بہر حال وہ "اسلامی ریاست" کے تصور کو نظر انداز نہیں کر سکتے اور نہ اسے زیادہ دیر سردخانہ ہی کی نذر کر سکتے ہیں، کیونکہ اس وقت اسلامی ریاست کے نظریہ کو ختم کرنے کا فیصلہ محض طریقِ کار کی تبدیلی کا فیصلہ ہی نہیں ہو گا، یہ تو گویا اپنے دین اور وطن کی اساس پر کلہاڑا چلانے کے مرادف ہو گا اور تمام دنیا اس گریز سے یہی مطلب اخذ کرے گی کہ اسلامی ریاست کا نظریہ لایعنی اور اس کا نعرہ محض فریبِ نظر تھا، جو حیاتِ جدید کے تقاضوں سے نپٹنے کی صلاحیت نہیں رکھتا یا یہ کہ پاکستانی بحیثیت ایک قوم کے اسے اپنی قومی زندگی پر نافذ کرنے میں ناکام رہے ہیں، اس صورت میں دنیا کے نزدیک خود مسلمانوں کے معتقداتِ ایمانی ہی مشکوک اور قابلِ تنقید ٹھہریں گے۔"[1]

---

[1] ISLAM IN MODERN HISTORY, P.2 (ترجمہ۔ ماخوذ از "چراغ راہ" نظریہ پاکستان نمبر)

دینی رہنمائی کا نازک کام

اس افسوسناک صورتِ حال پر جو اس وقت پاکستان میں درپیش ہے بہت کچھ قابو پایا جا سکتا تھا یا کم سے کم اس کے اثر کو ہلکا کیا جا سکتا تھا، اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ اور حکومتی حلقہ میں اسلامی فکر اور دعوتِ اسلامی کو زیادہ بڑی تعداد میں مؤید و حامی مل سکتے تھے، نیز قدیم و جدید طبقہ کے درمیان جو وسیع خلیج پڑ گئی ہے اس کو بہت مختصر کیا جا سکتا تھا، اور دونوں طبقے مل کر اس عظیم تجربہ کو کامیاب بنا سکتے تھے جس کے لئے پاکستان وجود میں آیا تھا، اگر فکرِ اسلامی کے علمبردار اپنی زیادہ صلاحیت اور ہوش مندی کا ثبوت دیتے اور ملک کے مختلف طبقوں کا زیادہ سے زیادہ اعتماد حاصل کرنے اور اس ذہنی اور روحانی خلا کو پر کرنے میں کامیاب ہو جاتے جس کو جدید طبقہ عرصہ سے شدت کے ساتھ محسوس کر رہا ہے یہ اسی وقت ہو سکتا تھا جب فکرِ اسلامی کے علمبردار اور داعی کچھ عرصہ پورے صبر و استقلال کے ساتھ اپنی تمام صلاحیتیں اور قوتیں اسلامی طریقۂ زندگی کو قبول کرنے کے لئے دماغوں اور دلوں کو تیار کرنے اور نوجوانوں کی ذہنی و روحانی تسکین کے کام پر مرکوز کر دیتے اور تمام میدانوں سے یکسو ہو کر اسی کو اپنی جدوجہد کا میدان بنا لیتے، اسی کے ساتھ پاکستان کو ایک ایسی دینی قیادت میسر آتی جس میں شخصیت کی دل آویزی اور سحر انگیزی کے ساتھ کھلا ہوا علمی تفوق، ممتاز دماغی صلاحیت، قلب کا گداز اور حرارت، پر اثر اور گہری روحانیت، بے غرضی اور بے ہمہ اور باہمہ ہونے کی صفت اور ایسا اخلاص جمع ہوتا جو ہر شک و شبہہ اور تمام سیاسی اختلافات سے بالاتر نظر آتا، غرض پاکستان کو وہ میرِ کارواں نصیب ہو جاتا جس کی تعریف اقبالؔ نے ان الفاظ میں کی ہے۔

نگاہ بلند، سخن دلنواز، جاں پرسوز ، یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لئے[1]

پاکستان کی جماعت اسلامی

جماعت اسلامی جس نے پاکستان میں اسلامی نظام اور اسلامی قانون کے نفاذ کا پرزور مطالبہ کیا تھا، بہت کچھ اس توقع کو پورا کرسکتی تھی اور اس خلا کو پر کرنے کے لئے سب سے زیادہ اس پر نظر پڑتی تھی اس کے بانی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ[2] میں متعدد ایسی صفات جمع تھیں جو ان کو ذہنی قیادت کے منصب بلند پر پہونچا سکتی تھیں ان کو قدرت کی طرف سے ایک سلجھا ہوا دماغ، پرزور قلم اور ایک طاقتور اسلوب ملا تھا، وہ مغرب کے جدید مکاتب فکر اور فلسفوں سے واقف تھے، دوسری طرف ان کو اسلام کی تعلیمات اور ان کی زندگی کی صلاحیت پر عقیدہ تھا مغربی تہذیب و افکار کی تنقید[3] اور اسلامی تعلیمات کی تشریح و ترجمانی میں ان کی

---

[1] اوپر کی تحریر ۱۹۷۰ء کے آخر کی ہے جب پاکستان میں جنرل محمد ایوب خاں کا دور حکومت و قیادت تھا، اس کے بعد اس اہم اسلامی مملکت میں اہم اور فیصلہ کن تبدیلیاں وقوع میں آئیں جمہوریت کے شدید مطالبہ کے نتیجہ میں ایوب خاں کو ہٹنا پڑا، پاکستان دو حصوں میں تقسیم ہو گیا، مشرقی پاکستان بنگلہ دیش کے نام سے موسوم ہوا، اور مجیب الرحمٰن اس کے سربراہ مقرر ہوئے، ذوالفقار علی بھٹو کے دور حکومت میں مظالم اور بدعنوانیوں کا سلسلہ شروع ہوا، انتخابات کرائے گئے، اور انتخابات میں سنگین بدعنوانیوں کے الزامات کے بعد متحدہ قومی محاذ نے ایک نئی تحریک شروع کی، عوام نے عظیم قربانیاں دیں، بالآخر جنرل محمد ضیاء الحق نے ذوالفقار علی بھٹو کو ہٹا کر زمام اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لی اور پاکستان کا ایک نیا دور شروع ہوا، اسلامی قوانین کا نفاذ ہوا، عدلیہ کو مکمل آزادی دی گئی، اور معاشرہ اور حکومت میں متعدد خوش آئند تبدیلیاں عمل میں آئیں جن کا سلسلہ جاری ہے اور جن سے اسلام کے بہی خواہوں کو بڑی امیدیں ہیں۔ [2] افسوس ہے کہ ۲۲ ستمبر ۱۹۷۹ء کو مولانا نے اس عالم فانی سے رحلت کی رحمہ اللہ و غفر لہ۔ [3] مغربی تہذیب اور اس کی اساس پر عالمانہ تنقید میں اس نصف صدی میں جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں ان کے مجموعہ مضامین "تنقیحات" کو اولین مقام حاصل ہے۔

تحریریں اعتماد اور ظرافت سے پُر ہوتی تھیں اور اس معذرت آمیز اور مدافعانہ لہجہ اور طرز سے پاک جو اس دور سے پہلے کے مسلمان اہلِ قلم اور مصنفین کا شعار بن گیا تھا، انھوں نے اپنے ابتدائی دور میں اسلامی مسائل اور متکلمانہ و سیاسی مباحث پر جو پُرزور مضامین و رسائل لکھے انھوں نے ہندوستان کے اسلام پسند حلقہ میں بڑی مقبولیت حاصل کی اور ان سب لوگوں کو ان کی ذات کی طرف متوجہ کر دیا جو اسلام کے اقتدار اور غلبہ کے خواہشمند اور موجودہ صورتِ حال سے بے چین تھے، اس تأثر کے نتیجہ میں جماعتِ اسلامی کا وجود عمل میں آیا اور جن جن لوگوں کو ان کے قلم و فکر نے متأثر کیا تھا، وہ جمع ہو گئے، پاکستان بننے کے بعد قدرتی طور پر جماعت کی قیادت وہاں منتقل ہو گئی جو اسلامی فکر کی اشاعت و نفاذ کے لئے زیادہ موزوں میدان تھا لیکن کچھ تو ہندوستان و پاکستان کے ایک بڑے دینی حلقہ کو بعض فقہی و کلامی مسائل میں مولانا کی تحقیق، تعبیر یا طرزِ تحریر سے اختلاف ہونے کی بنا پر اور کچھ جماعت کی آخر میں عملی سیاست و انتخابات میں حصہ لینے کی وجہ سے اور کچھ اس کے خلاف ان تمام عناصر کے متحد ہو جانے کے سبب سے جن کو اس کے اسلامی نظام اور اسلامی دستور کے نعرہ میں اپنا مفاد اور اپنا سیاسی مستقبل خطرہ میں نظر آتا تھا جماعت کو شدید بیرونی مخالفتوں اور بعض مرتبہ اندرونی انتشار کا سامنا کرنا پڑا، اور بعض اوقات جماعت کے صفِ اول کے ذمہ داروں میں اختلاف پیدا ہوا اور ان میں سے متعدد ایسے اشخاص نے جو جماعت کے معماروں اور اس کے فکری رہنماؤں میں شمار کئے جاتے تھے اس سے کنارہ کشی اختیار کر لی، دوسری طرف حکومت نے اس کی راہ میں ایسی رکاوٹیں پیدا کر دیں کہ جن سے اس کو اپنی دعوت کی توسیع میں سخت دشواریاں پیش آئیں۔

جماعت کو اپنی ان سیاسی سرگرمیوں اور تنظیمی کاموں کی وجہ سے بھی اس علمی و تحقیقی

کام کو جاری رکھنے کا پوری یکسوئی کے ساتھ موقع نہیں مل سکا جو اصلاً اس کی شہرت و مقبولیت کا باعث تھا، بہت سے جدید مسائل اور بہت سے ایسے جدید فلسفے اور نظام ہیں جن پر جدید بلند پایہ و محققانہ تصنیفات کی شدت سے ضرورت محسوس کی جارہی ہے، جن کے لئے نوجوان طبقہ میں سخت تشنگی پائی جاتی ہے لیکن پاکستان کے موجودہ حالات اور جماعت کی سرگرمیاں اس کی مہلت نہیں دیتیں کہ ان موضوعات پر کوئی نئی اور بڑی پیش کش ہو۔

بہرحال اسباب کچھ ہوں واقعہ یہ ہے کہ جماعت اسلامی پاکستان کی راہ میں ایک خالص دینی داعی کا کردار ادا کرنے کے لئے بہت سی رکاوٹیں پیدا ہوگئیں، اس کے لئے اب اپنی بے لوث دینی دعوت پیش کرنے اور بے غرض دینی خدمت انجام دینے اور الحاد، لادینیت، نفس پرستی اور اغراض پرستی کے خلاف ایک مؤثر و متحدہ محاذ قائم کرنے میں بڑی مشکلات درپیش ہیں، ان مشکلات سے نکلنے کے لئے اور ایک دینی داعی و مصلح کا مقام حاصل کرنے کے لئے اس کو بڑے عزم، جرأت، قربانی اور بڑے انقلابی اقدام کی ضرورت ہوگی۔ ولعل اللہ یحدث بعد ذلک امرا۔

عالم اسلام میں مصر کے کردار کی اہمیت

انیسویں صدی کے اوائل میں (جب محمد علی پاشا نے مصر سے فرانسیسیوں کو نکال کر اپنی حکومت قائم کی) مصر تیسرا مرکزی میدان تھا، جہاں مشرق و مغرب کی فکری، ثقافتی تہذیبی اور اجتماعی کشمکش بڑے پیمانہ پر سامنے آئی، فرانسیسی حملہ اور اقتدار نے (جو اپنی مدت کے اعتبار سے مختصر[1] اور اپنے اثرات و نتائج کے اعتبار سے بہت طویل کہا جا سکتا ہے) مصر کی سرزمین اور عربی اسلامی ذہن میں اچھی طرح تخم ریزی کی، مصر میں مشرق و مغرب کی ٹکر براہ راست ہوئی، طلباء و فضلاء کی وہ جماعتیں جن کو مصر کی خدیوی حکومت علوم جدیدہ کی تحصیل اور علم و مطالعہ کی توسیع کے لئے مغربی ممالک بالخصوص فرانس بھیجتی رہی تھی، انھوں نے سرعت کے ساتھ مصر کی طرف مغربی افکار و اقدار کو منتقل کیا، اسمٰعیل پاشا کے عہد میں نہر سوئز تیار ہوئی جس نے بحر احمر کو بحر روم سے ملا دیا اور سیاست اور بین الاقوامی تجارت کے میدان میں ایک انقلاب برپا کر دیا، اس کی وجہ سے مغرب و مشرق کی پرانی خلیج کم ہوگئی اور میل جول اور تہذیبی تبادلہ کی ایک نئی راہ کھل گئی۔

مصر اپنی متعدد خصوصیات کی بنا پر جن میں کوئی اس کا شریک و سہیم نہ تھا، اس کی صلاحیت

---

[1] جولائی ۱۷۹۸ء سے ستمبر ۱۸۰۱ء تک تین سال ۲ مہینے کی مدت۔

رکھتا تھا کہ وہ ایک ایسا میدان بنتا جس میں ایک طرف وہ سائنٹفک علوم اور جدید وسائل ہوتے جو یورپ نے اپنی طویل و مسلسل جد و جہد سے حاصل کئے ہیں اور دوسری طرف علم و یقین اور کامیاب و پاکیزہ زندگی کی وہ صالح بنیادیں (جو اسلامی مشرق کا قیمتی سرمایہ ہیں) اور وہ نیک خواہشات اور محرکات ہوتے جو صرف مضبوط عقیدہ اور ایمان و محبت سے لبریز دل میں پیدا ہو سکتے ہیں، مصر کو اس دولت کا وافر حصہ ملا تھا، اور وہ عربی زبان و ادب اور دینی علوم میں اپنی خاص اہمیت نشر و اشاعت کے وسائل کی فراوانی ازہر جیسے ادارہ کی موجودگی (جو عالم اسلام کا سب سے بڑا دینی و ثقافتی مرکز ہے) اور اپنے ذہن کی فطری لچک اور ثقافتی لین دین میں اپنی قدیم مہارت اور قابلیت کی وجہ سے اس دولت کی تقسیم اور اس میں اضافہ و توسیع کی بڑی صلاحیت رکھتا تھا، وہ عالم اسلام اور مشرقی ممالک و مغرب کے درمیان آزادانہ شریفانہ خود دارانہ اور مساویانہ طور پر افادہ و استفادہ اور داد و ستد (EXCHANGE) کی کامیاب اور پاکیزہ مثال قائم کر سکتا تھا، یہ ایک ایسا تبادلہ ہوتا جس میں نہ کسی کا نقصان ہوتا، اور نہ ناپ تول میں کوئی کمی ہوتی۔

ایک نئی نہر سوئز کی ضرورت

مصر ایک ایسی نہر بنا سکتا تھا، جو اقوام عالم کے لئے نہر سوئز سے کہیں زیادہ مفید اور انسانیت کے مستقبل اور دنیا کی تاریخ کے لئے اس سے ہزار درجہ موثر ثابت ہو سکتی تھی یہ مشرق و مغرب کے درمیان صحیح مساویانہ اور متوازن تعارف و تبادلہ کی وہ نہر (CHANNEL) تھی جو طبعی و صنعتی علوم میں پسماندہ مشرق کو ترقی یافتہ مغرب سے، سرگشتہ و حیران مغرب کو (جو اخلاق و روحانیت میں تہی دامن اور مایوسی و بدگمانی اور خودکشی کی راہ پر گامزن ہے) اس مشرق سے

ہمکنار کرتی جس کو آسمانی مذاہب اور خدا کے آخری پیغام اسلام نے قلبی سکون، داخلی اطمینان روحانی مسرت اور باہمی اعتماد کی دولت سے مالا مال کر رکھا ہے، وہ ان زبردست، محیر العقول اور کثیر التعداد وسائل کو جو مقصد سے نا آشنا ہیں، مشرق کے ان نیک اور صالح مقاصد سے آشنا کرتی جو وسائل سے محروم ہیں، اس مغرب کو جو کر سکتا ہے، لیکن کرنے کا جذبہ نہیں رکھتا، اس مشرق سے بغل گیر کرتی جو کرنا چاہتا ہے لیکن کر نہیں سکتا، دونوں میں سے جس کے پاس جو چیز ہوتی وہ دوسرے کو عطا کرتا اور انسانیت کی ترقی و خوش حالی میں دو حقیقی بھائیوں کی طرح دونوں مل جل کر حصہ لیتے، یہ عقلی اور ثقافتی نہر اگر وجود میں آجاتی تو دنیا کے لئے ایک نئے دور کا آغاز اور ایک ایسا تاریخی کارنامہ ہوتا جس کو جدید تاریخ میں سب سے اولیں اور نمایاں جگہ ملتی اور مصر کو اس کی بدولت عالمگیر قیادت کا منصب رفیع حاصل ہوتا۔

لیکن یہ اسی وقت ہو سکتا تھا جب کہ مصر مغربی تہذیب اور غیر ملکی ثقافت کی آمد کے وقت ہی سے اپنی دینی دعوت اور اس کے راستہ میں قربانی کا حوصلہ رکھتا، علوم عصریہ کو صحیح طور سے ہضم کرتا، ان کو مزید تقویت کا باعث بناتا اور اس اہم کردار کے لئے ان کو کام میں لاتا جس کی سہولتیں اور ذرائع اس کو دوسروں سے زیادہ حاصل تھے۔

مصر کا کمزور تقلیدی پہلو

لیکن مختلف سیاسی اور تعلیمی اسباب اور حالات نے مصر کو قیادت و رہنمائی اور مغرب کو متاثر کرنے کے اہم کردار سے غافل کر دیا اور اس کو مغرب کے ایک شاگرد اور تقلید یا خوشہ چیں کی پوزیشن میں لا کھڑا کیا، اس نے اس نہر کے ثقافتی عمل کو صرف "درآمد" (IMPORT)

تک محدود کر دیا جس کی وجہ سے مصر کی انفرادی شخصیت اجاگر نہ ہو سکی۔

ان اسباب و محرکات میں سب سے اہم سبب جس نے مصر کو اس کمزور رخ پر ڈالا اور جس نے نہ صرف مصر، بلکہ پوری عربی دنیا کو ناقابلِ تلافی نقصان پہونچایا، وہ افسوسناک سیاسی صورتِ حال تھی، جو انیسویں صدی میں مصر میں نظر آتی ہے، اور جس میں اس کے ساتھ پورا عالمِ اسلام شریک ہے، یہ غیر ملکی سامراج اور برطانوی اقتدار تھا جو بالواسطہ یا بلا واسطہ دونوں شکلوں میں ہر جگہ قائم تھا، اس غیر فطری صورت حال نے عالمِ اسلام کے اہلِ فکر اور قائدین کو اس کا موقعہ ہی نہ دیا کہ وہ دوسرے مسائل کی طرف خاطر خواہ توجہ کر سکیں، ان کی ساری قوتیں اور صلاحیتیں اسی ایک نقطہ پر مرکوز ہو گئیں اور اس نے ان کے سوچنے کے لئے کوئی میدان باقی نہ چھوڑا۔

سیّد جمال الدین افغانی

جمال الدین افغانی[1] عالمِ اسلام میں ایک ممتاز ذہن و دماغ اور طاقتور شخصیت کے مالک تھے، انھوں نے مغرب کو مطالعہ و سیاحت کے ذریعہ خوب پہچانا، لیکن ان کی شخصیت پر عظیم شہرت و مقبولیت کے باوجود کچھ ایسا پردہ پڑا ہوا ہے کہ ان کی شخصیت بھی بعض حیثیتوں سے معمہ بن گئی ہے اور ان کی طرف متضاد رجحانات اور اقوال منسوب کئے جانے لگے ہیں، ان کی گفتگو، خطبات اور تحریروں کا جتنا حصہ محفوظ ہے، اور ان کے شاگرد و عقیدت مند ان کے حالات و اخلاق اور علم کے متعلق جو واقعات بیان کرتے ہیں، ان سے وضاحت کے ساتھ ان کے قلبی واردات اور حقیقی خیالات کا اور ان کی ذاتی زندگی کا حال نہیں معلوم ہوتا اور

---

[1] سید جمال الدین افغانی کے حالات کے لئے ملاحظہ ہو زعماء الاصلاح فی العصر الحدیث" مؤلفہ ڈاکٹر احمد امین۔

نہ اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ مغربی تہذیب اور اس کے افکار و اقدار کے بارے میں ان کی ذاتی رائے اور تاثر کیا تھا[1] مغربی تہذیب اور اس کے مادّی فلسفوں کا مقابلہ کرنے ان پر تنقید کرنے اور مشرق کو مغرب کے فکری اقتدار و اثر سے محفوظ رکھنے کی ان میں کتنی صلاحیت تھی، اس کے متعلق یقینی طور پر کچھ کہنا مشکل ہے، ان کی مختصر کتاب "الرّد علی الدھریین" سے اس کا اندازہ کرنا دشوار ہے لیکن علامہ اقبال کا ان کے متعلق بہت بلند خیال تھا، ان کے نزدیک مغربی تہذیب کے ارتقاء نے عالم اسلام میں جو ذہنی انتشار پیدا کر دیا تھا، اس کو دور کرنے اور ایک طرف اسلام کے قدیم اعتقادی، فکری و اخلاقی نظام، دوسری طرف عصر جدید کے نظام کے درمیان جو وسیع خلا پیدا ہو گیا تھا اس کو پر کرنے کے کام کے لئے سید جمال الدین افغانی کی شخصیت بہت مفید اور مؤثر ثابت ہو سکتی تھی، اور ان کا وسیع اور اخّاذ ذہن اس کی فطری صلاحیت رکھتا تھا، علامہ اقبالؒ نے اپنے ایک خطبہ میں غالباً اسی بات کو پیش نظر رکھ کر فرمایا:-

"ہم مسلمانوں کو ایک بہت بڑا کام درپیش ہے، ہمارا فرض ہے ماضی سے اپنا رشتہ منقطع کئے بغیر اسلام پر بحیثیت ایک نظام فکر از سر نو غور کریں، اس عظیم الشان فریضے کی حقیقی اہمیت اور وسعت کا پورا پورا اندازہ تھا تو سید جمال الدین افغانی کو جو اسلام کی حیات ملّی اور حیات ذہنی کی تاریخ

---

[1] پچھلے چند برسوں سے عربی میں ایسے مضامین، خطبات اور کتابوں کا سلسلہ شروع ہوا ہے جنھوں نے سید جمال الدین اور ان کے تلمیذ رشید مفتی محمد عبدہٗ کی شخصیتوں، عقائد و سیاسی مقاصد اور تعلقات کے بارے میں سنگین شکوک و شبہات پیدا کر دیئے ہیں، ان میں ڈاکٹر محمد محمد حسین (صدر شعبۂ عربی اسکندریہ یونیورسٹی) کے لکچر جو انھوں نے کویت میں دیئے اور غازی التوبہ کی کتاب "الفکر الاسلامی المعاصر" کا نام خاص طور پر لیا جا سکتا ہے، شیخ محمد عبدہٗ کے خطوط کا جو عکسی مجموعہ حال میں ایران سے شائع ہوا ہے، ان سے ان شبہات کی تقویت ہوتی ہے۔

میں بڑی گہری بصیرت کے ساتھ ساتھ طرح طرح کے انسانوں اور ان کی عادات و خصائل کا خوب خوب تجربہ رکھتے تھے، ان کا مطمح نظر بڑا وسیع تھا اور اس لئے یہ کوئی مشکل بات نہیں تھی کہ ان کی ذاتِ گرامی ماضی اور مستقبل کے درمیان ایک جیتا جاگتا رشتہ بن جاتی، ان کی اَن تھک کوششیں اگر صرف اسی امر پر مرکوز رہتیں کہ اسلام نے نوعِ انسانی کو جس طرح کے عمل اور ایمان کی تلقین کی ہے اس کی نوعیت کیا ہے تو آج ہم مسلمان اپنے پاؤں پر کہیں زیادہ مضبوطی کے ساتھ کھڑے ہوتے"[1]

لیکن عام طور پر عالم اسلام کے اور خاص طور پر مصر کے حالات نے (جہاں جمال الدین افغانی نے اپنی عمر کا بہترین حصہ صرف کیا اور اس کو اپنی ذہنی و فکری سرگرمیوں کا مرکز بنایا) اور ان کے مخصوص مزاج نے (جس میں ان کی ذہانت، غیر معمولی اسلامی حمیت اور افغانی خودداری اور جوش کو بڑا دخل تھا) عالم اسلام کی سیاسی و تنظیمی ترقی اور اس کی آزادی و خودداری اور وحدت و ہم آہنگی اور غیر ملکی اقتدار اور برطانوی حکومت کے خاتمہ کے سوا کسی اور چیز کی طرف توجہ کی مہلت نہ دی اور ان کی ساری جدوجہد اور سرگرمیوں پر سیاسی رنگ غالب رہا، ان کی نفسیات کی ترجمانی اور ان کی دعوت اور مشن کا خلاصہ ان کے شاگرد رشید شیخ محمد عبدہ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:۔

"جہاں تک ان کے سیاسی مقصد کا تعلق ہے اور جس کی طرف انھوں نے اپنی زمامِ افکار موڑی تھی اور اپنی ساری زندگی اس جدوجہد میں صرف کی تھی اور اس راستہ میں ہر قسم کی مصیبت اور تکلیف برداشت کی تھی، وہ اسلامی حکومت کے ضعف کو دور کرنا اور اس کو بیدار کرنا ہے تاکہ وہ دنیا کی غالب اور طاقتور اقوام کے شانہ بہ شانہ آگے بڑھ سکے اور

---

[1] تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، خطبہ ۶، صفحہ ۲۵-۱۴۶ ا

اس طرح اس دینِ حنیف (اسلام) کو عزت و قوت حاصل ہو سکے مشرقی ممالک سے
برطانیہ کے اقتدار کا خاتمہ اس پروگرام کا اہم جزو تھا۔[1]

مفتی محمد عبدہ

جہاں تک شیخ محمد عبدہ کا تعلق ہے تو اس اعتراف کے ساتھ کہ انھوں نے اسلام کی مدافعت[2]، نظام تعلیم کی اصلاح اور جدید نسل کو دین سے مانوس کرنے کے سلسلہ میں بڑی مفید خدمت انجام دی اس واقعہ کا اظہار ضروری معلوم ہوتا ہے کہ وہ عالم عربی میں تجدد کے ابتدائی علمبرداروں میں تھے، انھوں نے اسلام اور بیسویں صدی کی زندگی اور معاشرہ میں مطابقت پیدا کرنے کی پرزور دعوت دی ان کے خیالات اور تحریروں میں مغربی اقدار سے گہرا تاثر پایا جاتا ہے، اور وہ اسلام کی ایسی ترجمانی کرنا چاہتے ہیں جس سے وہ ان اقدار کے ساتھ میل کھانے لگے اسی طرح سے وہ فقہ اور احکام شریعت کی ایسی تشریح و تاویل کی کوشش میں مصروف نظر آتے ہیں جس سے تمدن جدید کے مطالبات کی زیادہ سے زیادہ تکمیل ہو سکے، اس لحاظ سے ان میں اور سرسید احمد خاں میں بہت کم فرق نظر آتا ہے،[3]
مفتی محمد عبدہ کا یہ میلان ان کی تفسیر، فتاویٰ اور ان کی تحریروں میں صاف طریقہ پر

---

[1] "زعماء الاصلاح فی العصر الحدیث" از ڈاکٹر احمد امین (مصری) ص ۱۰۶

[2] اس سلسلہ میں ان کی دو قابل قدر کتابیں خاص طور پر ذکر کے قابل ہیں (۱) رسالۃ التوحید (۲) الاسلام والنصرانیۃ فی العلم والمدنیۃ۔

[3] اس فرق کے ساتھ کہ شیخ محمد عبدہ لغتِ عرب، علوم ادبیہ اور ادبیاتِ اسلامیہ پر گہری نظر رکھتے ہیں اور سرسید مرحوم کا مطالعہ بہت محدود اور سطحی ہے۔

دیکھا جا سکتا ہے، ان کے بعد تجدد کے جو داعی پیدا ہوئے انھوں نے عام طور پر انھیں کی کتابوں سے استفادہ کیا اور انھیں کا حوالہ دیا ہے، مصر کے برطانوی ناظم اعلیٰ لارڈ کرومر نے اپنی کتاب (MODERN EGYPT) میں شیخ محمد عبدہ کے اس رجحان اور اس کی افادیت کا صاف طریقہ پر اظہار کیا ہے، وہ لکھتے ہیں :۔

"محمد عبدہ مصر کے جدید ذہنی مکتب خیال کے بانی تھے، یہ مکتب خیال ہندوستان کے اس مکتب خیال سے بہت مشابہت رکھتا ہے جو علی گڑھ یونیورسٹی کے بانی سرسید احمد خاں نے قائم کیا تھا"[1]

آگے چل کر لکھتے ہیں :۔

"ہمارے نقطۂ نظر سے مفتی محمد عبدہ کی سیاسی اہمیت کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس خلیج کو پاٹنے کے لئے کوشاں ہیں جو مغرب اور مسلمانوں کے درمیان پڑگئی ہے، وہ اور ان کے مکتب خیال کے پیرو اس کا استحقاق رکھتے ہیں کہ ان کو ہر ممکن مدد دی جائے اور ان کی ہمت افزائی کی جائے، اس لئے کہ وہ یورپین ریفارمر کے قدرتی حلیف اور معاون ہیں"[1]

اسی طرح نیومین اپنی کتاب "برطانیہ عظمیٰ" (GREAT BRITAIN) میں شیخ محمد عبدہ کے تلامذہ اور پیروؤں کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتا ہے :۔

"ان کا پروگرام اس سب کے علاوہ یہ تھا کہ مغربی تہذیب کو مصر میں داخل کرنے کے کام میں غیر ملکیوں کے ساتھ تعاون کرنے کی حوصلہ افزائی کی جائے، یہی وجہ تھی کہ لارڈ کرومر نے مصری وطن پرستی کے قیام کے بارے میں اپنی ساری امید اسی گروہ پر مرکوز کر دی اور اسی بنا پر انھوں نے (مفتی محمد عبدہ کے معتمد) سعد زغلول پاشا کو وزیر تعلیم مقرر کیا"[2]

---

[1] MODERN EGYPT-P.P. 179-180 [2] MODERN EGYPT-P. 165

سید جمال الدین افغانی کی تحریک کے اثرات اور ان کا مکتب فکر!

اس عظیم مقصد اور مشرق کے مخصوص سیاسی حالات نے جمال الدین افغانی جیسے جذباتی اور حساس شخص کے لئے سرگرمی وجد و جہد اور قوتِ عمل کا کوئی اور دوسرا میدان باقی نہیں چھوڑا اور وہ اسلامی معاشرہ کی تعمیر و تشکیل میں کوئی ایجابی خدمت انجام نہ دے سکے، ان کو مغربی تہذیب کے گہرے اور تفصیلی مطالعہ، آزادانہ تحلیل و تجزیہ کے عمل کو مکمل کرتے اور اس کی روشنی میں ایک ایسا نیا مکتب فکر تیار کرنے کا موقعہ نہیں ملا جو بدلتے ہوئے زمانہ کے ساتھ چل سکے اور مشرق کے طاقتور تقلیدی رجحان پر غالب آسکے۔

لیکن جدید تعلیم یافتہ اور ذہین مسلمان نسل کی نگاہوں میں وہ نہایت بلند مقام رکھتے ہیں، وہ ان چند افراد میں ہیں جنھوں نے جدید اسلامی نسل کو سب سے زیادہ متاثر کیا ہے' ان کی عظمت کا سب سے بڑا پہلو یہ ہے کہ انھوں نے مصر کے تعلیم یافتہ اور ذہین طبقہ کو الحاد و لادینیت کے آغوش میں جانے کے کام میں مزاحمت کی۔

تعلیم یافتہ طبقہ میں اسلام کے ذہنی و علمی اثرات اور اس کی طرف سے اجمالی عقیدت کے باقی رہنے میں ان کی تحریروں اور ان کے اثرات کا ضرور دخل ہے، بروکلمین (BROCKLEMNN) نے صحیح کہا ہے کہ :-

> "مصر کی روحانی زندگی پر پہلے بھی اسلام کی حکمرانی تھی' اب تک بھی یہی حال ہے' یہ زیادہ تر ایک ایرانی جمال الدین کے باعث ہے جنھوں نے سیاسی وجوہ سے اس بات کو ترجیح دی کہ اپنے آپ کو اس ملک کی طرف منسوب کر کے جہاں اپنی جوانی گذاری تھی، افغانی بتائیں۔"[1]

---

[1] (CARL CROCKLEMANN)
CARL BROCKLEMANN-GESCHICHTE DER ISLAMISCHEN VOELKER UND STAATEN, MÜNCHEN-BERLIN 1939.

عالم عربی میں مغربی فکر کے اولیں نقیب

وہ نوجوان جو نئی نسل کا جوہر اور ملت کا سرمایہ تھے، پہلے مصر میں جدید علوم حاصل کرتے اس کے بعد یورپ کے جدید تعلیمی مراکز کا سفر کرتے اور مغربی تہذیب کے سمندر میں غوطہ لگاتے، اس مغربی ماحول میں مطالعہ و تجربہ، فکری آزادی اور اخلاقی جرأت کی تعلیم دی جاتی تھی، اور تقلید اور کسی چیز کو اس کی کمزوریوں کے ساتھ آنکھ بند کر کے قبول کر لینا معیوب اور قابلِ احتراز بات سمجھی جاتی تھی، ایسی حالت میں یہ بات ہر طرح متوقع اور قرینِ قیاس تھی کہ ان مشرق نژاد مسلمان نوجوانوں میں (جنھوں نے مصر جیسے اسلامی ملک اور علمی و دینی مرکز میں ہوش سنبھالا اور قرآن مجید کا جو ہر زمانہ کا لافانی معجزہ ہے مطالعہ کیا) ایسے افراد پیدا ہوں جن کے ذوقِ سلیم کو مغربی تہذیب اور مغربی فکر کی بنیادی کمزوری، مادیت میں غلو، قومیت میں مبالغہ اور انسان اور اس کی عقل اور روح کی بلند پروازیوں اور ترقیوں کا محدود مادی تصوّر بری طرح کھٹکے اور چبھے اور ان میں اسلامی حمیّت و غیرت، بلند انسانی اقدار کی محبت اور اس جھوٹی اور مصنوعی تہذیب سے نفرت اور اس کے خلاف بغاوت کی ایک نئی روح پیدا ہو، ان میں ڈاکٹر اقبال جیسا آزاد اور روشن ضمیر مفکر اور محمد علی[1] جیسا انقلابی اور داعی پیدا ہو، واقعہ یہ ہے کہ مصر اور دوسرے عرب ممالک میں ایسے باغی افراد کا پیدا ہونا زیادہ قرینِ قیاس تھا، اور ان کی تعداد غیر عرب اور غیر مسلم اکثریت والے ملکوں سے قدرۃً زیادہ ہونی چاہئے تھی۔

---

[1] مولانا محمد علی کی طاقتور و دل آویز و مخلص شخصیت اور ان کی خصوصیات کے لئے ملاحظہ ہو مولانا عبدالماجد دریابادی کی کتاب "محمد علی، ذاتی ڈائری۔"

لیکن واقعہ اس کے خلاف ہے، ان عرب اور خالص اسلامی ملکوں میں ہمیں اقبالؔ اور محمد علی جیسے مغرب بیزار اور اسلام کے عاشق نظر نہیں آتے حالانکہ دونوں مقدم الذکر حضرات نے مرکزِ اسلام سے بہت دور ایک عجمی اور غیر اسلامی ماحول میں زندگی گذاری، ان کی رگوں میں خالص ہندوستانی خون موجزن تھا، اور ان کا خمیر اس ملک کی خاک سے تیار ہوا تھا جو عربی زبان اور تہذیب سے نا آشنا ہی تھی[1]، اور دونوں مغرب کی بھٹی میں سے سونا بن کر نکلے تھے، اس کے برخلاف مغرب میں تعلیم پانے والے اکثر عرب نوجوان مغرب کے نقیب اور وکیل بن کر واپس ہوئے اور مغرب کی تقلید اور اس کے تصورات و اقدار کے پرجوش داعی بن گئے۔

لارڈ کرومر نے جو ایک ایسے جدید مصر کی تشکیل کا سب سے بڑا مغربی داعی تھا، جو اسلام کے برائے نام رشتے کے ساتھ مغربی افکار و اقدار کا حلقہ بگوش اور علمبردار ہو، اس طبقے کی اعتقادی، ذہنی اور اخلاقی کیفیت کی تصویر کشی کی ہے، اور بڑی خوبی کے ساتھ دکھایا ہے کہ مغربی تعلیم کی چکی میں پس کر کس طرح ایک ایسی نئی مخلوق پیدا ہوئی ہے جو نہ پورے طور پر مسلمان ہے نہ مغربی، یورپ کے "عیسائی متشککین" اور مشرق کے مسلمان متشککین میں فرق ہے، اس کی بھی اس نے صحیح نشاندہی کی۔

---

[1] علامہ اقبالؔ نے متعدد اشعار میں اپنی ہندوستانی نسل و قومیت کا اظہار کیا ہے، ایک فلسفہ زدہ سیّد زادہ سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

میں اصل کا خاص سومناتی | آبا میرے لاتی و مناتی
تو سید ہاشمی کی اولاد | میری کفِ خاک برہمن زاد

اسی طرح مولانا محمد علی مرحوم بھی شمالی ہند کی ایک ہندوستانی نسل اور برادری کے فرد تھے۔

ان افراد کی مغرب زدگی، اسلامی معاشرہ میں ان کی حیثیت، ان کی حیرانی و سرگردانی اور اسلام کے شجرۂ حیات سے ان کی بے تعلقی کس حد تک پہونچ گئی تھی، اس کا اندازہ بھی حسب ذیل اقتباسات سے ہوگا، وہ اپنی کتاب "مصر جدید" (MODERN EGYPT) میں لکھتا ہے

"مصری معاشرہ تیزی کے ساتھ تغیر پذیر ہے جس کا فطری نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ایک ایسے افراد کی جماعت پیدا ہوگئی ہے، جو مسلمان ہیں تو اسلامی تہذیب سے عاری اور اگر یوروپین ہیں تو کم رشتہ (کمزور اور یورپی صفات سے بھی معرا) یورپ کا اثر یافتہ مصری بسا اوقات برائے نام تو مسلمان رہتا ہے لیکن فی الحقیقت عموماً وہ منکر الہیات (AGNOSTIC) ہوتا ہے، اور اس کے اور الازہر کے ایک عالم کے درمیان اتنی ہی بڑی خلیج حائل ہوتی ہے جتنی کہ ایک عالم اور ایک یوروپین کے درمیان"[1]

لارڈ (CROMER) آگے فرماتے ہیں:۔

"سچ تو یہ ہے کہ یورپ کی تعلیمی چکی سے گذر کر نوجوان مصری اپنی اسلامیت یا کم از کم اس کا بہترین جزء کھو ہی بیٹھتا ہے، وہ اپنے مذہب کے بنیادی عقاید کھو بیٹھتا ہے اس کو یہ یقین نہیں رہتا کہ میں ہمہ وقت اپنے خالق کے سامنے ہوں جس کے سامنے کبھی نہ کبھی مجھے اپنے اعمال کا جوابدہ ہونا پڑے گا لیکن وہ اب بھی اسلامی زندگی کے ان حصوں سے مستفید ہوتا رہتا ہے، جو اس کی اخلاقی کمزوریوں کو برداشت کر سکتے ہیں، اور جو معاملات زندگی میں اس کے مفاد اور سہولتوں سے تطابق رکھتے ہیں لیکن اسلامیت سے دور ہو کر تعلیم یافتہ مصری بمشکل ہی عیسائیت کی طرف مائل ہوتا ہے"[2]

---

[1] THE EARL OF CROMER MODERN EGYPT (1908) VOL. II P. 228-29

[2] IBID. P. 228

آگے چل کر وہ لکھتے ہیں :۔

"مصری آزاد خیال اس سے (یعنی یوروپین آزاد خیال سے) بھی آگے بڑھا ہوا ہوتا ہے، وہ اپنے آپ کو ایک ایسے طوفانی سمندر میں پاتا ہے جہاں نہ کشتی ہے اور نہ ناخدا، نہ تو اس کا ماضی اور نہ اس کا حال ہی اس پر کوئی پر زور اخلاقی رکاوٹیں حائل کرتا ہے، وہ دیکھتا ہے کہ اس کے ہموطنوں کی اکثریت مذہب کو نہایت مناسب اصلاحات کا مخالف تصور کرتی ہے، اور اس مذہب کو جو کہ ایسے نامناسب نتائج کی طرف لے جاتا ہو نہایت غصہ اور ناراضی کے عالم میں پامال کر کے وہ مذہب کو مطلقاً چھوڑ بیٹھتا ہے اپنے مذہب سے علیحدہ ہو کر علاوہ اپنے عریاں ذاتی مفاد کے کوئی دوسری رکاوٹ اس کو اخلاقی قوانین کی حدود میں نہیں رکھتی، حالانکہ وہ یوروپین جس کی وہ نقل کرنے کا کوشاں ہے اپنی قوم کے اخلاقی قوانین کا پابند رہتا ہے اس کا (یعنی مصری نوجوان کا) سماج دروغ اور دھوکہ دہی کو پرزور طور پر ممنوع قرار نہیں دیتا مختلف قسم کی اخلاقی بدکاریوں پر سماجی بدنامی کا ڈر بھی عملاً اس پر اثر انداز نہیں ہوتا، اپنے آبا کے مذہب کو چھوڑ کر وہ اس پر نظر بھی نہیں ڈالتا، وہ اس کو چھوڑ ہی نہیں دیتا، بلکہ اس کو لات مار دیتا ہے، وہ آنکھیں بند کر کے یورپین تہذیب کے دامن کی طرف جھپٹتا ہے لیکن اس کو یہ علم نہیں ہوتا کہ مغربی تہذیب کا بظاہر نمایاں پہلو صرف اس کا بیرونی حصہ ہے فی الحقیقت یوروپین تہذیب کے جہاز کو عیسائی اخلاق کی گہری قوت بیجا حرکات سے محفوظ رکھتی ہے، یہ قوت چونکہ ایک پنہاں قوت ہے اس لئے یوروپین طرز حیات کے باطل نقال اس کو نہیں پاسکتے، وہ قسمیہ کہتا ہے کہ میں نے مذہبی تعصبات کو

بالائے طاق رکھ دیا، وہ اپنے آبا کی تعلیمات سے متنفر ہے وہ یورپین سے کہتا ہے کہ دیکھو میری اپنی ریلیں ہیں، اپنے اسکول، اپنے اخبارات، اپنی عدالتیں اور جملہ دیگر اشیاء جو تمہاری تہذیب کا جزو ہیں (میرے یہاں بھی موجود ہیں) پس میں تم سے کس طرح کمتر ہوں؟

لیکن افسوس اسلامیت سے برگشتہ مسلمان اگرچہ اس کو اس خامی کا علم نہیں (یوروپین سے) ایک حیثیت سے کمتر ہے جس کو رفع بھی بہ آسانی نہیں کیا جا سکتا۔ ایک مہذب یوروپین جہاں تک ہم سمجھتے ہیں اگرچہ بحیثیت عیسائی نہ ہو لیکن پھر بھی وہ بڑی حد تک عیسائیت ہی کی پیداوار ہے، اور اگر انیس سو سالہ عیسائی تہذیب اس کی پشت پر نہ ہوتی تو وہ وہ نہ ہوتا جو کہ وہ (حقیقتاً) ہے۔[1]

مصر میں آزادیٔ نسواں کی تحریک اور اس کے اثرات

مغربی تہذیب و معاشرت سے گہرے تاثر کی ایک واضح مثال آزادیٔ نسواں کے مشہور مصری نقیب قاسم امین کی کتاب "تحریر المرأۃ"[2] (عورت کی آزادی) نیز ان کی دوسری کتاب "المرأۃ الجدیدۃ"[3] (خاتون جدید) ہے۔

پہلی کتاب میں مصنف نے دعویٰ کیا ہے کہ "بے پردگی کی دعوت میں دین سے کوئی مخالفت نہیں پائی جاتی" ان کا بیان ہے کہ شریعتِ اسلامی چند کلیات اور عمومی حدود کا نام ہے اگر جزئیاتِ احکام بیان کرنا اس کا وظیفہ ہوتا تو اس میں عالمگیر قانون بننے کی

---

[1] IBID P. 232 [2] سن اشاعت ۱۸۹۹ء [3] سن اشاعت ۱۹۰۰ء اس کتاب کا جواب مشہور مصری فاضل فرید وجدی مرحوم نے دیا جو "المرأۃ المسلمۃ" کے نام سے شائع ہوئی جس کا ترجمہ مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے اپنے ابتدائی دور میں اردو میں کیا تھا۔

صلاحیت نہ رہتی جو ہر زمانہ اور ہر قوم کے مناسب ہے، شریعت کے وہ احکام جو مروجہ عادات و معاملات پر مبنی ہیں ان میں حالات اور زمانہ کے مطابق تغیر و تبدل کیا جا سکتا ہے، شریعت کا مطالبہ صرف اس قدر ہے کہ یہ تغیر و تبدل کوئی ایسا نہ ہو جس سے اس کی عام بنیادوں میں سے کوئی بنیاد متاثر و مجروح ہو۔"[1]

اس کتاب میں مصنف نے چار مسائل سے بحث کی ہے (۱) پردہ (۲) عورت کا عام زندگی میں حصہ لینا (۳) تعدد ازدواج (۴) طلاق۔ ان چاروں مباحث میں انھوں نے اہلِ مغرب کے مسلک کو اختیار کیا ہے، اور یہ دعویٰ کیا ہے کہ یہی اسلام کا مسلک ہے۔

مغربی تعلیم، مغربی تہذیب اور اس کے اقدار سے مصنف کا گہرا تاثر ان کی دوسری کتاب "خاتونِ جدید" میں زیادہ نمایاں ہے، اس کتاب میں مصنف نے جدید مغربی طریقۂ بحث و استدلال کو اختیار کیا ہے، جو ان تمام مسلّمات و عقائد کو مسترد کرتا ہے، جس کی تجربہ یا حقیقت تائید نہیں کرتی، خواہ وہ مسلّمات و عقائد دین کے راستہ سے پہونچے ہوں، یا کسی اور راستہ سے، یہی وہ طریقہ ہے جس کو اہلِ مغرب واحد علمی طریقہ (سائنٹفک) کہتے ہیں، اس کتاب کے آخر میں مصنف نے مغربی تہذیب و معاشرت کے طریقوں کو اختیار کرنے کی کھلی دعوت دی ہے، مسلمانوں اور مصریوں کو اپنی تہذیب و معاشرت اور ماضی پر جو ناز ہے، اس پر نکتہ چینی کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے:۔

"یہی ہماری وہ بیماری ہے جس کے علاج کی سب سے پہلے ضرورت ہے، اس کا صرف ایک علاج ہے، وہ یہ کہ ہم اپنی نئی نسل کو مغربی تمدن کے حالات سے آشنا بنائیں اور وہ اس کے اصول و فروع سے واقف ہوں جب وہ وقت آئے گا (جو کچھ زیادہ دور

---

[1] تحریر المرأۃ ص ۱۶۹

نہیں ہے) تو حقیقت آفتاب کی طرح روشن ہو جائے گی اس وقت ہم کو مغرب کے تمدن کی قدر و قیمت معلوم ہو گی اور ہم کو یقین آجائے گا کہ کوئی اصلاح اس وقت تک ممکن نہیں جب تک وہ جدید مغربی علوم کی بنیاد پر قائم نہ ہو، اور یہ کہ انسانوں کے حالات خواہ مادی ہوں یا اخلاقی علم کے تابع فرمان ہونے چاہئیں اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ موجودہ متمدن قومیں قومیت، زبان، وطن اور مذہب میں کتنا ہی اختلاف رکھتی ہوں حکومت کی شکل، انتظام، عدالت، خاندانی نظام، طریقۂ تربیت، زبان، رسم الخط اور طرز تعمیر یہاں تک کہ معمولی عادات، لباس، سلام اور خورد و نوش میں ایک دوسرے کے مشابہ ہیں، اسی بنا پر ہم اہلِ مغرب کو بطور مثال اور نمونہ کے پیش کرتے ہیں، ان کی تقلید پر زور دیتے ہیں، اور اسی بنا پر ہم اپنے اہلِ ملک کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ مغربی خاتون کے حالات کا مطالعہ کریں۔"[1]

یہ دونوں کتابیں مصر کے جدید حلقہ میں بڑی مقبول ہوئیں ان کی اشاعت اور آزادیِ نسواں کی تحریک میں تجدد پسندوں نے جو سرگرمی دکھائی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عورتوں میں آزادی و بے پردگی کی ایک شدید لہر پیدا ہو گئی، مردوں عورتوں کے مخلوط اجتماعات کا رواج ہو چلا اور تعلیم حاصل کرنے کے لئے مصری لڑکیاں اور طالبات یورپ اور امریکہ کا سفر کرنے لگیں، اسکندریہ یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر محمد محمد حسین اپنی تازہ فاضلانہ کتاب "الاتجاہات الوطنیۃ فی الادب المعاصر" میں لکھتے ہیں :۔

"اس دعوت و تحریک کے نتیجہ میں عورتوں میں بے پردگی اور بے حجابی آزادی و بے قیدی کا جو رجحان پیدا ہوا اس سے اسلامی خیال کے لوگ گھبرا گئے عورتوں کے حالات میں جو انقلاب آرہا تھا قدیم آداب و رسوم باپ اور شوہر کے اقتدار کے خلاف بغاوت

---

[1] المرأۃ الجدیدۃ ص ۱۸۶-۱۸۵

کا جو جذبہ پیدا ہو رہا تھا اس کو انھوں نے شدت سے ناپسند کیا، وہ استعجاب اور
پریشانی کے عالم میں لباس کی تبدیلیوں اور تیزی کے ساتھ ڈھیلے ڈھالے اور ساتر
مصری لباس کے مقابلہ میں چست و کوتاہ مغربی لباس کو دیکھ رہے تھے، جو اس تیزی کے
ساتھ عورتوں میں مقبول ہو رہا تھا کہ جس کا ان کو پہلے سے کوئی اندازہ نہ تھا۔"[1]

ان مصری خواتین کا ذکر کرتے ہوئے جنھوں نے اس تحریک میں خاص دلچسپی لی اور
اس سلسلہ میں یورپ و امریکہ تک کا سفر کیا وہ لکھتے ہیں:۔

"آزادیٔ نسواں کی اس تحریک کی علمبرداری خاص طور پر علی پاشا شعراوی کی بیگم ہدی
شعراوی نے کی، انھوں نے ایسی جرأت وجدت سے کام لیا جس کی اب تک کسی مسلمان خاتون
نے ہمت نہیں کی تھی، انھوں نے مغربی عورت کے حالات کا مطالعہ کرنے کے لئے پیرس اور
امریکہ کا سفر کیا، وہ اخباری نمائندوں کو بے تکلف بیان دیتیں اور اپنے تأثرات اور
خیالات کا آزادانہ اظہار کرتیں۔"[2]

مصر میں مستشرقین کی صدائے بازگشت

یورپ سے تعلیم پا کر آنے والے عرب فضلاء کی حالت یہ تھی کہ مغربی روح ان کے اندر
پوری طرح سرایت کر چکی تھی، وہ اسی کے دماغ سے سوچتے تھے، بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ اسی کے
پھیپھڑوں سے سانس لیتے تھے، وہ اپنے مستشرق اساتذہ کی صدائے بازگشت بن کر
وہی خیالات و نظریات پورے یقین و وثوق اور پورے جوش اور سرگرمی کے ساتھ اپنے
ملک میں پھیلانے کی کوشش کرتے، دنیا کے کسی گوشہ میں اگر کوئی مستشرق کوئی نظریہ یا

---

[1] الاتجاہات الوطنیۃ فی الادب المعاصر، ج ۲ ص ۲۳۵ [2] ایضاً

خیال پیش کرتا تو مصر میں نہ صرف اس کی حمایت کرنے والا بلکہ پورے خلوص اور پورے زورِ قلم اور انشا پردازی کے ساتھ اس کا شارح وداعی کوئی نہ کوئی ادیب اور مفکر اسی وقت مہیا ہو جاتا۔

مثلاً قرآن مجید کا انسانی تعبیر کا نتیجہ ہونا، دین وسیاست کی تفریق، اسلام کی نظامِ حکومت سے یکسر بے تعلقی اور اس کا محض ایک اعتقادی، اخلاقی اور عبادتی نظام ہونا[1]، سکولرازم کی دعوت، عربی زبان وادب کے اولیں ماخذ (شعر جاہلی وغیرہ) کی صحت وثبوت سے انکار، حدیث کی قیمت، حجیت اور سنّت کی صحت کا انکار یا تشکیک، عورتوں کی آزادی اور مردوں کے ساتھ مساواتِ کلّی اور بے پردگی کی تلقین وتحریک، فقہ اسلامی کو رومن لا سے ماخوذ اور اس کی اسپرٹ سے متأثر قرار دینا، قدیم تہذیبوں کے احیاء کا نعرہ، عہدِ فرعونی کی تقدیس، اس کی تہذیب، ادب اور کارناموں پر فخر، مقامی عامی زبان میں تصنیف وتالیف اور لاطینی حروف کو اختیار کرنے کی دعوت، مغربی قانون کی بنیاد واصول پر قانون سازی اور عربی قومیت اور مادّی سوشلزم، اور بعض وقت مارکسی کیونزم

---

[1] اس موضوع پر مصر میں ایک ازہری عالم شیخ علی عبد الرازق کے قلم سے ایک مستقل کتاب شائع ہوئی، وہ اس وقت شرعی قاضی (جج) بھی تھے کتاب کا نام "الاسلام واصول الحکم" ہے جس نے مصر کے دینی حلقہ میں سخت بے چینی اور ناراضگی کی لہر پیدا کر دی اور اس کے نتیجہ میں مصنف کو ازہر کی سند اور اس کے حقوق وامتیازات سے محروم ہونا پڑا اس کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مستشرقین کے خیالات تعلیم یافتہ طبقہ میں یہاں تک مقبول ہو چکے تھے کہ ایک عالم دین ان کی پرزور وکالت اور تبلیغ پر آمادہ ہو جاتا ہے، اس کتاب میں مصنف کا دعویٰ ہے کہ "خلافت ایک محض عربی اور رائج الوقت نظام تھا جس کو مسلمانوں نے اختیار کر لیا تھا، اور شریعت اس کا پابند نہیں کرتی" وہ ثابت کرتے ہیں کہ "خلافت، قضاء، سرکاری عہدے اور حکومت کے مناصب سب خالص دنیاوی عہدے اور انتظامات ہیں جن کی نہ کوئی دینی حیثیت ہے نہ شریعت سے ان کا کچھ تعلق ہے۔"

کی دعوت (جو حال میں زیادہ نمایاں ہوگئی ہے) ان سب چیزوں میں مغربی فکر بلکہ مغربی طرزادا اور تعبیر تک کے گھنے سائے آپ کو اہل عرب کے دماغوں اور ان کی تحریروں پر اپنے بازو پھیلائے ہوئے نظر آئیں گے، وہ اس پر اس طرح چھا گئے جس طرح بڑے درخت نوخیز پودوں کو اپنے سایہ میں لے لیتے ہیں، مغربی فکر کا عکس ان پر اس طرح پڑتا نظر آتا ہے جس طرح کسی صاف شفاف آئینہ میں آفتاب کا عکس۔

اسلامی معاشرہ میں مغربی افکار کے اس فاتحانہ داخلہ اور غلبہ و نفوذ کی شہادت ایک مستشرق عالم نے بھی دی ہے جس نے مشرق اسلامی کا قریب سے مطالعہ کیا ہے اور اس کے فکری رجحانات سے اس کو گہری واقفیت ہے گب (A. R. GIBB) اپنی کتاب (WHITHER ISLAM) میں لکھتا ہے:۔

"اگر ہمیں مغربی اثر و نفوذ کا صحیح پیمانہ درکار ہے اور ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ مغربی ثقافت اسلام (مشرقی ممالک کے تعلیم یافتہ مسلمانوں) کے رگ و پے میں کس طرح سرایت کر گئی ہے تو اس لئے ہم کو سطحی مظاہر سے نیچے اترنا ہوگا ہم کو ان جدید افکار اور نئی تحریکات پر غور کرنا ہوگا، جو محض مغربی طریقوں اور اسالیب کے گہرے تأثر کا نتیجہ ہیں اور محض ان کے اثر سے پیدا ہوئی ہیں، مشرقی فکر ان کو پورے طور پر ہضم کر کے ان کو نئی قائم ہونے والی اسلامی سلطنتوں کا اس طرح جزو بنا دینا چاہتا ہے، جو ان کے حالات کے ساتھ میل کھا سکے"[1]

تالیف و ترجمہ کی تحریک کا رخ ادبیات کی طرف اور طبع زاد کام کی کمی

یہ ادباء و اہل قلم اپنے ملک اور ملت پر اور اپنی زبان و ادب پر بڑا احسان کرتے

---

[1] P. 328

اگر یہ مغربی زبانوں کی ان کتابوں کو عربی میں منتقل کرتے جو سائنٹفک علوم پر لکھی گئی ہیں، اور جن سے عالمِ عربی کا کتب خانہ اب بھی خالی ہے، جس طرح جاپان کے ادباء واہلِ قلم نے کیا اور اس کی بدولت اپنے ملک کو ایک ایسا صنعتی ملک بنا دیا جو طبعی علوم اور صنعتی علوم میں یورپ کے بڑے سے بڑے ملک سے آنکھیں ملا سکتا ہے، لیکن افسوس ہے کہ ان کی تمام تر توجہ اور دلچسپی کا مرکز صرف ادبیات، علومِ عمرانیہ، فلسفہ، تاریخ، ناولیں، افسانے اور الحاد و بغاوت اور فکری انتشار کے داعیوں اور علمبرداروں کی تصانیف تھیں جنھوں نے ان اسلامی ممالک میں بھی ایک نیا فکری انتشار اور اخلاقی انارکی پیدا کر دی اور قومی شخصیت و کردار کو اور کمزور کر دیا اور یہاں غیر ضروری طریقہ پر افکار و اقدار اور مکاتبِ فکر کی ایک نئی کشمکش پیدا ہو گئی۔

اس مغربی رجحان اور فکر کو مقبول بنانے کی کوشش میں مصر کے بعض چوٹی کے اہلِ قلم اور صاحبِ طرز انشاء پرداز شریک تھے اور اس میدان میں متعدد ایسی شخصیتیں نمایاں ہوئیں جن کی زبان اور زورِ بیان کا سارا عرب لوہا مانے ہوئے تھا، لیکن دوسری طرف نہ صرف مصر بلکہ پورے مشرقِ عربی میں علمی، طبعی، میکانیکی اور ریاضیات کے میدان میں مجتہد قسم کے افراد مطلق پیدا نہ ہو سکے جن کی ان علوم میں برتری اور بالادستی اور ان کی تحقیقات اور علمی کارناموں کی قدر و قیمت کا اعتراف مغرب کو بھی کرنا پڑتا اور دنیا کے بین الاقوامی علمی حلقہ میں ان کو کوئی ممتاز مقام حاصل ہوتا۔

لندن یونیورسٹی کے پروفیسر (BERNARD LEWIS) نے اپنے ایک مضمون میں مشرقِ وسطیٰ کے ممالک کی اس کمزوری کا ذکر کرتے ہوئے صحیح لکھا ہے:۔

"(مشرقِ وسطیٰ) میں اور تخیل (طبعزاد) سائنسی کام میں صحیح معنی میں کوئی ایسی ترقی نہیں ہوئی جیسا کہ جاپان، چین یا ہندوستان میں نظر آتی ہے، یہاں (مشرقِ وسطیٰ میں) طالب علموں

کی ہر نسل اور ہر کھیپ کو مغرب ہی کے وسائل اور ماخذوں سے استفادہ کرنا پڑتا ہے، جو اس عرصہ میں خود کہیں سے کہیں پہونچ جاتے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ سائنسی معلومات اور صنعتی صلاحیت اور ان کے نتیجہ میں فوجی طاقت میں مشرق وسطیٰ اور مغرب کے ترقی یافتہ ممالک کے درمیان آج اس سے زائد تفاوت نظر آتا ہے جتنا آج سے سو یا پچاس سال پہلے نظر آتا تھا جب کہ مشرق وسطیٰ کو مغرب بنانے کی کوشش کا آغاز ہوا تھا۔"[1]

مغربی زندگی کی ایک تصویر

اس دور میں مصر کے بعض ادباء و مصنفین نے مغربی تہذیب کو پورے طور پر قبول کر لینے، اس تہذیب و تمدن کو اپنے لئے ایک اعلیٰ اور مثالی نمونہ (آئیڈیل) تصور کرنے کی علانیہ دعوت دی، مصر پر مختلف اسباب کی بنا پر مغربی تہذیب کا رنگ روز بروز گہرا ہوتا جا رہا تھا، وہ برابر مغرب کی طرف بڑھ رہا تھا، قریب تھا کہ اس کا تعلیم یافتہ اور مرفہ الحال طبقہ مغربی معاشرہ و تہذیب کی ہو بہو تصویر بن جائے مصر نے اس میدان میں اتنا فاصلہ طے کر لیا تھا کہ ۱۹۳۸ء میں ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے اس کو مغربی زندگی و تہذیب کا نمونہ قرار دیا، وہ اپنی مشہور و مقبول کتاب "مستقبل الثقافۃ فی مصر" میں لکھتے ہیں:۔

"ہماری مادی زندگی سوسائٹی کے اونچے طبقوں اور خاندانوں میں خالص مغربی ہے، دوسرے طبقوں میں (افراد اور جماعتوں کے معیارِ زندگی اور وسائل کے بقدر) وہ مغربی زندگی سے متأثر ہے، جن کا معیارِ زندگی بلند ہے، اور ان کے پاس وسائل زیادہ ہیں، وہ

---

[1] (BERNARD LEWIS) کا مضمون بعنوان (THE MIDDLE EAST VERSUS THE WEST)

مندرجہ مجلہ (ENCOUNTER, OCT. 1963)

مغربی زندگی سے زیادہ متأثر و قریب ہیں اور جن کے پاس اس کی کمی ہے وہ (مجبوراً) اس سے دور ہیں اس کے معنی یہ ہوئے کہ ایک مصری کی دنیاوی اور مادی زندگی کے لئے اعلیٰ نمونہ (آئیڈیل) وہی ہے جو ایک مغربی کی مادی زندگی کا ہے۔[1]

"ہماری معنوی زندگی اپنے مظاہر کے اختلاف کے ساتھ خالص مغربی ہے ہمارا نظام حکومت خالص مغربی ہے، ہم نے اس کو یورپ سے بغیر کسی تردد اور خلش کے جوں کا توں منتقل کیا ہے اگر ہم اپنے کو اس معاملہ میں کچھ ملامت کر سکتے ہیں تو صرف یہ کہ ہم نے اہلِ یورپ سے ان نظاموں اور سیاسی زندگی کی شکلوں کو منتقل کرنے میں سستی اور تاخیر سے کام لیا۔"[2]

"تعلیم کو دیکھئے، تقریباً ایک صدی سے اس کا نظام کیا ہے، اور وہ کس بنیاد پر قائم ہے؟ خالص مغربی طرز پر، اس میں کسی شبہہ اور اختلاف کی گنجائش نہیں، ہم اپنے پرائمری سکنڈری اور اعلیٰ تعلیم کے مرحلوں میں اپنے بچوں کو خالص مغربی سانچے میں ڈھالتے ہیں جس میں کسی دوسری چیز کی آمیزش نہیں ہوتی۔"[3]

ان سب باتوں کے آخر میں وہ حسب ذیل نتیجہ اخذ کرتے ہیں:۔

"یہ سب باتیں اس بات کی علامت ہیں کہ ہم عصر حاضر میں یورپ سے ایسا قرب اور رابطہ چاہتے ہیں جو روز بروز بڑھتا ہے یہاں تک کہ ہم لفظاً و معنیً حقیقتاً و شکلاً ہر اعتبار سے اس کا ایک حصہ بن جائیں۔"[4]

مصر کو یورپ کا ایک ٹکڑا سمجھنے کی دعوت!

ڈاکٹر طٰہٰ حسین جدید عربی ادب کے سرخیل اور نوجوانوں اور نئے لکھنے والوں کے

---

[1] ص ۳۱ [2] ص ۳۲ [3] ص ۳۶ [4] ص ۳۴

محبوب اوران کے مثالی ادیب و مفکر ہیں، مشرق وسطیٰ کی جدید نسل پر شاید ان سے زیادہ کسی نے اثر نہیں ڈالا، وہ ایک طرزِ نگارش کے بانی سمجھے جاتے ہیں جس کو اگرچہ بعض ناقدین اور اہلِ ذوق زیادہ پسند نہیں کرتے مگر اس کی سلاست صحتِ زبان اور قدیم عربی کا حسن مسلّم ہے۔

وہ ۱۸۸۹ء میں مصر میں پیدا ہوئے بہت بچپن ہی میں بصارت سے محروم ہو گئے، مکتب میں داخل ہو کر قرآن شریف حفظ کیا، کچھ عرصہ ازہر میں رہے لیکن ان دونوں سے بیزاری کا اظہار ان کی کتابوں میں جا بجا نظر آتا ہے، جامعہ مصریہ میں تعلیم مکمل کر کے پیرس گئے اور وہاں سے ڈاکٹریٹ کیا، واپسی پر جامعہ مصریہ کے کلیۃ الآداب میں پہلے پروفیسر پھر پرنسپل مقرر ہوئے اس خدمت سے سبکدوش ہو کر تصنیف و تالیف میں منہمک ہوئے، ۱۹۴۹ء میں مصر کے وزیر تعلیم منتخب ہوئے اور پاشا کا خطاب حاصل کیا، ان کی مشہور تصنیفات "فی الشعر الجاہلی" "فی الادب الجاہلی" "ذکریٰ ابی العلاء" "الایام" "مستقبل الثقافۃ فی مصر" ہیں۔

انھوں نے بہت سے ایسے خیالات و تحقیقات کا اظہار کیا جو ادب و تاریخ اور دین کے مسلّم و معروف خیالات و عقائد کے خلاف تھیں اور جن پر مصر کے ادبی و دینی حلقوں میں سخت تلاطم اور ہنگامہ پیدا ہوا، آخر میں اس کی تلافی کے لئے یا پختگی و سن رسیدگی کے اثر یا محض توفیق خداوندی سے سیرت و صحابہ کے حالات پر بعض موثر و دل آویز کتابیں لکھیں جن میں سے "علی ہامش السیرۃ" اور "الوعد الحق" خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

طٰہٰ حسین مغربی تمدن و فلسفہ کے گرویدہ اور فرانسیسی ثقافت و ادب کے دلدادہ ہیں ان کو فرانس سے گہرا ذہنی و ادبی لگاؤ تھا، انھوں نے ایک فرنچ خاتون سے شادی کی، ان کی اولاد کی تعلیم و تربیت بھی فرانسیسی ماحول میں ہوئی، ان کو فرانسیسی زبان و ادب پر اچھی قدرت تھی، اور انھوں نے اس کے بڑے ادبی ذخیرہ اور خیالات کو عربی میں منتقل کیا ہے،

ان کی کتابوں میں مستشرقین کے خیالات و "تحقیقات" کا کامل عکس پایا جاتا ہے، ان کو ان کے بنیادی خیالات کو پھیلا کر بیان کرنے کا خاص ملکہ ہے، ذہنی اپج، طبیعت کی بے چینی اور جدت پسندی ان کی خصوصیات ہیں۔

یہ توقع بالکل بجا اور فطری تھی کہ ڈاکٹر طہٰ حسین جیسا ذہین شخص جس کو علم و ادب کی دنیا میں ایک اہم مقام حاصل ہے جس نے بچپن میں قرآن حفظ کیا اور اس کا مطالعہ کرتا رہا جس نے کچھ عرصہ ازہر میں تعلیم حاصل کی، علوم و ادبیات کا بہت وسیع اور آزاد نظر سے جائزہ لیا، یورپ کی مادی تہذیب ملحدانہ فلسفہ اور قوم پرستی (نیشنلزم) کے مفاسد اور اس کی ناکامی کو بچشم خود دیکھا اور اس کے آزاد خیال مغربی مفکرین کی بے لاگ تنقید سنی اسی کے ساتھ تاریخ اسلام اور سیرت نبوی کا ذوق و دلچسپی کے ساتھ مطالعہ کیا، ایسے شخص سے یہ توقع بالکل قدرتی اور حق بجانب تھی کہ وہ مصر کو (فکر و تہذیب کے میدان میں) اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے اور اپنی شخصیت کی آزادانہ تعمیر و تربیت اور اس عظیم پیغام (اسلام) کے علمبردار بننے کی دعوت دے گا جس سے اللہ نے اس کو صدیوں پہلے سرفراز کیا اور اس طرح مصر کو عالمی قیادت و رہنمائی کا منصب حاصل ہو سکتا تھا، حتیٰ کہ مصر اگر واقعۃً برّاعظم یورپ کا ایک ٹکڑا ہوتا اور مغربی تہذیب کے خاندان کا ایک فرد، جب بھی ایک بلند ہمت، بلند نظر مسلمان مصری مفکر کا یہی فرض تھا کہ وہ مصر کو اس پیغام کا حامل بننے اور اس کے ذریعہ دنیا کے نقشہ میں اپنی جگہ بنانے کی دعوت دیتا، اس لئے کہ آسمانی پیغام جو تمام انسانوں کے لئے عام ہیں، ان تہذیبوں سے بہت بلند و بالا اور بہت وسیع اور لافانی ہیں، جو کسی خاص دور میں قائم ہوتی ہیں، وہ جغرافیائی حدبندیوں اور تاریخی ادوار سے آزاد ہیں، اگر وہ ایسا کرتے اور اس کی دعوت کو لے کر کھڑے ہوتے تو وہ ایک ٹھوس دینی بیداری کے نقیب اور ایک صحیح انقلاب کے

اولیں رہنما اور پیشرو بن سکتے تھے، جو مصر سے شروع ہوتا اور پورے عالم عربی میں پھیل جاتا اور یہ بات ان کی عظیم صلاحیتوں کے عین مطابق ہوتی۔

لیکن عالم اسلام کے تعلیم یافتہ طبقہ میں مغربی ثقافت کے گہرے اثر و نفوذ اور اس کی طاقتور گرفت کی وجہ سے وہ اسلامی سوسائٹی بہت کمزور ہو چکی تھی جس میں طٰہٰ حسین نے نشوونما پایا تھا، چنانچہ انھوں نے اس کی دعوت دینی شروع کی کہ مصر اپنے آپ کو مغرب کا ایک حصہ سمجھے، انھوں نے اپنی ساری ذہانت ادبیت اور تاریخی مطالعہ اس چیز کے ثابت کرنے میں صرف کیا کہ مصری فکر و دماغ یا تو بالکلیہ مغربی فکر و دماغ ہے یا اس سے بہت زیادہ قریب ہے، اور اس کا یونانی فکر سے جس قدر گہرا لگاؤ ہے مشرقی فکر سے اسی قدر بُعد، وہ قدیم زمانہ اور عہد فرعونی سے آج تک کسی زمانہ میں کسی حملہ آور تہذیب سے متاثر نہیں ہوا، وہ نہ اہل ایران سے متاثر ہوا (جن کو مصر پر کچھ عرصہ حکومت کرنے کا موقعہ ملا) نہ یونانیوں سے نہ عربوں و مسلمانوں سے (جنھوں نے صدیوں مصر پر حکومت کی) ان کے نزدیک اگر مصری فکر و دماغ قدیم زمانہ سے لے کر آج تک کسی علاقہ سے متاثر ہوا ہے تو وہ بحر روم کا منطقہ اور اس کا فکر و دماغ ہے، اور اگر اس نے مختلف قسم کے فوائد کا تبادلہ اور افادہ و استفادہ کا طبعی فرض انجام دیا ہے تو صرف بحر روم کی اقوام سے[1] ——— وہ کہتے ہیں:۔

"اس سے بڑھ کر بے عقلی اور سطحیت کی بات کوئی نہ ہوگی کہ مصر کو مشرق کا ایک حصہ اور مصری فکر کو ہندوستان یا چین کی طرح مشرقی فکر سمجھا جائے۔"[2]

اس بنیاد پر ڈاکٹر طٰہٰ حسین مصریوں کو مغربی تہذیب کو اپنانے اور اہل مغرب کے ساتھ (جو در اصل ایک عقلی و فکری خاندان کے افراد ہیں) ان کے نظام ہائے زندگی ان کی قدروں

---

[1] ص ۲۲   [2] ص ۱۴

اور ذوق اور طریقۂ فکر میں شریک ہونے اور حصہ لینے کی دعوت دیتے ہیں ——— وہ کہتے ہیں:۔

"ہمیں اہلِ یورپ کے طریقہ پر چلنا چاہیئے اور ان کی سیرت و عادات اختیار کرنا چاہیئے تاکہ ہم ان کے برابر ہوسکیں اور تہذیب کے خیر و شر، تلخ و شیریں، پسندیدہ و ناپسندیدہ ہر چیز میں ان کے رفیقِ کار اور شریکِ حال ہوسکیں[1]۔"

"ہم ایک یورپین کو باور کرا دیں کہ اشیاء کو ہم اسی نظر سے دیکھتے ہیں جس نظر سے ایک یورپین دیکھتا ہے، ان کی وہی قدر و قیمت ہماری نظر میں ہے، جو اس کی نظر میں ہے، ان کے متعلق وہی رائے قائم کرتے ہیں جو ایک مغربی کرتا ہے[2]۔"

پست ذہنی سطح

تقلید و نقالی اور مغرب میں فنا اور تحلیل ہو جانے کی بے باکانہ دعوت اور بلند روحانی و اخلاقی ذمہ داریوں، فرائض اور مقاصد کو جغرافیہ، تاریخ اور قوموں کے مزاج و فکر کے محدود پیمانہ پر اور قدیم تاریخ کی روشنی میں جانچنے کی کوشش ایک ایسی پست سطح ہے جس سے ہم طٰہٰ حسین جیسے عالم اور مفکر ادیب کو بہت بلند اور بالاتر سمجھتے تھے، مشرق کے غیر اسلامی ملکوں کے بعض مشرقی رہنما اور مفکر تک اس سطح سے بلند نظر آتے ہیں، اور انھوں نے "انسانیت" "آفاقیت" اور اخلاقی و روحانی اقدار کی (جو جغرافیائی حدود، قدیم و جدید کی تفریق اور تہذیبی علاقوں اور احاطوں کی پابندیوں سے آزاد ہیں) بہت بلند آہنگی کے ساتھ دعوت دی اور ان تمام جامد و محدود روابط کا انکار کیا جو ایک انسانی خاندان کو ملکوں اور نسلوں اور تہذیبی علاقوں یا مغرب اور مشرق میں تقسیم کرنے کے ذمہ دار ہیں۔

---

[1] ص ۴۱   [2] ص ۴۴

عرب کے ایک صاحب فکر مسلمان سے اس وسیع نظریہ اور اس عالمگیر پیغام کی زیادہ توقع تھی، وہ ہر طرح سے اس کا حقدار تھا کہ اس دعوت اور نظریہ کا علمبردار بن کر دنیا کے سامنے آئے اور انسانیت کی قیادت و رہنمائی کرے، اس لئے کہ اس نے ایک ایسے شجرِ سایہ دار کے نیچے پرورش پائی ہے جو نہ مشرقی ہے نہ مغربی" زیتونۃ لاشرقیۃ ولاغربیۃ"

اخوان کی تحریک

مغربی تہذیب کا آنکھ سے آنکھ ملا کر مقابلہ، اس پر جرأت مندانہ اور پُر از اعتماد تنقید اور ایک داعی اور حملہ آور کی حیثیت سے اس کا سامنا کرنے کے لئے ایک مربوط اور ٹھوس کوشش، مغربی تہذیب کے مزاج اور اس کی ترکیب سے گہری واقفیت، اسلام کی دعوت اور اس کی تعلیمات اور اس کے مسلکِ زندگی پر مضبوط عقیدہ اور داعیانہ جوش کی ضرورت تھی۔

اس کے لئے اس سیاسی رہنما کے موقف کے بجائے (جس کو سید جمال الدین افغانی نے اختیار کیا تھا) اور اس دفاعی پوزیشن کے بجائے جس میں شیخ محمد عبدہ نظر آتے ہیں، ایک دوسرے موقف کی ضرورت تھی۔

مصر میں الاخوان المسلمون کی تحریک[1] اگر اپنی صحیح اور طبعی رفتار سے آگے بڑھتی رہتی اور اس کے جھنڈے کے نیچے عالم اسلام کے مفکرین، ممتاز اہلِ قلم اور ماہرینِ فن جمع ہو جاتے[2] تو اس

---

[1] اس تحریک کی تاریخ، اس کی اہمیت و وسعت اور اس کے بانی شیخ حسن البناء مرحوم کے حالاتِ زندگی و کمالات کے لئے ملاحظہ ہو "تحریک اخوان المسلمین" (ترجمہ ڈاکٹر سید رضوان علی ندوی)

[2] جن کا ایک نمونہ عبدالقادر عودہ شہید، سید قطب شہید، محمد الغزالی، ڈاکٹر سعید رمضان، ڈاکٹر مصطفٰے السباعی، محمد قطب اور ڈاکٹر یوسف القرضاوی وغیرہ ہیں۔

تحریک سے بڑی امید تھی کہ وہ مشرق وسطیٰ میں اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کے کام کی تکمیل کرسکے گی۔

"الاخوان المسلمونؒ" کی تحریک و تنظیم میں اس کارِ عظیم کی کہاں تک صلاحیت تھی، اور اس نے اپنے حدود و امکانات کے اندر کہاں تک اس کے تقاضوں کو پورا کیا؟ اس بارے میں بہت سے لوگوں کو شبہ ہے، مناسب ہوگا کہ اس موقع پر ایک ایسے مغربی مبصر کا تاثر پیش کر دیا جائے جو اخوان کا ہمدرد اور وکیل نہیں، پروفیسر اسمتھ (W. C. SMITH) اخوان کی تحریک پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے :-

"الاخوان المسلمونؒ" کو شروع سے آخر تک رجعت پسند سمجھ لینا ہمارے نزدیک غلط ہوگا کیونکہ اس میں عدل اور انسان دوستی کی بنیادوں پر ایک جدید سوسائٹی قائم کرنے کی قابلِ تعریف تعمیری کوشش بھی شامل ہے، جو قدیم روایات کی بہترین اقدار سے ماخوذ ہے، وہ جزوی طور پر ایک ایسی قوتِ فیصلہ کی حامل ہے جو اس زوال و پستی کا خاتمہ کرسکتی ہے، جہاں عرب سوسائٹی پہونچ چکی ہے، ایک مکمل غیر منظم اجتماعی موقع پرستی جو شخصی بے عنوانی اور بد دیانتی کے ساتھ وابستہ ہے، وہ سوسائٹی کی ان بنیادوں کی طرف واپس لوٹنا چاہتی ہے، جو متفقہ و مسلّمہ اخلاقی اقدار اور متوازن و ہم آہنگ نقطۂ نظر پر قائم ہیں، اور ایسا عملی پروگرام پیش کرنا چاہتی ہے جس کے ذریعہ پسندیدہ مقاصد کو زیادہ منظم، زیادہ باضابطہ اور پرجوش عینیت پرستوں (IDEALISTS) کے ہاتھوں عملی جامہ پہنایا جاسکتا ہے، اس کے ساتھ ساتھ وہ اس فیصلہ کی بھی حامل ہے جس کے ذریعہ وہ ایک ناقابلِ فہم اور ناقابلِ عمل جامد اور خالص روحانی معیار (آئیڈیل) کی غیر عملی تنظیم و حقیدت کا خاتمہ کرسکتی ہے، وہ اسلام کو خالص بے حس اور مردہ عقیدہ تمدنوں اور پرستاروں کی جذباتی گرمجوشی یا پیشہ ور روایت پرستوں کے

فرسودہ دائرۂ عمل سے جو اپنے خیال وعمل میں عہد ماضی سے وابستہ ہیں، ایک ابھرتی ہوئی قوت میں تبدیل کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے، جو جدید مسائل پر اپنا عمل کر سکے۔

یہ بہت اہم تبدیلیاں ہیں جن کے بغیر (یا ان چیزوں کے بغیر جو ان کی قائم مقام ہو سکتی ہوں) ہمارے نزدیک عرب سوسائٹی کسی حالت میں ترقی نہیں کر سکتی بغیر کسی متفقہ اخلاقی قوت اور ابھارنے والی طاقت کے، اور بغیر کسی اندرونی موثر تحریک کے جو ٹھوس مواقع تک پہونچا سکے، بہتر سے بہتر معاشرتی یا قومی پروگرام بھی محض کاغذ کی زینت رہے گا، اور عرب سوسائٹی کی روحانی پسپائی بدستور جاری رہے گی، اخوان کی اپیل میں معاشرہ کے اکثر مسائل کا برمحل جواب پوشیدہ ہے، جب تک کوئی دوسرا گروہ ان مسائل سے نمٹنے کی نسبتاً زیادہ طاقتور خواہش اور جذبہ کے ساتھ سامنے نہ آئے، یہ یقین کیا جا سکتا ہے کہ اخوان کی تحریک باوجود ظلم واستبداد کے زندہ رہے گی، اب تک کمیونسٹوں کو چھوڑ کر اخوان وہ واحد جماعت ہیں جنھوں نے ایک ایسا نصب العین پیش کیا ہے، جو زبانی عقیدتمندی سے آگے بڑھ کر زیادہ بڑے پیمانہ پر تعاون حاصل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔[1]

لیکن ایک طرف اس تحریک کے رہنماؤں کی عملی سیاست میں ذرا قبل از وقت شرکت کی وجہ سے دوسری طرف عرب نیشنلزم اور سوشلزم کے علمبرداروں کے برسر اقتدار آجانے اور اس تحریک کو پوری قوت سے کچل دینے کی بنا پر عالم عربی اور اس کے نتیجہ میں پورا عالم اسلام اس طاقتور اور وسیع تحریک کے فوائد سے محروم ہو گیا، جو بلاشبہ عصر حاضر کی سب سے بڑی اسلامی تحریک اور تیزی کے ساتھ ابھرتی ہوئی دینی دعوت اور طاقت تھی، یہ عالم اسلام

---

[1] (ISLAM IN MODERN HISTORY, P. 161. 162)

بالخصوص عالمِ عربی کا ناقابلِ تلافی نقصان اور بہت بڑا المیہ تھا۔

اِدھر مصر میں "الاخوان المسلمون" کو کچھ آزادی حاصل ہوئی ہے لیکن ان کے مستقبل اور ان کی سرگرمیوں کے اعادہ کے بارے میں کوئی پیشگوئی کرنا بہت مشکل ہے، جو دورِ ابتلا سے پہلے جاری تھیں، برسوں کے ناغہ کے بعد قاہرہ سے ماہنامہ "الدعوۃ" پھر نکلنا شروع ہوگیا ہے اور اس کے پڑھنے والوں اور شائقین کی تعداد ایسی ہوگئی ہے جو عام طور پر کسی نئے رسالے کو حاصل نہیں ہوتی، اس سے مصری مسلمانوں کے دلوں میں اخوان .... کے اثر واہمیت کا صاف پتہ چلتا ہے، اور معلوم ہوتا ہے کہ اس پوری مدت میں اخوان کا خلا پُر نہیں ہوا تھا، اور اخوان اور ان کے ترجمان "الدعوۃ" کو اسلامی قیادت کے میدان میں ایک بار پھر آنا پڑا ——— وللہ الامر من قبل ومن بعد۔

۲۳ جولائی کا انقلابِ مصر اور اس کے اثرات

غیر ملکی ثقافت، مغرب پرستی کی دعوت، اور مغرب کی وہ مادّی تحریکیں اور فلسفے جو باہر سے درآمد کئے جارہے تھے، اور ان کو پھیلانے کے لئے ملک کے بڑے بڑے ادباء، اہلِ قلم اور مصنفین رضاکارانہ طور پر اپنی خدمات پیش کر رہے تھے، لوگوں کے ذہنوں میں اپنا قدرتی عمل کرتے رہے، یونیورسٹی کا نوجوان طبقہ، نئی نسل کے افراد اور فوج کے افسران اس پر وارفتگی کے ساتھ ٹوٹے پڑتے تھے، اور ہر ذہین، انقلاب پسند اور حالات میں تبدیلی کا خواہشمند اس کو پورے ذوق کے ساتھ قبول کرنے پر آمادہ تھا، ان مسائل پر کثرت سے کتابیں شائع ہو رہی تھیں جن کو نوجوان اپنے فکری بلوغ کے قریب زمانہ میں پڑھتے، اس کو پوری طرح ہضم کرتے اور وہ ان کی فکر اور عقیدہ اور زندگی کی تمناؤں اور حوصلوں کا ایک جزو لاینفک بن جاتیں، وہ ان فلسفوں کو

ملک کی ترقی اور آزاد ترقی یافتہ ملکوں کی صف میں جگہ پانے کے لئے واحد راستہ سمجھتے، مروجہ نظام تعلیم تربیت ورہنمائی کا پورا ڈھانچہ، شائع ہونے والا لٹریچر کسی میں یہ صلاحیت نہ تھی کہ ان فرسودہ روایتی اور تقلیدی نظاموں منصوبوں اور طریقوں کے علاوہ جو اس سے قبل کمال اتاترک نے اپنے ملک میں آزمائے تھے، ان نوجوانوں میں کوئی اور بلند تر فکر اور تخیل پیدا کرسکیں، وہ قومیت کا نام بدل[1] کر اس تحریک اور منصوبہ کی تقلید اپنے ملک میں کرنا چاہتے تھے، وہ اس میں سوشلزم کا بھی پیوند لگاچکے تھے، جو کمال اتاترک کے عہد میں اتنی واضح اور طاقتور اور صاف شکل میں نہ آیا تھا، اور اس نے لوگوں کے افکار وخیالات اور ذہنیت پر اس قدر تسلط حاصل نہیں کیا تھا، اس طبقہ کو اب صرف اس بات کا انتظار تھا کہ اس کو عالم عربی کی قیادت حاصل ہو اور وہ اس فکری منصوبہ کو عملی جامہ پہنا سکے۔

۲۳ جولائی ۱۹۵۲ء کا انقلاب مصر قدرتی طور پر کامیاب رہا اور ہر اس شخص نے جو ان غلط حالات میں تبدیلی کا خواہشمند اور ملک کا بہی خواہ تھا، اور ملک کی قوت وآزادی اور ترقی کا طلب گار تھا، اس انقلاب کا خیر مقدم کیا، مختلف حلقوں اور مختلف انداز فکر رکھنے والے اشخاص نے اس انقلاب سے مختلف قسم کی امیدیں وابستہ کرلیں، اس انقلاب کے لئے یہ ممکن تھا کہ وہ مصر کو اس کے مرکزی منصب پر واپس لے آتا اور اس کو عالم اسلام کی تربیت ورہنمائی اور اعتماد واحترام کا بلند درجہ عطا کرتا، اس کے لئے آگے کا راستہ صاف کرتا اور زندگی کا ایک ایسا طریقہ اور نظام تیار کرتا جو مصری قوم کے دینی جذبہ اور عالم عربی کے مزاج (جس کو اللہ تعالیٰ نے صرف دین کے ذریعہ متحد اور طاقتور کرنے کا فیصلہ فرمایا ہے) سے ہم آہنگ ہوتا، اسی طرح وہ عہد جدید کے مزاج سے بھی زیادہ میل کھاتا جو قوم پرستی (نیشنلزم) سے بیزار ہوچکا ہے اور اپنے

---

[1] ترکی قوم پرستی کے بجائے عرب قوم پرستی۔

گریز پا سفر میں ان تعصبات سے آگے نکل گیا ہے، جو زبان و نسل اور رنگ اور وطن کی بنیاد پر قائم ہوں، وہ ان تعلقات اور روابط کو رجعت پسندانہ قرار دے رہا ہے، جو انسانی خاندان اور انسانی وحدت کو پارہ پارہ کرتے ہیں، دنیا کو عربوں سے اس سے زیادہ وسیع النظری اور "قومیتِ عربیہ" سے زیادہ ترقی پسندانہ فکر کی امید تھی، وہ انقلابِ مصر کے رہنماؤں سے زیادہ گہری ذہانت، زیادہ ٹھوس اور حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر کی توقع رکھتی تھی، لیکن اس کو مایوسی ہوئی۔

مصری اور عربی سوسائٹی کو مسخ کرنے کی کوشش

جلد ہی معلوم ہو گیا کہ یہ ایک مستقل فلسفہ اور نظریہ اور ایک مکمل منصوبہ ہے جس کو قوم پرستانہ مادی اور اشتراکی بنیادوں پر مصر اور پھر اس کے واسطہ سے پوری عرب دنیا کو بدلنے کے لئے بڑی چابکدستی اور ہنرمندی کے ساتھ تیار کیا گیا ہے جس کے نتیجہ میں یہ سوسائٹی ایک ایسی نئی سوسائٹی میں تبدیل ہو جائے "جو اپنے لئے ایسے نئے اجتماعی تعلقات اور روابط انتخاب کر سکے جن پر نئی اخلاقی قدریں استوار ہو سکیں، اور ایک نئی وطنی ثقافت کے ذریعہ ان کا اظہار ہوتا ہو"[1] ایسی سوسائٹی جو "حریت، سوشلزم اور اتحاد کو زندگی کی اساس اور جد و جہد کے اعلیٰ مقاصد یقین کرتی ہو"[2] اور "مصری جد و جہد کی جڑوں کو وہ فرعونی تاریخ میں تلاش کرے جو مصری اور انسانی تہذیب کی سب سے اولیں بانی تھی"[3] "اور عرب قوم کے لئے" وہ اپنی جد و جہد کا مقصد امتِ عربیہ کی وحدت کو قرار دیتی ہے اور اس کے نزدیک امتِ عربیہ کی وحدت، زبان، تاریخ اور آرزو کی وحدت پر قائم ہے، اسی لسانی وحدت سے فکر و دماغ کی وحدت وجود میں آتی ہے، تاریخی وحدت ضمیر و

---

[1] یہ صدر جمال عبدالناصر کے الفاظ ہیں، جو انھوں نے اپنے مشہور قومی منشور ۲۱ مئی ۱۹۶۲ء میں کہے تھے، دیکھئے "المیثاق الوطنی" باب اول۔ نظرۃ عامۃ [2] ایضاً [3] قومی منشور تیسرا باب۔

وجدان کی وحدت کو جنم دیتی ہے آرزو کی وحدت مستقبل کی وحدت کا سرچشمہ ہے[1]"

جہاں تک مذہب اسلام کا تعلق ہے اور جو ایک چھوٹی سی (غیر مسلم) اقلیت کے سوا تمام عربوں کا دین ہے وہ اس کو بہت سے دوسرے مذاہب کی طرح تصور کرتی ہے اور سب کو ایک صف میں اور ایک سطح پر رکھتی ہے اور سب کے بقاو ترقی کی ضامن اور ان سب کی تاثیر و قوت کی معترف ہے اس کے نزدیک "مذہبی عقیدہ کی آزادی کا تقدس ہماری نئی اور جدید زندگی میں باقی رہنا چاہئے لازوال روحانی قدریں جو مذاہب سے پیدا ہوئی ہیں وہ انسان کی ہدایت اور اس کی زندگی کو ایمان کے نور سے روشن کرنے اور خیر حق اور محبت کے لئے لامحدود قوتیں عطا کرنے کی قدرت رکھتی ہیں[2]"

وہ تمام حقائق و واقعات کو ایک ایسے سوشلسٹ اور مادہ پرست انسان کے نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں جو مذاہب کے صرف مادی پہلو اور ان کی انقلابی قوت اور تاریخ انسانی میں ان کے کردار کو اہمیت دینے کا عادی ہے آخرت اور غیبی حقائق پر ایمان اور عقیدہ کی دینی قیمت اور اخروی ثواب پر اس کا کوئی یقین نہیں ہوتا مصر کا جدید منشور و میثاق (جس کو صدر نے حرف بحرف پڑھ کر سنایا) کہتا ہے۔

"سارے آسمانی مذاہب اپنی حقیقت اور اصل میں انسانی انقلابات ہیں جن کا مقصد انسان کی عزت و بلندی اور خوشحالی ہے اور مذہبی مفکروں کا سب سے بڑا فریضہ یہ ہے کہ وہ دین کے اس جوہر اور حقیقت کی حفاظت کریں[3]"

صدر ناصر جدید عربی سوسائٹی اور اس کے افراد اور حقوق کے متعلق وہ نقطۂ نگاہ رکھتے ہیں جو اسلامی شریعت اور خدا کے مقرر کردہ حدود کی پابند نہیں ہے بلکہ اس کا تعین مغربی سوسائٹی اور جدید فکر کی بنیادوں پر ہوا ہے عورت اس کے نزدیک مرد کے مساوی درجہ

---

[1] نواں باب [2] باب ہفتم [3] ایضاً

رکھتی ہے اور بہت ضروری ہے کہ قدیم بیڑیاں اور بندشیں جو اس کی آزادانہ سرگرمیوں اور ترقی میں رکاوٹ پیدا کرتی ہیں ختم ہو جائیں تاکہ وہ زندگی کی تعمیر میں ایجابی قدم اور عمل کے ساتھ حصہ لے سکے[1]

ان جزئیات اور شواہد سے صرف نظر بھی کر لیا جائے تب بھی اس میں کوئی شبہ نہیں کیا جاسکتا کہ وہ ذہن اور فکر جو اس منشور اور اس کے مرتب میں کارفرما ہے اور جس نے اس کو یہ قالب عطا کیا ہے، وہ خالص مادہ پرستانہ ذہنیت ہے اگر اس منشور سے عرب اور مصر کا لفظ نکال دیا جائے جو بار بار آتا ہے اور جس کی وجہ سے اس ماحول اور اس معاشرہ کا پتہ چل جاتا ہے جس کے لئے یہ منشور مرتب کیا گیا ہے، اور اس کو کسی نا مذہبی (سیکولر) اور سوشلسٹ اسٹیٹ کی طرف منسوب کر دیا جائے تو کچھ فرق نہیں پڑے گا اس لئے کہ یہ سب حکومتیں عقیدہ کی آزادی اور انسان اور تہذیب انسانی پر مذاہب سے پیدا ہونے والی روحانی اقدار کے اثر و تسلط کی معترف ہیں۔

اس انقلاب کے قائدین نے مصری سوسائٹی اور مصری فکر و دماغ کی مکمل تبدیلی اور تشکیل جدید کے لئے بہت مثبت و معین اور ٹھوس قدم اٹھائے جو دراصل پوری عرب قوم کی ذہنیت تبدیل کرنے کا ایک ابتدائی مرحلہ تھا، انھوں نے عربی قومیت پر ایک مذہب اور عقیدہ کی طرح زور دیا، اہل قلم اور ادیبوں نے ایک بلند ترین مقصد اور آدرش کی حیثیت سے اس کے گن گائے ان کو عہد فرعونی پر فخر کرنے اور اس کے احیاء کی دعوت دینے کا موقع فراہم کیا گیا اور ایک قومیت، تہذیب اور ملکی ورثہ کی حیثیت سے فرعونیت کی دعوت دی گئی، کہنے والوں نے یہاں تک کہا کہ "ہم عرب ہیں اور فراعنہ کے فرزند ہیں" "فرعون" کے لفظ میں اب لوگوں کے لئے نفرت و کراہیت کا عنصر اور کسی ننگ و عار کی بات نہیں رہی جس کو قرآن مجید نے ایک دائمی حقیقت بنا دیا ہے،

---

[1] باب ہفتم

اور ہر زمانہ اور ہر ملک میں مسلمانوں کا اس پر ایمان رہا ہے، "عرب" اور "عربیت" کے لفظ خدا کے نام کے ساتھ شریک کئے گئے اور کہنے والوں نے کہا "العزۃ للہ وللعرب" کہ "عزت اللہ کے لئے مخصوص ہے اور عربوں کے لئے" انھوں نے ہر اس شخص کی ہمت افزائی کی جس نے اس میں غلو اور مبالغہ سے کام لیا خواہ وہ الحاد کی حد تک پہونچ گیا ہو، اور اسلام ہی سے خارج ہو گیا ہو انعامات، القاب، تعریف و تحسین اور داد و دہش کے مختلف طریقوں سے ان کی حوصلہ افزائی کی گئی، اہل قلم اور اخبار نویسوں کو اس معاملہ میں بالکل چھوٹ دے دی گئی کہ وہ جو چاہیں لکھیں، رسائل و اخبارات کو اس کی آزادی حاصل ہو گئی کہ دین اور اس کے شعائر کا کھلم کھلا مضحکہ اڑائیں، دین کی بے حرمتی کریں اور سوسائٹی میں بے حیائی، بے راہ روی اور فسق و فجور پھیلائیں، پریس کو قومیانے (NATIONALISE) کرنے سے ان چیزوں میں کچھ اضافہ ہی ہوا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صحافت میں عریاں اور فحش تصویروں گندے اور جنسی افسانوں اور جرائم و جنسی جذبہ کی محرک خبروں اور واقعات کی تعداد بہت بڑھ گئی، اس کا در پردہ مقصد یہ تھا کہ رفتہ رفتہ سوسائٹی اور عقلیت کو بالکلیہ تبدیل کر دیا جائے اور اس پر مادی رنگ اور اشتراکی طرز پوری طرح غالب آ جائے۔

سوسائٹی کی اس ہمہ گیر تبدیلی کے لئے انھوں نے دوسرے متعدد عملی اقدامات کئے، جامع ازہر کے نظام میں تبدیلی کی گئی، شرعی عدالتیں، محکمۂ قضا اور دینی اوقاف کا سلسلہ ختم کر دیا گیا، مخلوط تعلیم، کلچرل تقریبات اور رقص و سرود کے ساتھ غیر معمولی دلچسپی کا مظاہرہ کیا گیا۔

مصری انقلاب اور قیادت کا عالم عربی پر برا اثر

وہ تمام زندہ دل اور حوصلہ مند نوجوان جن کو عربوں کی عزت و سربلندی کی فکر تھی اور وہ ان کو طاقتور اور متحد شکل میں دیکھنا چاہتے تھے، وہ "قومیت عربیہ کے علمبرداروں" کو اپنا

آدرش سمجھنے لگے ان کی محبت کا دم بھرنے لگے اور اس تحریک کو عربی روح کی ایک نئی بیداری اور "نشأۃ ثانیہ" تصور کرنے لگے جو ان کے نزدیک عربوں کو قدیم سیادت وقیادت اور ماضی کی شوکت وسطوت کے منصب پر واپس لاسکتی ہے، اس میں نہ تعجب وحیرت کی کوئی بات ہے نہ تنقید اور ملامت کا کوئی جواز، قوت وعزت اور غلبہ واقتدار حاصل کرنے کی خواہش فطری اور قدرتی ہوتی ہے، عرب نوجوانوں کو بھی اس کی خواہش کرنے اور پوری طاقت کے ساتھ عرب ممالک اور ریاستوں میں اتحاد پیدا کرنے کی کوشش کا حق ہے لیکن اس حقیقت کا ایک رنج دہ پہلو یہ ہے کہ اس رجحان اور طریق فکر کے ساتھ آخر میں کچھ ایسے واقعات، اقدامات اور روح وتعلیماتِ اسلامی کے منافی مقاصد شامل ہو گئے، جو اسلام کے اثر کو کم کرتے ہیں اور عرب عوام اور قائدین کا رشتہ عالمگیر اسلامی برادری سے منقطع کرتے ہیں، وہ ان کے اندر عرب قوم پرستی، اس کے تقدس کا خیال اور اس سے قلبی وروحانی وابستگی پیدا کرتے ہیں، جو ایک مستقل بالذات فکر ونظریہ اور عقیدہ ومذہب کا خاصہ ہے، اس کا نتیجہ ہے کہ عالم عربی کے اہم اور مرکزی شہروں میں تعلیم یافتہ نوجوانوں میں الحاد غیر معمولی تیزی کے ساتھ پھیلنا شروع ہو گیا ہے، اور عرب قومیت کے پرجوش حامیوں اور داعیوں کے منھ سے ایسے الفاظ نکلنے لگے ہیں جن سے کفر اور ارتداد کا اندیشہ ہوتا ہے، انھوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو تنہا ذریعۂ نجات سمجھنا اور اس حیثیت سے دیکھنا چھوڑ دیا کہ آپ انسانوں کی عزت وسربلندی اور عربوں کی عظمت ودوام کا سرچشمہ اور منبع ہیں، انھوں نے اپنی تہذیبی ترقی اور قوت وعظمت کے حصول کے لئے ماضی بعید کی تاریک راہوں میں تلاش وجستجو کی، اگر جاہلیت عرب کی کبھی مذمت وتحقیر کی جاتی ہے اور اس پر کوئی شدید تنقید ہوتی ہے تو ان کو گرانی ہوتی ہے، اور بعض اوقات اس کا ردعمل ہوتا ہے اور جاہلی عصبیت (حمیۃ الجاهلیۃ) پیدا ہو جاتی ہے اور وہ اس کی طرف سے مدافعت کرنے لگتے ہیں۔

فکری ارتداد کا پیش خیمہ

یہ عالم عربی میں ایک وسیع فکری، ثقافتی اور دینی ارتداد کا پیش خیمہ ہے، جس کا تدارک اور تلافی عربوں کی بڑی سے بڑی قومی عزت و سربلندی، مضبوط سے مضبوط عرب حکومت اور عظیم سے عظیم تر عرب اتحاد اور "وفاق" سے بھی نہیں ہو سکتی، یہ اتنا بڑا خسارہ ہے، جس کے مقابلہ میں کوئی خسارہ نہیں، اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ ان کو ذلت پر ذلت، اپنے مسائل و مقاصد میں ناکامی پر ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے اور وہ ایک لامتناہی اختلاف و انتشار کا شکار ہو کر رہ جائیں، ان پر اللہ تعالیٰ کا یہ قول صادق آئے :-

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا ﴿١٠٣﴾	(اے پیغمبر!) تو کہہ دے ہم تمہیں خبر دے دیں کون
الَّذِينَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا	لوگ اپنے کاموں میں سب سے زیادہ نامراد ہوئے؟ وہ
وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا ﴿١٠٤﴾	جن کی ساری کوششیں دنیا کی زندگی میں کھوئی
أُولَٰئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ	گئیں اور وہ اس دھوکے میں پڑے ہیں کہ بڑا اچھا
وَلِقَائِهِ فَحَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ	کارخانہ بنا رہے ہیں، یہی لوگ ہیں کہ اپنے پروردگار کی
فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ	آیتوں سے اور اس کے حضور حاضر ہونے سے منکر ہوئے،
وَزْنًا ﴿١٠٥﴾	پس ان کے سارے کام اکارت گئے اور اسی قیامت کے
(سورۃ الکہف)	دن ہم ان (کے اعمال) کا کوئی وزن تسلیم نہیں کریں گے!

تشکیک کی سرگرم مہم اور عرب ممالک کا ذہنی انتشار

مصر کے ادباء (جن میں عیسائی اہل قلم پیش پیش رہے ہیں) بہت طویل عرصہ[1] سے تشکیک کی

---

[1] یہ وقفہ رفاعہ بک الطہطاوی، قاسم امین، احمد لطفی السید سے لے کر طٰہٰ حسین اور محمد حسین ہیکل تک پھیلا ہوا ہے۔

مہم میں مصروف ہیں، وہ اپنی تحریروں اور ادبی و علمی مباحث کے راستہ سے دینی عقائد، تاریخی مسلمات، اسلامی شخصیات، اخلاقی قدروں، اجتماعی اصولوں اور اخلاق عامہ سب چیزوں کو مشکوک اور ناقابل اعتبار قرار دے رہے ہیں، نہ صرف ان کے اسالیب بیان بلکہ ان کے محرکات و عوامل بھی اکثر مختلف ہوتے ہیں، کبھی وہ یہ کام محض تجدد پسندی کے شوق اور یورپ کی انتہا پسندانہ تقلید میں کرتے ہیں، کبھی محض شہرت طلبی اور جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں میں ہر دلعزیز و مقبول ہونے کے لئے اور کبھی تجارتی ذہن کے ساتھ اپنی کتابوں کی اشاعت اور مالی منفعت کے حصول کے لئے، کبھی اس کے پیچھے عجلت پسندی اور جلد چھپنے کا شوق ہوتا ہے، البتہ عیسائی ادباء و مصنفین کے مقاصد اس سلسلہ میں زیادہ دور رس واقع ہوئے ہیں، ان کا خاص مقصد یہی ہوتا ہے کہ اسلام کے بارہ میں شبہات پیدا کئے جائیں اور اس پر اعتماد متزلزل کیا جائے، مصر میں نشر و اشاعت کی طاقتور تحریک اور بڑے بڑے اشاعتی اداروں کی موجودگی سے ان کے کام میں بڑی سہولت پیدا ہوئی، اور ان کے کام کی رفتار تیز تر ہوگئی، مستزاد یہ کہ یہ اشاعتی ادارے زیادہ تر عیسائی یا مارونی لوگوں کے ماتحت چل رہے ہیں، اور دوسری طرف پورا عالم عربی مصر سے شائع ہونے والی ہر چیز کو (قطع نظر اس کے کہ وہ اچھی ہو یا بری) ہاتھوں ہاتھ لینے کے لئے ہمہ وقت تیار رہتا ہے۔

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مصر میں نئی نئی مطبوعات و تصنیفات کا ایک سیلاب امنڈ پڑا ہے، یہ مطبوعات زیادہ تر جدید ترین اسلوب اور طباعت کے اعلیٰ معیار کی حامل ہوتی ہیں، نئی نسل ان نئی کتابوں پر نہ صرف فریفتہ ہے بلکہ اس کی صدائے بازگشت بن گئی ہے اور اس کے راستہ سے نہ صرف مصر بلکہ دوسرے تمام عربی ممالک میں بھی ایک زبردست فکری انتشار پیدا ہو گیا ہے، وہ بنیادیں بالکل متزلزل ہو گئی ہیں جن پر وہ باشعور و باصلاحیت معاشرہ قائم ہو سکتا تھا جس کو اپنے عقیدہ، شخصیت اور تاریخ پر ناز ہو اور اس سے اس کو کارزار حیات میں قوت مقابلہ و ثابت قدمی

مکروہات پر صبر، دین کی حمیت، عزت و ناموس کا پاس اور خودداری کا احساس حاصل ہو سکے، اس کی جگہ شک و اضطراب، بزدلی، خوف و "وہن[1]" عافیت پسندی اور راحت کوشی نے لے لی ہے تشکیک کی اس زبردست اور منصوبہ بند کوشش کے نتیجہ میں، اور اس سستے ادب کے اثر سے جو جنسی جذبات اور نفسانی تسلی کے اصول پر قائم ہے، پوری عرب قوم اس معنوی قوت سے محروم ہوتی جا رہی ہے، جو نازک وقتوں میں کسی قوم کا سب سے بڑا سہارا اور سب سے مؤثر طاقت ہوتی ہے، تشکک و ذہنی انتشار نے تاریخ کے ہر دور میں مختلف قوموں کو سخت نقصان پہونچایا ہے، بہت سی تہذیبیں اور قدیم تمدن محض اس کی وجہ سے بالآخر صفحۂ ہستی سے مٹ گئے، یہ صورت حال جو اس وقت عالم عربی میں پائی جاتی ہے اور جس کے پیدا کرنے میں سب سے بڑا ہاتھ نشر و اشاعت اور ترجمہ و تصنیف کی تحریک اور ڈراموں، افسانوں، ناولوں اور ٹیلیویژن اور ریڈیو کا ہے، ۵ جون ۱۹۶۷ء کے المناک حادثہ کا سب سے اولیں سبب ہے، اور اس کے بعد سے جو افسوسناک حالات جاری ہیں، ان سب کی ذمہ داری اسی پر ہے۔

اس کے برعکس "اخوان المسلمون" کی تحریک نے مضبوط عقیدہ، دین پر اور اس کی صلاحیت اور مستقبل پر اعتماد اور اخلاقی استقامت کی ایک ایسی لہر پیدا کی تھی جس نے اس کے پیرؤوں کے دل میں عقیدہ و اصول کی خاطر جاں فروشی کا جذبہ، ملت کی عزت و آبرو کے لئے جان و دل سے قربانی کا حوصلہ اور جوانمردی و خطر پسندی کی وہ اعلیٰ صفات پیدا کر دیں جن کی جھلک ۱۹۴۸ء کی جنگ فلسطین میں نمایاں طریقہ پر نظر آئی لیکن جب عالم عربی اس تحریک کی قیادت سے (مختلف وجوہ کی بنا پر جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں) محروم ہو گیا، اور وہ ۱۹۶۷ء کی جنگ میں اپنا کردار ادا کرنے سے باز رکھی گئی، اور کوئی ایسی جماعت بھی میدان میں نہیں آئی جو

---

[1] حدیث شریف میں "وہن" کی تشریح یہ آئی ہے "دنیا سے محبت اور موت سے نفرت" (ابوداؤد)

اسلام کے نام پر اپیل کرتی ہو ایمان اور اسلامی شجاعت پر بھروسہ رکھتی ہو دوسری طرف عربی قومیت، اشتراکیت اور کمیونزم کی تحریکیں بھی قدرتی طور پر اس خلا کو پر کرنے سے قاصر رہیں اور عربوں میں اسلامی جوش پیدا کرنے اور منتشر عالم عربی کو متحد و یکجا کرنے میں ناکام رہیں تو شکست کا حادثۂ فاجعہ پیش آگیا جس نے مشرق و مغرب کے ہر مسلمان کا سر نیچا کر دیا، اور عربوں کی پیشانی پر ایک ایسا داغ لگایا، اور ایسی تلخ یاد چھوڑی جس کو بھلانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ عربوں کو اس زبردست شکست سے کہیں بڑھ کر فتح حاصل ہو۔

گھاٹے کا سودا

مصر کو جو مدت دراز سے عرب دنیا کی علمی، فکری، ادبی اور بڑی حد تک دینی رہنمائی بھی کرتا رہا ہے مکمل لا مذہبیت، غالی عرب قوم پرستی اور پُر جوش اور پُر عزم اشتراکیت کے خطوط پر چلنے کا خالص مادی و سیاسی نقطۂ نظر سے کوئی جواز ہو سکتا تھا، اگر مصر کے رہنماؤں (اور زیادہ صحیح الفاظ میں مصر کے تنہا رہنما جمال عبد الناصر کو) عربوں کے لئے سربلندی کا مقام حاصل کرنے اور مصر کی عزت کو چار چاند لگانے میں وہ کامیابی حاصل ہوتی جو کمال اتاترک کو نازک ترین گھڑی اور نامساعد حالات میں ترکی کی عزت کو بچانے کی وجہ سے ترکی میں حاصل ہوئی تھی، یہ ایک طبقہ کے لئے ان عظیم قربانیوں کی قیمت ہو سکتی تھی جو مصر کو اس دور قیادت میں پے در پے پیش کرنی پڑیں، اس کو اپنے ان بہت سے لائق فرزندوں سے محروم ہونا پڑا (جو قومی، سیاسی، علمی اور دینی حیثیت سے اس کے لئے بہت مفید ہو سکتے تھے) اس کو اپنے اسلامی جذبات اور اخوتِ اسلامی کے اس احساس میں جو قدیم زمانے سے مصر کا شعار رہا ہے، بہت نیچی سطح پر اترنا پڑا بلکہ اس سے دست بردار ہونا پڑا اس کو سخت معاشی مشکلات سے گذرنا پڑا اس کو پریس، اظہار خیال

کی آزادی سے محروم ہونا پڑا جو کسی ملک کے لئے ایک بڑی نعمت اور مصر کا خاص طور پر طرۂ امتیاز رہا ہے، عالم اسلامی سے اس کے رشتے کمزور اور ہمسایہ عرب ممالک سے اس کے تعلقات مجروح ہوگئے عالم اسلامی میں اس کی دینی شہرت کو اور عالم عربی میں اس کی قائدانہ حیثیت کو دھبہ لگا سوئز کے کامیاب معرکہ (۱۹۵۶ء) کے بعد اس نئی قیادت نے پریس اور ریڈیو کی طاقت سے اور اپنی اس طاقت لسانی اور بلند آہنگی سے جس میں مشکل سے کوئی مشرقی ملک اس کا حریف اور ہمسر ہو سکتا ہے، دنیا کو یہ تاثر دیا کہ مصر سارے عرب کا نجات دہندہ ثابت ہو سکتا ہے، اور وہ صرف اسرائیل ہی کی چھوٹی سی ریاست نہیں بلکہ بڑی مغربی طاقتوں سے بھی پنجہ آزمائی کر سکتا ہے یہاں تک کہ اس نے (مئی ۱۹۶۷ء میں) آبنائے تیران اور خلیج عقبہ کی ناکہ بندی کر لی اور ساری دنیا کی نگاہیں سوئز کے معرکہ کے بعد پھر اس پر لگ گئیں لیکن دنیا کو اس وقت سخت مایوسی اور حیرت کا سامنا کرنا پڑا جب ۵ جون ۱۹۶۷ء کو اسرائیل نے اچانک جمہوریہ عربیہ متحدہ پر حملہ کر دیا اور فوراً ہی مصری فوجوں کے پسپائی کی خبریں آنے لگیں، اس حملہ سے چند گھنٹوں کے اندر مصر کی فضائی طاقت کا خاتمہ ہو گیا، اور چار پانچ دن کے اندر اندر جمہوریہ عربیہ نے جو جنگ کی قیادت کر رہا تھا، بلا شرط جنگ بندی قبول کر لی، اسرائیل کا نہ صرف غزہ اور شرم الشیخ پر قبضہ ہوا اور نہ صرف جزیرہ نمائے سینا کو اس نے اپنے تسلط میں لے لیا بلکہ سوئز کی پوری مشرقی پٹی پر وہ قابض ہو گیا اور مصر اس کے توپوں کی زد میں آ گیا اس وقت حقیقت بیں اور انصاف پسند مشاہدین کو اس کا پورا احساس ہوا کہ مصر نے ایمانی و اخلاقی طاقت اور اسلامی حمیت کو مسلسل نظر انداز کر کے جو اس کی طاقت کا بہت بڑا سرچشمہ تھا، اور خالص مادہ پرستانہ نقطۂ نظر اپنا کر کچھ فائدہ نہیں اٹھایا، لوگوں کو یہ بھی محسوس ہوا کہ عرب قوم پرستی اور اشتراکیت ایک ہوا بھری ہوئی مشک کی طرح تھی جس کی سوئی چھوتے ہی ساری ہوا نکل گئی یہ بھی دنیا کو

اندازہ ہوگیا کہ یہ سارا کھیل ایک خارجی طاقت (سوویت روس) اور نازک بین الاقوامی حالات کے بھروسہ پر کھیلا گیا تھا جو وقت پر کام نہ آیا، اس وقت عالم عربی کو جس مایوسی اور ذلت کا سامنا کرنا پڑا بیت المقدس کے نکل جانے کی وجہ سے تمام دنیا کے مسلمانوں کو جو روحانی صدمہ اور ذلت کا احساس ہوا اور شریک جنگ عرب طاقتوں پر جو بے بسی اور بے چارگی کا عالم طاری ہے اس کی مثال تاتاریوں کے ہاتھوں عالم اسلام کی ذلت اور سقوط بغداد کے واقعہ کے بعد اسلامی تاریخ میں نہیں ملتی، اس سے یہ حقیقت روز روشن کی طرح واضح ہوگئی کہ عربوں کی قسمت اسلام کے ساتھ وابستہ کردی گئی ہے اور ان ممالک میں کوئی ایسی تحریک یا در کوشش کامیاب نہیں ہوسکتی جس کی بنیاد خالص مادہ پرستی اور اسلام سے اعراض پر ہو، اس سے مشہور عرب مؤرخ فلسفی ابن خلدون کی اس رائے کی بھی تصدیق ہوئی کہ عربوں میں دینی رشتہ کے سوا کوئی رشتہ اتحاد اور قوت نہیں پیدا کرسکتا۔

مصر انور السادات کے عہد میں

۱۹۷۰ء میں جمال عبدالناصر کا انتقال ہوا ۱۹۶۷ء کی شکست کے نتیجہ میں مصر شدید مالی، سیاسی اور نفسیاتی اضطراب میں مبتلا تھا مصری قوم شکست خوردگی کا شکار تھی۔

انور السادات جمال عبدالناصر کے جانشین ہوئے، انور السادات دوسرے لیڈروں کے مقابلہ میں جو قیادت کے امیدوار تھے، اعتدال پسند اور دین کے بارے میں ان کے رجحانات غیر جارحانہ تھے، ان کے مقابلہ میں جو امیدوار تھے، وہ بائیں بازو کے رجحانات کے حامل تھے، جن کی پشت پناہی روس کر رہا تھا، انور السادات کے انتخاب میں مغربی طاقتوں کا بھی ہاتھ تھا۔

اقتدار میں آنے کے کچھ عرصہ بعد انور السادات نے جمال عبدالناصر مخالف عناصر کی

ہمت افزائی کی، اور یساری (LEFTIST) رجحانات کو دبانے کی کوشش کی سیاسی قیدیوں کو رہا کیا ان میں اخوانی بھی تھے، پریس کو قدرے آزادی دی، اور آہستہ آہستہ سیاسی جماعتوں کو کام کرنے کی اجازت دی، لیکن اس محدود آزادی کے ساتھ پولیس اور سکیورٹی فورس کا وہ نظام باقی رکھا جو جمال عبدالناصر کے عہد سے ملک میں قائم تھا۔

اس محدود آزادی کے نتیجہ میں دینی تحریکوں نے دوبارہ کام شروع کیا، اخوانیوں نے اپنا ضبط شدہ رسالہ "الدعوۃ" دوبارہ جاری کیا، الدعوۃ کی پہلی اشاعت کا جس طرح ملک میں استقبال کیا گیا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصری قوم حق کی آواز کے لئے کتنی پیاسی تھی، پہلی اشاعت کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے، بعض ایڈیشن بازار میں آتے ہی ختم ہو گئے۔

مصر کی یونیورسٹیوں میں اسلامی ذہن کے طلباء یونین کے انتخابات میں غالب آگئے تقریباً ساری یونیورسٹیوں میں ان کا قبضہ ہو گیا، عبدالناصر کے عہد کے مظالم پر کتابیں شائع ہوئیں اور ہر کتاب کے کئی کئی ایڈیشن شائع ہوئے، اور عوام میں مقبول ہوئے، عوام نے شریعت کے نفاذ پر زور دینا شروع کیا، اور یہ مطالبہ طاقت پکڑتا گیا، اس کی قوت کے پیش نظر حکومت کے ذمہ داروں نے اس سلسلہ میں مثبت رویہ اختیار کیا، لیکن بالواسطہ اس رجحان پر کنٹرول کرنے کی کوشش جاری رہی، اس لئے کہ دینی ذہن کے اس فروغ کو مصری حکومت اپنے لئے سیاسی طور پر خطرناک تصور کرتی تھی، یساری عناصر سے کشمکش کے پیش نظر اس کے لئے یہ بھی ممکن نہ تھا کہ وہ دینی ذہن کو براہ راست کچلنے کی کوشش کرے، روس کے منفی رویہ اور یساریوں کی اس کے ساتھ ہمدردی نے انور السادات کو ایسے اقدامات پر مجبور کیا جو دینی عنصر کی تقویت کا باعث بنے۔

انور السادات کو جو جمال عبدالناصر کے ہر منصوبہ میں شریک بلکہ مشیر کی حیثیت رکھتے

تھے اخوان کی طاقت کا صحیح اندازہ تھا، اور وہ دینی ذہن کو اپنے لئے خطرہ سمجھتے تھے انھوں نے اس کے مقابلہ کے لئے اپنے نئے آقا امریکہ کو خوش کرنے کے لئے عیسائیوں کی ہمت افزائی کی اور ان کی تقویت کا راستہ اختیار کیا، بابا شنودہ کو جو اقلیتی رہنما کی حیثیت رکھتے تھے مساوی حقوق نہیں بلکہ امتیازی حقوق عطا کئے، بابا شنودہ نے عیسائیوں کے لئے مزید حقوق کا مطالبہ کیا' شریعت کی تنفیذ کا جب مطالبہ ہوا تو انھوں نے پرزور طریقہ پر اس کی مخالفت کی، امریکہ سے تعلقات میں اضافہ کے ساتھ عیسائی اثرات میں برابر اضافہ ہوتا رہا (امریکن "جامعہ امریکیہ" یونیورسٹی) کے موجود ہوتے ہوئے ایک خالص عیسائی یونیورسٹی قائم کرنے کا مطالبہ کیا گیا، اور امریکہ نے اس کے سارے مصارف برداشت کرنے کا وعدہ کیا، انور السادات نے اس کو منظور کر لیا۔

مصر کے ان نئے رجحانات کا خارجی سیاست پر یہ اثر پڑا کہ افریقہ کے ممالک میں ان اسلامی تحریکوں سے مصر نے چشم پوشی اختیار کی جو عیسائی حکومتوں کے خلاف تھیں اور بعض موقعوں پر اسلامی تحریکوں کے کچلنے میں مصر نے عیسائی حکومت کی مدد کی، مکاریوس جلاوطنی کے عہد میں جب مصر گئے تو ان کا شاہانہ استقبال کیا گیا، حکومت کے اس منفی رویہ اور عیسائیوں کے ساتھ غیر معمولی رعایت اور ان کی پشت پناہی اور سیاسی آزادی کے ساتھ اخوان کے ساتھ امتیازی سلوک نے دینی حلقوں میں انور السادات کو مشکوک بنا دیا جمال عبدالناصر کے عہد میں اسلامی ذہن کے لوگوں پر مظالم اور بربریت کے ذمہ داروں کے ساتھ نرم رویہ بلکہ تجاہل نے انور السادات کو مزید مشتبہ کر دیا، جس کے نتیجہ میں انور السادات اسلامی ذہن کے لوگوں میں غیر مقبول ہو گئے۔

۱۹۷۳ء کی جنگ نے جس میں مصر کو نمایاں کامیابی حاصل ہوئی تھی جس سے مصر نے

اپنا کھویا ہوا وقار بڑی حد تک بحال کر لیا تھا مصر کو عالم عربی کی قیادت کا بہترین موقع فراہم کیا سعودی عرب کی تائید اور پٹرول کی جنگ نے عربوں کو ایک متحدہ محاذ کی شکل میں کھڑا کر دیا تھا ان کی تادیبی کارروائیوں نے بڑی طاقتوں کے اعصاب متأثر کر دیئے، دنیا کی ساری توجہ عربوں کے اقدام پر مرکوز ہو گئی تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دنیا کے مستقبل کا انحصار عربوں کے اقدام پر ہے اس موقع پر اتحاد اسلامی کا جو مظاہرہ ہوا اس کی گذشتہ تاریخ میں بہت کم مثالیں مل سکتی ہیں، لیکن بعد کے بعض اقدامات نے عرب قیادت کی جلد بازی اور حکمت عملی کی کمی اور دشمنوں پر اعتماد کا ایسا مظاہرہ کیا جس سے عالم اسلام کو سخت مایوسی ہوئی، مصر نے جنگ کے فوراً بعد اسرائیل سے انفرادی طور پر صلح کی کوشش شروع کر دی۔

۱۹۷۳ء کی جنگ اور اس کے بعد اتحاد محض اسلامی روح کا مرہون منت تھا جس کا اعتراف مصری قیادت نے شروع میں کھل کر کیا، لیکن بہت جلد انور السادات نے اس رخ کو موڑنے کی کوشش کی، اس لئے کہ وہ جمال عبدالناصر کی طرح دینی رجحان کے لوگوں کے بارے میں خوف کی نفسیات کا شکار تھے، انھوں نے اس کی کوشش کی کہ اس جنگ سے اور کمیونسٹوں کی مخالفت سے دینی ذہن کو فروغ حاصل ہو رہا ہے، اس کو بڑھنے سے روکا جائے۔

۱۹۷۷ء میں جماعت التکفیر والہجرۃ کے قضیہ نے انور السادات اور ان کے ماتحت حکام کی دینی دشمنی کو عیاں کر دیا، ڈاکٹر حسین الذہبی کے قتل کو دینی تحریکات کے خلاف پروپیگنڈہ کے لئے جس طرح استعمال کیا گیا اور دین کے خلاف کھل کر صحافت میں مہم چلائی گئی اور علماء کی اور دینی کتابوں کی بے حرمتی کی گئی اس سے یہ بات صاف ظاہر ہو گئی کہ انور السادات دین کے بارے میں وہی تصور رکھتے ہیں، جس کے مغربی مفکرین داعی ہیں، یعنی محدود عبادات اور سیاست اور زندگی سے اس کی مکمل بے دخلی۔

یہ بات ذہن میں رکھی جائے کہ انور السادات ذاتی طور پر مذہب دشمن نہیں ہیں اور جمال عبدالناصر کے برخلاف وہ نماز روزہ کی کسی حد تک پابندی بھی کرتے ہیں اسی سے بعض لوگوں کو ان کے بارے میں خوش فہمی ہوگئی اور انھوں نے ان کو "الرئیس المؤمن" کا لقب دے دیا اس میں کوئی شک نہیں کہ ان پر ملحد ہونے کا الزام نہیں لگایا جاسکتا لیکن ان کے خود بیانات سے ان کے دین کے تصور کی تشریح ہوتی ہے، وہ دین سے مراد مجرد دین لیتے ہیں اسلام نہیں، اسی لئے انھوں نے کچھ عرصہ ہوا، ایک ایسی عبادت گاہ کا تصور پیش کیا جس میں مسلمان، عیسائی اور یہودی عبادت کرسکیں، تاکہ تینوں مذاہب "بقائے باہم" کے اصول پر قائم رہیں مصری ریڈیو سے تلاوت قرآن کریم کے موقع پر ایسی آیتوں کی تلاوت سے حتی الامکان احتراز کیا جاتا ہے جن میں عیسائیوں کے خلاف کسی طرح کا مواد ہو، ایسی کتابوں کی اشاعت، یہاں تک کہ یونیورسٹی میں ڈاکٹریٹ کے ایسے موضوعوں پر مناقشہ ممنوع ہے، جن میں عیسائیت کے خلاف کچھ کہا گیا ہو۔

انور السادات نے اپنی کتاب "البحث عن الذات" میں لکھا ہے (اور اس کا ذکر انھوں نے اپنی تقریروں میں بھی کیا ہے) کہ وہ کمال اتاترک سے بچپن ہی سے متأثر تھے ان کی تحریروں سے مغربی تمدن اور تصور زندگی سے تأثر ظاہر ہوتا ہے اس کے مقابلہ میں مشرقی تمدن کے بارے میں احساس کہتری کا اظہار ہوتا ہے ان کی زندگی کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ مغربی تمدن اور دین کے محدود تصور کے قائل ہیں جس میں بہرحال اسلام کی بالادستی یا اس کا زندگی سے تعلق ناقابل تسلیم ہے اس لئے انھوں نے اپنے عہد میں ان جماعتوں یا شخصیات کو آزادئ رائے یا آزادئ عمل نہیں دی جن سے ان کے اس تصور کو نقصان پہونچتا ہو اس طرح ان کی دینی تحریکات سے کشمکش اسی دائرہ میں رہی جس دائرہ میں جمال عبدالناصر کے عہد میں تھی۔

جماعۃ التکفیر والہجرۃ کے ذمہ داروں کو سرسری مقدمہ کے بعد پھانسی دے دی گئی اور اس قضیہ کو دین اور سیاست کو جمع کرنے کی سازش کہا گیا، اس کے بعد ایسے لوگوں پر سختی کی گئی، جو تحریکی ذہن رکھتے تھے، انور السادات کے اس ذہن کی وجہ سے وہ مصری علماء جو عبدالناصر کے عہد میں مصر سے باہر چلے گئے تھے، مصر واپس آنے میں متردد تھے، بعض علماء جو مصر میں موجود تھے، مصر چھوڑنے پر مجبور ہوئے۔

انور السادات نے امن منصوبہ کو قبول کر کے اور اسرائیل جا کر مسلمانوں سے ہی نہیں بلکہ عربوں سے بھی اپنے کو منقطع کر لیا، اس کے نتیجہ میں ان کو امریکہ پر مزید اعتماد کرنا پڑا، اس کے بعد کیمپ ڈیویڈ (CAMP DAVID) معاہدہ ہوا جس کی پورے عالم میں مخالفت کی گئی، اور اس کو ذلت و رسوائی کے معاہدہ سے تعبیر کیا گیا، اس معاہدہ کے نتیجہ میں ان کے یہودیوں سے تعلقات کی وہی نوعیت پیدا ہو گئی، جو پہلے عیسائیوں سے تھی، اور اسلامی حلقوں سے اسی قدر دوری، اسلامی حلقوں کی طرف سے مخالفت کے نتیجہ میں ان کے خلاف تشدد اور گرفت میں مزید اضافہ ہوا، اور دونوں حلقے دو مخالف کیمپوں میں بٹ گئے، اور اس طرح ۱۹۷۳ء کی جنگ کے نتیجہ میں جو اتحاد اسلامی وجود میں آیا تھا، وہ خود انور السادات کے اقدامات سے پارہ پارہ ہو گیا، اور مصر سے قیادت کی جو توقعات وابستہ کی گئی تھیں، وہ منقطع ہو گئیں۔

مصر کا یہ المیہ ہے کہ انقلاب مصر سے قبل اور انقلاب مصر کے بعد مصری حکومتوں نے اپنا اصل حریف دینی عنصر کو سمجھا، اور اپنی ساری توانائی ان کے اثر کو کم کرنے میں صرف کی، اللہ تعالیٰ نے مصر کو جو علمی، فوجی، تمدنی اور فکری صلاحیتیں عطا فرمائی تھیں، جو اس میں خود اعتمادی اور عزم اور قوت عمل اور قیادت کی صلاحیت کی ضامن ہو سکتی تھیں، وہ سب اس کشمکش کی نذر ہو گئیں، اور مصر پورے عہد میں فکری تضاد اور اخلاقی افلاس

میں مبتلا رہا ہے اور منبع قوت کے تعاون سے محروم[1] لیکن مصر کے لئے یہ ایک غیر طبعی صورتِ حال ہے، اس کی اسلامی روح اور اس کا دینی ضمیر یقیناً اس کے خلاف بغاوت کرے گا اور جس ملک کو کنانۃ الاسلام کہا گیا ہے اور جس میں عالمِ عربی کی قیادت کی سب سے زیادہ صلاحیت ہے، ایک نئی طاقت بن کر ابھرے گا۔

شام وعراق

فرانسیسی اور برطانوی اقتدار سے آزاد ہونے کے بعد سے مسلم عرب آبادی کی غالب اکثریت[2] کے یہ دونوں سرسبز و زرخیز عرب ملک جو اپنی شاندار اسلامی و تہذیبی تاریخ رکھتے ہیں اور جو علی الترتیب طویل مدت تک خلافتِ اسلامی کا مرکز رہ چکے ہیں، مختلف سیاسی ادوار اور جلد جلد ہونے والے خون آشام فوجی انقلابات سے گذرے، یہ دونوں مسلم عرب ملک مغرب کے گہرے ذہنی و اخلاقی و معاشرتی اثرات کی جولان گاہ ہیں، جدید تعلیم یافتہ طبقہ سیاسی رہنماؤں اور اہلِ حکومت کا رجحان برابر عرب نیشنلزم، لا مذہبیت (سیکولرازم) و تجدد و مغربیت کی طرف ہوتا جا رہا ہے اگرچہ دونوں ملکوں میں عوام سیدھے سادے سچے مسلمان اور دین سے محبت رکھنے والے ہیں، بہت سی قدیم روایات دونوں جگہ قائم ہیں، خاصی بڑی تعداد میں ایسے جید علماء اور ممتاز فاضل موجود ہیں جن کی نظیر دوسرے ملکوں میں ملنی مشکل ہے، لیکن روز بروز عام معاشرہ سے دین کی گرفت ڈھیلی ہوتی جا رہی ہے اور علماء اور اہلِ دین کا اقتدار روبہ زوال ہے، عورتوں میں آزادی اور بے پردگی عام ہوتی جا رہی ہے،

---

[1] مصر کی موجودہ صورتِ حال کا یہ جائزہ مولوی واضح رشید ندوی استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء اور مدیر "الرائد" کے قلم سے ہے جو انھوں نے مصنف کی فرمائش پر کتاب کے نئے ایڈیشن کے لئے لکھا۔

[2] شام میں مسلمانوں کی آبادی کا تناسب ۹۰ فی صدی اور عراق میں ۹۳ فی صدی ہے۔

کلچرل پروگرام، آزادانہ تفریحی مشاغل، مردوں عورتوں کا اختلاط روزافزوں ہے، مخلوط تعلیم کا رواج عام ہو رہا ہے، اور مذہب بیزار اور لادینی عناصر غالب اور زندگی پر حاوی ہوتے جارہے ہیں۔

اس المیہ کی آخری کڑی یہ ہے کہ ان سطور کے لکھنے کے وقت خالص اسلامی عقیدے اور مسلم اکثریت کا یہ ملک اس فرقہ اور اقلیت (نصیری فرقہ) کے زیر اقتدار ہے جس نے صحیح اسلامی تعلیمات کا کبھی اثر قبول نہیں کیا، یہ اقلیت جو مسلمان عوام کی طرف سے ہمیشہ سے بغض و کینہ اور سخت عداوت کی حامل رہی ہے، اس اقلیت نے اپنے فوجی پیشے عسکری تفوق اور اس میدان میں دوسری جماعتوں کے مقابلہ میں زیادہ حصہ لے کر ملک کے اقتدار اعلیٰ پر اپنا تسلّط قائم کر لیا، سابقہ اسلامی حکومتوں نے اس فرقہ کی صحیح تعلیم اور اس میں دین صحیح کی اشاعت پر کوئی توجہ نہیں کی، اس لئے وہ ہر زمانے میں ملک کی وحدت و سالمیت کے لئے خطرہ بنا رہا، اور غیر اسلامی و بیرونی طاقتوں سے ساز باز کرتا رہا۔[1]

اس کی ایک نہایت عبرتناک مثال یہ ہے کہ بعث پارٹی عرصہ تک عراق کی سیاست و حکومت پر حاوی رہی ہے، اور ان سطروں کی تحریر کے وقت تک شام پر اسی کی حکومت ہے، اس پارٹی کا نعرہ اور مینی فسٹو یہ ہے:۔

"ایک ابدی پیغام رکھنے والی ایک عرب قوم وہ اس خطۂ ارض کو اپنا وطن عربی سمجھتی ہے جس میں عرب قوم بستی ہے، اور وہ حصۂ زمین وہ ہے جو طوروز اور پشتکویہ کے پہاڑوں، خلیج بصرہ اور بحرعرب، حبشہ کے پہاڑوں اور صحرائے اعظم، بحر اٹلانٹک اور بحر روم کے درمیان واقع ہے"

ذیل میں پارٹی کے منشور سے بعض اہم اقتباسات دیئے جارہے ہیں، جس سے اس کے

---

[1] اس کی تفصیل ابن کثیر کی "البدایۃ والنہایۃ" میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے حالات، شیخ ابوزہرہ کی کتاب "ابن تیمیہ" اور مؤلف کی کتاب "تاریخ دعوت وعزیمت" دوم میں ملے گی۔

فکر و روح کا اندازہ ہو سکتا ہے :۔

(۱) ــــ عرب قوم ایک ثقافتی وحدت ہے، اور اس کے فرزندوں کے درمیان تمام اختلافات وامتیازات[1] سطحی اور بے اصل ہیں جو عربی وجدان کی بیداری کے ساتھ خود بخود زائل ہو جائیں گے۔

(۲) ــــ عرب قوم ایک ابدی پیغام کی حامل ہے، جو تاریخ کے مختلف مرحلوں میں بدلتی ہوئی اور پختگی حاصل کرتی ہوئی شکلوں میں ظاہر ہوتا ہے، اور انسانی اقدار کی تجدید، بنی نوع انسان کی ترقی کی ہمت افزائی اور اقوام عالم میں تعاون و ہم آہنگی کی ہمت افزائی کرتا ہے۔

(۳) ــــ حزب البعث ایک قوم پرست جماعت ہے جو اس بات پر عقیدہ رکھتی ہے کہ قومیت ایک ازلی اور زندہ حقیقت ہے، اور یہ کہ باشعور قومی احساس جو فرد کو جماعت سے ملاتا ہے، وہ ایک مقدس احساس و شعور ہے، تخلیقی قوتوں سے مالا مال قربانی پر ابھارنے والا، احساس ذمہ داری پیدا کرنے والا اور فرد کی انسانیت کی عملی اور مفید رہنمائی کرنے والا ہے۔

(۴) ــــ حزب البعث ایک اشتراکی جماعت ہے جس کا عقیدہ یہ ہے کہ اشتراکیت ایک ایسی ضرورت ہے جو عرب قومیت کے باطن سے پیدا ہوتی اور ابھرتی ہے، اس لئے کہ یہی وہ بہترین نظام ہے جس میں عرب قوم کی صلاحیتوں اور عبقریت کی تکمیل کا سامان ہے۔

(۵) ــــ قومی رابطہ ہی عربی حکومت میں واحد موجود رابطہ ہے جو اہل وطن میں ہم آہنگی اور اتحاد پیدا کر سکتا ہے، اور ان کو ایک قوم کی شکل میں ڈھال سکتا ہے، اور تمام مذہبی، قبائلی، نسلی اور وطنی تعصبات سے برسرپیکار رہے۔

(۶) ــــ پوری آزادی کے ساتھ عرب حکومت کے لئے ایک واحد قانون بنایا جائے گا، جو عصر حاضر کی روح کے مطابق ہو اور عرب قوم کے ماضی کے تجربات کی روشنی میں وضع کیا گیا ہو۔[2]

---

[1] مثلاً مذہبی امتیازات! [2] ماخوذ از "الاحزاب السیاسیۃ فی سوریا"

اس انجمن کے بانی اور دماغ ایک عیسائی فاضل میشیل عفلق ہیں، انھوں نے اپنی کتاب "فی سبیل البعث" میں اپنے خیالات وافکار کا کھل کر اظہار کیا ہے اس کے جستہ جستہ اقتباسات پیش ہیں :-

"یہ قدرتی طور پر بالکل ممکن ہے کہ کوئی شخص بھی خواہ وہ محدود سے محدود صلاحیت رکھتا ہو محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) کی حقیر اور دھندلی تصویر بن سکے جب تک وہ ایک ایسی قوم سے تعلق رکھتا ہے جس نے اپنی ساری قوتیں اور صلاحیتیں جمع کر کے محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) کو پیدا کیا یا زیادہ مناسب الفاظ میں جب تک وہ شخص اس قوم کا فرد ہے جس کے لئے محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) نے اپنی ساری قوتیں جمع کر دیں اور اس کی تخلیق کی کسی زمانہ میں ایک شخص کے اندر پوری قوم کی زندگی مجسم ہو گئی تھی اور آج اس کی ضرورت ہے کہ اس قوم کی جو نئی ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہے پوری زندگی اس عظیم الشان شخصیت کی زندگی کی تفصیل اور امتداد بن جائے، محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) کل عرب تھے آج کل عربوں کو محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) ہو جانا چاہئے"[1]

"اسلام کو فتحیاب اور غالب ہونے میں جو اتنی تاخیر ہوئی وہ دراصل اس وجہ سے تھی کہ عرب اپنی ذاتی کوشش اور جدوجہد اور خود اپنے وجود اور دنیا کے باہمی تجربات اور امتحانات کے نتیجہ میں اور بہت سی آزمائشوں اور تکلیفوں، امید و ناامیدی اور کامیابی و ناکامی کے بعد حقیقت تک پہونچ جائیں یعنی ایمان خود ان کے اندر سے پیدا ہو اور وہ ایمان تجربہ سے ملا ہوا، زندگی کی گہرائیوں سے وابستہ حقیقی ایمان بن سکے، اس لحاظ سے اسلام ایک عربی تحریک تھا، اور اس کے معنی تھے عربیت کی تجدید اور تکمیل"[2]

---

[1] صـ ۴۵ [2] صـ ۵۲

"اسلام عرب قوم کے جذبۂ ابدیت ووسعت کا بہترین اظہار وتعبیر ہے، اور اس لحاظ سے وہ اپنی حقیقت میں عربی ہے، اپنے مثالی مقاصد میں انسانی ہے، پس اسلام کا پیغام درحقیقت انسانی عربی اخلاق ہے۔"[1]

"اس لئے وہ معنی جس کو اس اہم تاریخی دور میں اور ترقی وتغیر کے اس نازک مرحلہ میں اسلام آشکارا کر رہا ہے یہ ہے کہ ساری قوتیں عربوں کی طاقت بڑھانے اور ان کو ترقی دینے پر صرف کی جائیں اور یہ ساری قوتیں عرب قومیت کے دائرہ کے اندر محصور ہوں۔"[2]

"یورپ میں خالص قومی نظریہ منطقی بنیاد پر قائم ہے، جب کہ قومیت کا مذہب سے انفصال طے شدہ امر بن چکا ہے، اس لئے کہ یورپ میں مذہب باہر سے آیا ہے، اور اس کے مزاج اور تاریخ کے لئے اجنبی ہے، اور وہ عقیدۂ آخرت اور اخلاق کا خلاصہ ہے، وہ نہ ان کے ماحول کی ضروریات کا آئینہ دار ہے، نہ ان کی تاریخ کے ساتھ وابستہ ہے، جب کہ اسلام عربوں کے لئے صرف ایک اخروی عقیدہ یا بعض اخلاقیات کا مجموعہ نہیں بلکہ وہ زندگی کے بارہ میں ان کے نقطۂ نظر، ان کے کائناتی شعور کا فصیح ترین ترجمان اور ان کی شخصیت کی وحدت کی طاقتور تعبیر ہے جس میں الفاظ شعور اور فکر کے ساتھ وابستہ اور پیوست ہیں۔"[3]

شام کی بے بسی اور بعث پارٹی کی ناکامی

بدقسمتی سے یہ طرز فکر اور یہ فلسفۂ حیات شام کے فوجی حلقوں اور یونیورسٹی کے فضلاء میں روز بروز مقبول ہوتا چلا گیا، ملک کی آبادی کے ان عناصر نے جو مختلف عقائد ومذاہب کے پیرو تھے، اور شروع سے فوج پر حاوی رہے ہیں، ان کو دل وجان سے قبول کیا، پچھلے چند برس سے

---

[1] ص۴۳ [2] ص۴۳ [3] ص۴۹

شام پر اسی پارٹی اور اسی مکتب خیال کے پیروؤں کا اقتدار چلا آرہا ہے لادینی سیاست عرب قوم پرستی اور اشتراکی رجحانات ملک پر اتنے حاوی اور قابو یافتہ ہو گئے کہ اسلام پسندوں اور کسی دوسرے نقطۂ نظر کے حامیوں کا اس ملک میں رہنا اور اپنے خیالات کی تبلیغ کرنا قریب قریب ناممکن ہو گیا، اور وہ بڑی تعداد میں ترک وطن کر کے دوسرے عرب ملکوں یا یورپ میں منتقل ہو گئے، شام (جو کبھی دینی علوم اور اسلامی فکر کا مصر کے بعد دوسرا مرکز شمار ہوتا تھا) اپنے مایۂ ناز علماء، مفکرین، اہل قلم اور دینی قائدین سے محروم ہو گیا، ملک کی باگ ڈور نوجوان طبقے کے ان افراد کے ہاتھ میں آ گئی جن میں نہ ذہنی پختگی تھی نہ انتظامی تجربہ، نہ دماغی اعتدال و توازن، یہ ملک جو کبھی اپنی سرسبزی و خوشحالی کے لئے مشہور تھا، معاشی بدحالی سے دوچار ہوا' ملک کے سرمایہ کا بڑا حصہ روز روز پیش آنے والے انقلابات کی وجہ سے باہر منتقل ہو گیا، قومیت، خالص مادی طرز فکر اور اشتراکیت کا نشہ اتنا تیز ہو گیا کہ نوجوان اہل قلم اور حکومت و فوج کے بعض ذمہ دار دینی تصورات اور ادیان سماوی کے مشترک مسلمات کا کھلے طریقہ پر مذاق اڑانے سے بھی باز نہیں رہے، اس رجحان و طرز فکر کا ایک نمونہ شام کے سرکاری فوجی رسالے (جیش الشعب) کے ایک مضمون میں دیکھا جا سکتا ہے جو فوج کے ایک رکن کے قلم سے ہے، یہاں اس کے چند اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں:۔

"عرب قوم نے الٰہ (معبود) سے مدد طلب کی، اسلام اور مسیحیت کی قدیم قدروں کو ٹٹولا جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام سے مدد چاہی ازمنۂ وسطیٰ کے بعض معروف نظاموں کا تجربہ کیا، لیکن ان سب سے اس کو ذرہ برابر بھی فائدہ نہ ہوا، اس کے بعد عرب قوم نے اپنی کمر ہمت کس لی اور اپنی نظر بلند کر کے بہت دور نظر دوڑائی اور اپنے اس نوزائیدہ بچہ کو دیکھنے کی کوشش کی جو اس سے آہستہ آہستہ قریب ہو رہا ہے، یہ نوزائیدہ بچہ نیا اشتراکی عرب انسان" ہے۔

وہ تمام بیمار و لاغر قدریں جو معاشرہ میں پائی جاتی ہیں دراصل جاگیرداری سرمایہ داری اور استعمار کی پیدا کردہ ہیں۔

وہ قدریں جنھوں نے "عرب انسان" کو ایک سست کاہل پست ہمت معطل اور تقدیر کے سامنے سر جھکا دینے والا انسان بنا دیا ہے ایک ایسا انسان جس کو بس صرف "لاحول ولا قوۃ الا باللہ العظیم" کہنا آتا ہے۔

نئی قدریں جو نیا عرب انسان پیدا کریں گی وہ خود اس ستم رسیدہ اور باغی انسان کے اندر سے ابھری ہیں، ایک بھوکے، ایک نئے انقلابی، اور اشتراکی انسان کے وجود سے پیدا ہوئی ہیں، جو انسان اور صرف انسان پر عقیدہ رکھتا ہے۔

عربوں کی تہذیب کی تعمیر اور عربی معاشرہ کی تشکیل کا واحد راستہ ایک نئے اشتراکی عرب انسان کی تخلیق ہے جس کا عقیدہ یہ ہو کہ اللہ، مذاہب جاگیرداری وسرمایہ داری، استعمار غرض وہ ساری قدریں جو قدیم سوسائٹی پر حکمراں تھیں صرف تاریخ کے میوزیم کی ممی کی ہوئی لاشیں ہیں۔

جب ہم یہ شرط لگاتے ہیں کہ ہمارے نئے انسان کو ساری سابق قدروں کا انکار کر دینا چاہیے تو ہم پر یہ بھی لازم ہے کہ اس کو کچھ نئی متعین قدریں دیں اور وہ ہے نئے قدری انسان پر ایمان مطلق وہ انسان جو صرف اپنے وجود پر اپنے عمل پر اور اس چیز پر جو وہ انسانیت کو عطا کرتا ہے اعتقاد رکھتا ہے اس لئے کہ وہ جانتا ہے کہ اس کا لازمی انجام موت ہے موت کے سوا کچھ نہیں پھر نہ دوزخ ہوگی نہ جنت، بلکہ وہ ایک ذرہ ہو جائے گا، جو زمین کے ساتھ گردش کرتا رہے گا، اس لئے کہ وہ اس پر مجبور ہے کہ جو کچھ اس سے ہو سکے وہ بلا کسی اجرت اور معاوضہ کے (مثلاً جنت میں کوئی چھوٹی سی جگہ) اپنی قوم اور اپنی انسانیت کو پیش کر دے[1]!

---

[1] ماخوذ از مقالہ بعنوان "الانسان العربی الجدید" از ابراہیم خلاص رسالہ "جیش الشعب" دمشق۔

عرب قوم پرستی اور اشتراکیت کے عین اس جوش اور شباب کے زمانے میں اسرائیل و عرب کی جنگ پیش آگئی اور شام کو دوبدو اس حریف سے لڑنا پڑا جس کو وہ ابھی تک للکارتا رہا تھا، اور جس کے مقابلے اور جس کی سرکوبی کے لئے وہ قومیت عربیہ کا نعرہ بلند کرتا رہا تھا، لیکن اس جنگ کے نتیجہ میں نہ صرف یہ کہ شام اپنی سرحدوں کی حفاظت نہیں کر سکا بلکہ حریف اس کی سرزمین میں دور تک گھس آیا اور وہ اس کا کچھ بگاڑ نہ سکا، اب وہ بھی ایک بے بسی کے عالم میں اپنے اشتراکی سرپرستوں اور قومیت عربیہ کے علمبرداروں کی مدد کے لئے ہاتھ پاؤں مارتا ہے، معاشی، سیاسی اور فوجی لحاظ سے وہ خستہ و درماندہ نظر آتا ہے یہ پیشین گوئی کرنی مشکل ہے کہ وہ ان پیچیدہ حالات سے کس طرح عہدہ برآ ہوگا، اسی کے ساتھ وہ شامی نوجوان جن کے اندر ایمان کی چنگاری ہے، اور وہ اس ملک کو آسانی کے ساتھ لادینیت اور دینی و دنیوی خسران کے گود میں جاتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے، اس ملک میں سردھڑ کی بازی لگائے ہوئے ہیں، نوجوان مردوں اور تعلیم پانے والی لڑکیوں میں ایک حیرت انگیز دینی بیداری پیدا ہو رہی ہے، اس بیداری اور بیزاری کو کچلنے کے لئے حکومت کی طرف سے وہ سب کچھ کیا جا رہا ہے، جو شاید بڑی سے بڑی مخالف اسلام طاقت نہ کرتی۔

معاشی بدحالی اور بے اعتمادی

مصنف کو رجب ۱۳۹۳ھ ۔ اگست ۱۹۷۳ء میں شام کو دیکھنے اور دمشق میں کچھ وقت گزارنے کا موقع ملا تھا، اور اس سفر کے کچھ تاثرات اپنے سفرنامے "دریائے کابل سے دریائے یرموک تک" میں درج کئے تھے ان سے بھی اس خطرے کی تائید ہوتی ہے، جسے مصنف نے گذشتہ سطور میں ظاہر کیا ہے یعنی شامی قوم کو اشتراکیت سے کوئی فائدہ نہ پہونچنے کا خطرہ، مصنف نے لکھا تھا:۔

"ان لیڈروں کا نعرہ تھا، روٹی، بھوکے کے لئے ایک لقمہ، قوم کی بنیادی ضروریات کی فراہمی فٹ پاتھ کے آدمی کی کفالت اور ان کی تگ و دو بھی انہی مقاصد کے حصول کے لئے تھی جب یہ مقاصد ہی حاصل نہ ہوئے تو

اس کا کھلا مطلب یہ ہے کہ یہ فلسفے "کوہ کندن کاہ برآوردن" کے مصداق ہیں اور اشتراکیت، قومیت اور کمیونزم سب کے سب غیر عقلی اور غیر انسانی فلسفے اور نظام ہائے حیات ہیں جو محض خوش عقیدگی، خوش فہمی اور جذباتیت پر مبنی ہیں، جن کو عقل، عمل، تجربہ اور نتائج کی کسوٹی پر نہیں پرکھا جا سکتا، یا سلبی اصول و مبادی ہیں، جن کا مقصد تخریب یا نظام سے راہِ فرار اختیار کرنے کے سوا کچھ نہیں[1]"

مصنف نے اس سفر میں بغداد بھی دیکھا اور اس سفر پر اپنے تاثرات لکھے تھے، یہاں پر اس کا ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے:-

"جب میں بغداد کی سڑکوں پر ٹہلتا تھا، لوگوں کی باتوں کو سنتا اور ان کے چہرے کو پڑھتا نیز اپنے اس دورے کے بعض مخصوص تجربات کی روشنی میں ایسا محسوس ہوتا تھا کہ عبدالکریم قاسم کے انقلاب سے پہلے ملک زیادہ خوشحال اور مستحکم تھا، قوم میں آج سے زیادہ آزادی، بے فکری اور اعتماد تھا، ۱۹۵۶ء میں جب میں بغداد آیا تھا، تو کسی طرح کے دباؤ، پابندی اور پہرہ کا احساس نہیں ہوا تھا، میں پوری آزادی سے بغداد اور بیرون بغداد گھومتا پھرتا تھا، جس سے چاہتا ملاقات کرتا، اور جو چاہتا مجھ سے ملاقات کرتا، اور کسی طرح کی باز پرس کا اندیشہ نہ ہوتا..... آخر ان لوگوں کو ان ہونناک انقلابات سے کیا ملا، جو حالات کو سدھارنے، قوم کو ظلم واستبداد کے آہنی پنجے سے آزاد کرنے اور اس کی فطری حریت کو بحال کرنے کے لئے رونما ہوئے تھے؟[2]"

رہی سہی کسر عراق نے (اکتوبر ۱۹۸۰ء میں) ایران پر حملہ کرکے پوری کردی، جس کا نتیجہ دونوں ملکوں کی تباہی، اور اسلام اور مسلمانوں کی بدنامی اور رسوائی کے سوا بظاہر کچھ نظر نہیں آتا۔

ایران

ایران نے بھی ترکی کے نقشِ قدم پر اپنے ملک کا ذہنی اور تہذیبی سانچہ بدلنے کی کوشش اور "اصلاحات" کے سلسلہ کا آغاز کیا، اس سلسلہ کا آغاز سابق شاہِ ایران رضا شاہ پہلوی (۱۹۲۵ء-۱۹۴۱ء) نے اپنے عہدِ حکومت میں کر دیا تھا، اور اس کے لئے کچھ سوچے سمجھے قدم اٹھائے تھے جن کے نتائج ایرانی معاشرہ میں بہت گہرے اور دوررس ہوئے، کیلی فورنیا یونیورسٹی کے پروفیسر (GEORGE LENCZOWSKI) نے اپنی کتاب "مشرقِ وسطیٰ عالمی مسائل میں"

---

[1] دریائے کابل سے دریائے یرموک تک ص۱۶۱ [2] ایضاً ص۱۲۲-۱۲۳

(THE MIDDLE EAST IN WORLD AFFAIRS) میں تاریخی طور پر اس کی روداد پیش کی ہے:۔

"رضا شاہ کے اصلاحی منصوبے ایران کی صنعتی ترقی کے دائرہ تک محدود نہیں تھے، انھوں نے ملک کو تعلیمی ــــــ اور معاشرتی میدانوں میں بھی عصر جدید کے مطابق اور ماڈرن (MODERN) بنانے کی کوشش کی ۱۹۲۷ء میں انھوں نے فرانس کا عدالتی نظام اور قانون جاری کیا، اس طرح انھوں نے معاشرتی اور شہری معاملات میں ملکی عدالتوں کی اہلیت اور لیاقت کو چیلنج کیا، ملک کو سیکولر بنانے کا رجحان صاف نمایاں تھا، لیکن یہ بات اس نسبت سے کھل کر کبھی سامنے نہ آئی جیسی ترکی میں تھی، انھوں نے محسوس کر لیا تھا کہ "غیر ترقی یافتہ" شیعہ علماء کا اثر و نفوذ ملک کو مغربیت کے سانچہ میں ڈھالنے کے کام میں سدِ راہ ہے، انھوں نے احتیاط کے ساتھ قدم اٹھایا، اس ہنگامۂ احتجاج کی ناکامی سے جو ۱۹۲۴ء میں جمہوریت کی حمایت میں ہوا تھا، نیز ہمسایہ ملک (افغانستان) کے حکمراں امیر امان اللہ خاں کی اس ناکامی سے جو ان کو اپنی اصلاحات میں اٹھانی پڑی تھی انھوں نے یہ سبق لیا کہ جو ایک نیم مغربی ملک ترکی میں ممکن تھا، وہ ابھی ایران میں ممکن نہیں، مزید برآں ایران کے دستور میں یہ بات صراحت کے ساتھ موجود تھی کہ ایران کا سرکاری مذہب اسلام ہے اور اس کا مستند فرقہ جعفریوں کا ہے، شاہ ایران کو اسی عقیدہ کا پیرو اور مبلّغ ہونا چاہیے اسی طرح سے اس دستور کی رو سے "مجلس ایران" (ایرانی پارلیمنٹ) کو کسی ایسے قانون کے منظور کرنے کا اختیار نہیں جو اسلام کے اصول کے خلاف ہو، کسی قانون کے منظور کرنے کے لئے ماہرین دینیات کا اس کارروائی میں شریک ہونا ضروری ہے، ان مراحل سے گذرنے کے بعد یہ قانون لازمی ہوگا، شاہ کو اس بات کا احساس تھا کہ وہ کھلے طریقے پر ان قانونی دفعات کی خلاف ورزی نہیں کر سکتے، اس کے نتیجے میں انھوں نے سامنے آکر حملہ کرنے کے بجائے

سیاسی ترکیبوں سے کام لیا انھوں نے مذہبی پیشواؤں کی صاف صاف مزاحمت کرنے کے بجائے ان کو نظر انداز کرنا زیادہ مناسب سمجھا۔

جدید عصری تعلیمی نظام کو قائم کرنے اور عورتوں میں آزادی و بیداری پیدا کرنے کے لئے جو کوشش بھی کی جاتی اس کا انحصار اس پر تھا کہ مذہبی پیشواؤں کا اثر و رسوخ کم ہو' اس میدان میں جنگ کے دوران میں خاصا کام کر لیا گیا۔

۱۹۳۰ئہ سے پرائمری اور سکنڈری اسکولوں میں دینیات کی تعلیم لازمی نہیں رہی اور نصاب تعلیم میں حب الوطنی اور شہریت کا احساس پیدا کرنے پر زور دیا گیا کھیلوں کی ہمت افزائی کی گئی متعدد نئے طرز کے اسٹیڈیم (STADIUM) بڑے بڑے شہروں میں بنائے گئے، حکومت نے بوائے اسکاؤٹ (BOY SCOUT) اور گرل گائڈ (GIRL GUIDE) تنظیموں میں شرکت نوجوانوں کے لئے لازمی قرار دی تاکہ نئی نسل میں قوم پرستی کی روح بیدار ہو' ان سرگرمیوں نے کھلے طریقہ پر ملک کے نوجوانوں کو مذہبی مشاغل اور مذہبی طریقہ پر سوچنے سے دور کر دیا، ۱۹۲۸ئہ میں مشرقی لباس کی ممانعت کر کے مذہبی اثر و نفوذ پر انھوں نے کاری ضرب لگائی، ترکی ٹوپی اور پگڑی کی جگہ پہلے پہلوی ہیٹ نے لی پھر کچھ عرصہ کے بعد یورپین ہیٹ اس کی جگہ آگئی، شاہ نے عورتوں میں آزادی اور بیداری پیدا کرنے کے لئے مختلف طریقے اختیار کئے، ان کے ایماء اور اثر سے پارلیمنٹ نے طلاق دینے کے اختیار کو جو مردوں کو کلی طور پر حاصل تھا محدود و مقید کر دیا، عورتوں کو مختلف دفاتر اور محکموں میں ملازمت کرنے کی آزادی حاصل ہو گئی، اگرچہ سیاسی تقریبات میں ان کو نمائندگی کا اب بھی اختیار نہیں تھا، فوجی افسروں اور سرکاری عہدیداروں کو ہدایات دے کر عورتوں کے مغربی لباس اختیار کرنے کی ہمت افزائی کی گئی ۱۹۳۵ئہ میں خود ملکہ ایران

اور شہزادیوں نے مغربی لباس کے ساتھ ایک عمومی تقریب میں شرکت کی اس وقت سے برقع ممنوع قرار پایا، اس کے نتیجہ میں کچھ فسادات ہوئے لیکن حکومت کے انتظامات سخت تھے، اور بالآخر سب کو قانون کے سامنے سر جھکانا پڑا۔

شاہ کی طرف سے زبان پر بھی نظر ثانی کا کام شروع کیا گیا، اس کا مقصد یہ تھا کہ فارسی کو عربی کے اثرات سے پاک کیا جائے، یہ ایران کی اس ادبی مجلس (ACADEMY OF LITERATURE) جو ۱۹۳۵ء میں قائم ہوئی تھی، کا خاص کام قرار پایا، باوجود اس کے کہ عربی رسم الخط فارسی زبان کی ضروریات کو پورا نہیں کرتا، البتہ ترکی کے برخلاف ایران میں رسم الخط کی اصلاح نہیں ہوئی، مارچ ۱۹۳۵ء میں سرکاری طور پر فارس یا پرشیا کے بجائے (جو یونانیوں کا رکھا ہوا نام ہے)[1] سرکاری طور پر ایران اس ریاست کا نام قرار پایا۔

محمد رضا پہلوی موجودہ شہنشاہ ایران نے یہ سمجھ کر کہ مزید اصلاحات و تغیرات کا وقت آگیا ہے، بعض نئے قوانین و اصلاحات کو دستوری حیثیت دے دی ہے، انھوں نے تنسیخ زمینداری، مالکانِ اراضی کے حقوق ملکیت ختم کرنے، عورتوں کو حق رائے دہندگی اور منتخب ہو سکنے کے حق کو دستوری و قانونی شکل دے دی، ایران کے علماء و مجتہدین نے اس کے خلاف شدید احتجاج اور مظاہرے کئے، ملک میں فسادات اور ہنگامے ہوئے لیکن حکومت کے فیصلہ میں کوئی فرق نہیں ہوا۔[2]

روشن پہلو

لیکن ایران اسلامی علم و ادب اور اسلامی فکر و تجربہ کا ایک بڑا میدان رہا ہے،

---

[1] اور قدیم عربی تاریخوں اور اسلامی لٹریچر میں اس کو اسی نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

[2] (THE MIDDLE EAST IN WORLD AFFAIRS - P. 180. 181. 182)

اس کو اپنے شعراء وادباء فلاسفہ ومفکرین اور صوفیائے کرام کی بناء پر جن کا شمار مشکل ہے، اسلامی مشرق کا یونان کہنا بجا ہوگا، وہاں بعض غالی مذہبی خیالات کے باوجود جو ایران کی پچھلی تاریخ کا قدرتی نتیجہ ہے احیاء اسلام اور اتحاد اسلامی کی تحریک پائی جاتی ہے اور وہاں حوصلہ آفریں اور روح پرور اسلامی ادب روز افزوں مقبولیت حاصل کر رہا ہے۔

ایران کا اسلامی انقلاب

ایران میں شاہ ایران کے خلاف سیاسی جدوجہد کے اسباب پر اگر غور کیا جائے تو اس کا اصل سبب شاہ ایران کا ایرانی عوام کے مذہبی اور ثقافتی احساسات اور تقاضوں کے خلاف جارحانہ رویہ معلوم ہوگا جس نے ان کی ساری خدمات اور فوجی، ملکی اور بین الاقوامی سیاست کے میدان میں ان کی کوششوں پر پانی پھیر دیا، ایران کے واقعات نے یہ ثابت کر دیا کہ ملک کے عوام کے جذبات کو مجروح کر کے کوئی قیادت چاہے ملک کی ترقی کے سلسلہ میں اس کی کتنی ہی خدمات ہوں مقبولیت حاصل نہیں کر سکتی۔

شاہ ایران نے اپنے آخری دور میں ایران کو فوجی لحاظ سے اتنا مضبوط کر دیا تھا کہ وہ اس علاقہ میں فیصلہ کن پوزیشن حاصل کرنے لگا تھا اس کے علاوہ شاہ ایران سیاسی سوجھ بوجھ سے بین الاقوامی مسائل میں موثر رول ادا کر رہے تھے، ملک خوشحالی کے راستہ پر گامزن تھا، تمدنی لحاظ سے ایران کا شمار ترقی یافتہ ملکوں میں تھا، تعلیم کے اعتبار سے اس علاقہ میں ایران بہت سے ملکوں سے آگے تھا، طلبہ کی ایک بڑی تعداد غیر ملکی یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کر رہی تھی ایسی صورت میں ملک کو کسی حال میں اجتماعی، یا اقتصادی لحاظ سے پس ماندہ نہیں کہا جا سکتا تھا، لہذا عوامی بیزاری کا سبب اقتصادی یا سیاسی پسماندگی

کو قرار نہیں دیا جا سکتا محض شاہی نظام بھی اس کا سبب نہیں ہو سکتا اس لئے کہ بعض ترقی یافتہ ملکوں میں شاہی حکومت موجود ہے اور وہاں کوئی بیزاری نہیں پائی جاتی اس لئے محض شاہی نظام حکومت کو اس سیاسی اُبال کا سبب نہیں قرار دیا جا سکتا، یہ بھی ذہن میں رکھنا چاہئے کہ ایرانی قوم کے مزاج میں شخصیت پرستی کا اثر ہر دور میں پایا گیا ہے اور شاہی نظام اس مزاج کے عین مطابق تھا، پھر آخر اس سیاسی تحریک کا سبب کیا تھا؟

سیاسی جدوجہد میں جو نعرہ سب سے زیادہ موثر ثابت ہوا اور جس نے پورے ملک کو شاہ ایران کے خلاف صف آرا کیا وہ نعرہ اسلامی نظام قائم کرنا تھا، اس نعرہ کی ضرب شاہی نظام پر اتنی نہیں پڑتی تھی جتنی شاہ ایران کی مذہب مخالف سیاست پر اس کی ضرب پڑتی تھی، شاہ ایران کی علیحدگی اس نظام کو قائم کرنے کے لئے محض ایک وسیلہ تھی اس لئے کہ ملک میں مذہب اور اسلامی ثقافت کے خلاف جو رجحان پیدا ہوا تھا، وہ شاہ ایران اور ان کے ہم نشینوں کی مغرب کی غلامی کے نتیجہ میں پیدا ہو رہا تھا۔

شاہ ایران جن کی تربیت غیر اسلامی ماحول میں ہوئی تھی، مغرب کی ثقافت اور اس کے تصورحیات کو ایران میں رائج کرنا چاہتے تھے اور ایران کو اسی رنگ میں رنگنا چاہتے تھے، انھوں نے اپنے عہد میں ایسے کئی اقدامات کئے جن سے مذہبی رہنماؤں کو اس کا پوری طرح سے اندازہ ہو گیا کہ وہ ایران سے مذہبی رجحان کو پوری طرح سے مٹانا اور اسلامی تشخص کو ختم کرنا چاہتے ہیں، یہودیوں اور بہائیوں پر پورا اعتماد کر کے انھوں نے ملک کا نظام اسلام دشمن طاقتوں کے ہاتھ میں دے دیا تھا، قوم کا اسلام سے رشتہ ختم کرنے کے لئے جس طرح مصر کے حکمرانوں نے اپنا فراعنۂ مصر سے انتساب کیا تھا، اسی طرح شاہ ایران نے اپنا انتساب

سائرس سے کیا اس کے لئے انھوں نے ایک تاریخی جشن منایا اور اس پر اربوں روپیہ خرچ کیا اسلامی کیلنڈر کے بجائے قدیم ایرانی کیلنڈر رائج کیا۔

ایرانی عوام ہمیشہ سے اپنے علماء سے وابستہ رہے ہیں، اس لئے شاہ ایران کی ترقی پسندانہ پالیسیوں کی سب سے زیادہ مخالفت علماء ہی کی طرف سے ہوئی، علماء کے اثر کو ختم کرنے کے لئے شاہ ایران نے اوقاف کے نظام میں تبدیلی کی، با اثر علماء کو جلاوطن کر دیا، بڑی تعداد میں علماء گرفتار کیئے گئے، اور اسلام کے احیاء کے لئے جدوجہد کرنے والوں کو سزائیں دی گئیں، اور ہزاروں کی تعداد میں جانی نقصان ہوا لیکن اس تشدد نے عوام کے جذبات میں اور شدت پیدا کر دی پھر آیۃ اللہ خمینی کی قیادت میں جو پیرس میں جلاوطنی کی زندگی گذار رہے تھے، ایرانی عوام نے عظیم قربانی دے کر شاہ ایران کو ملک چھوڑنے پہ مجبور کر دیا اور یکم اپریل ۱۹۷۹ء کو ایران میں اسلامی حکومت کی بنیاد پڑی۔

آیۃ اللہ خمینی کی محیر العقول کامیابی کی مختلف حلقوں میں مختلف توجیہات کی جاتی ہیں، شروع میں اس انقلاب کو یساری (LEFTIST) انقلاب کہا گیا، شاہ ایران نے بھی اس کو یساری تحریک کہہ کر کچلنے کی کوشش کی تھی لیکن انقلاب کے فوراً بعد جو طاقت آزمائی ہوئی اس میں اسلامی عنصر جس کی قیادت علماء کر رہے تھے، غالب آ گیا اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس تحریک کے پیچھے صرف اسلامی عنصر تھا۔

ایرانی علماء کے شعور اور قوت تنظیم اور عوام پر ان کی گرفت اور کنٹرول انقلاب کی کامیابی کے اہم اسباب ہیں جس کو کسی حال میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، اس کے ساتھ عوام کی ان کے ساتھ وابستگی اور ان کے راستے میں بے دریغ قربانی دینے کا جذبہ اپنی مثال نہیں رکھتا۔

آیۃ اللہ خمینی کے نظریات

آیۃ اللہ خمینی جو ایرانی انقلاب کے روح رواں ہیں، اسلام کے بارے میں سیاسی نقطۂ نظر رکھتے ہیں، وہ دراصل سیاسی رہنما ہیں جن کی تحریک کی اساس اسلامی ہے، ان کا تصور دوسرے علماء سے مختلف ہے، وہ عبادات سے زیادہ اجتماعی تشکیل نو چاہتے ہیں، عبادات کا تصور ان کے نزدیک اسلامی تعلیمات میں موجود ہے، اور اسلام کا وہ جزءِ زندگی میں ہر دور میں جاری و نافذ رہا ہے لیکن زندگی میں انقلاب ان کے نزدیک سیاسی شعور اور اجتماعی اصلاح کے بغیر ممکن نہیں ہے، ان کے نزدیک حکمران چاہے، وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم عبادات کو اسی لئے بے خطر سمجھتے ہیں، اس کے مقابلہ میں سیاسی شعور کو اپنے لئے خطرناک تصور کرتے ہیں۔

آیۃ اللہ خمینی اپنی کتاب "اسلامی حکومت" میں اس کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں:

"امپیریلزم کی کوشش یہ ہے کہ ہم صرف نماز روزہ کرتے رہیں، اور ہماری زندگی میں اسلام صرف عبادات تک محدود رہے تاکہ ہمارا اس سے کبھی سیاسی ٹکراؤ نہ ہو۔

امپیریلزم ہم کو دعوت دیتا ہے کہ ہم نماز پڑھتے رہیں جتنا جی چاہے صبح و شام اور ہمارے پٹرول پر اس کا قبضہ رہے، ہماری نماز سے اس کا کوئی نقصان نہیں ہے اگر ہمارے بازار اس کے مال کے لئے ہمارا سرمایہ اس کے تاجروں کے لئے اور مصنوعات کے لئے وقف ہو، اسی لئے حملہ آوروں نے اپنے قوانین، اپنا نظام حیات ہم پر تھوپ دیا اور ہم کو یہ بھلا دیا کہ اسلام زندگی کے لئے ناقابل عمل ہے، وہ ہمارے سماج کی اصلاح نہیں کر سکتا وہ کوئی حکومت نہیں چلا سکتا، اسلام ان کے نزدیک حیض کے مسائل، میاں بیوی کے ازدواجی رشتہ اور اس طرح کے چند مسائل کا نام ہے۔

ہماری ساری پسماندگی کا سبب ان کے نزدیک اسلامی تعلیمات ہیں اس لئے کہ ان میں ان کے نزدیک زندگی کے مسائل نہیں ہیں اس لئے اسلام سے دستبرداری کے بغیر زندگی کے قافلہ کا ساتھ نہیں دیا جاسکتا"

اسلامی حکومت کے قیام پر زور دیتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:۔

"محض قوانین معاشرہ کی اصلاح نہیں کرسکتے اس کے لئے ان کی تنفیذ کی ضرورت ہے اور تنفیذ کے لئے اقتدار کی ضرورت ہے اسی لئے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے دعوت وتبلیغ کے ساتھ ساتھ احکام اسلام کی تنفیذ کی بھی جدوجہد کی یہاں تک کہ اسلامی حکومت وجود میں آگئی"

خمینی کی رائے ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد یہ ذمہ داری ان کے خلفاء اور ان کے بعد ان کے خلفاء اور علماء امت کی ہے، وہ کہتے ہیں:۔

"قوانین اور اجتماعی اصول کے لئے منفذ کی ضرورت ہے کوئی بھی نظام قانون بناکر فارغ نہیں ہوجاتا بلکہ اس کو نافذ کرنے کے وسائل تلاش کرتا ہے قانونی مشینری کے ساتھ تنفیذی مشینری کا وجود لازمی ہے اور یہی مقتضا ہے آیۃ "اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ" کا"

دین کے انحراف کرنے والوں کے خلاف تحریک چلانے کے سلسلہ میں وہ لکھتے ہیں:۔

"شرع اور عقل دونوں ہم پر فرض کرتے ہیں کہ ہم حکومت وقت کو اپنے حال پر نہ چھوڑیں اس کے دلائل موجود ہیں کہ جو حکومت سرکشی کرے وہ طاغوتی نظام ہے اور ہم پر اس کی ذمہ داری ہے کہ اس کے آثار کو اپنے سماج سے اور اپنے ملک سے زائل کردیں اس کے لئے ہمیں ایسی نسل تیار کرنی ہوگی جو طاغوتی نظام کو پاش پاش کردے ہمارے سامنے ایسی صورت

میں صرف ایک ہی راستہ ہے اور وہ ہے باطل سے ٹکر لے کر اس کو اور اس کے ذمہ داروں کو ختم کر دینا اور یہی اسلامی انقلاب ہے جس کی ذمہ داری ہر مسلمان پر ہے"۔

وہ علماء اور فقہاء جو غیر اسلامی حکومت سے تعاون کرتے ہیں اور ان کے حق میں فتوے صادر کرتے ہیں ان کے بارے میں خمینی لکھتے ہیں:۔

"یہ علماء اسلام کے دشمن ہیں ان کی حقیقت کھولنا ضروری ہے عوام کو چاہئے کہ ان کو ذلیل و رسوا کر کے سماج سے نکال دیں ان کی پگڑیاں پھینک دیں اور ان کو دین کے استغلال (EXPLOIT) اور عوام کو بہکانے سے روک دیں"[1]

آیۃ اللہ خمینی نے اپنے ان نظریات سے قوم میں ایک نئی روح پھونک دی انھوں نے اسلام کو زندگی میں نافذ کرنے کا نعرہ دیا قوم نے ان کو اس کا موقع فراہم کر دیا اب ان کی حکمت اور سیاسی تدبر اور حسن تدبیر کا امتحان ہے کہ وہ کس حد تک اپنے مقصد میں کامیاب ہوتے ہیں ان کے لئے ایک بڑا امتحان یہ بھی ہے کہ انتقامی جذبہ کو جو عرصہ سے شاہ ایران اور ان کے ہم نواؤں کے خلاف قوم میں بھڑک رہا تھا کنٹرول میں رکھیں تاکہ قوم کو اس کے نتیجہ میں جانی اور مالی اور فکری نقصان سے بچایا جا سکے، اور ملک کو ترقی کے راستہ پر جلد ڈالا جا سکے لیکن پہلے مرحلہ میں وہ اس کو نہ روک سکے جس کی وجہ سے ملک سیکڑوں باصلاحیت، تجربہ کار شخصیتوں سے محروم ہو گیا، اور عفو و درگذر کے بجائے اسلام کے بارے میں قساوت اور استبداد کا تصور دنیا میں قائم کیا گیا جو دعوتی لحاظ سے ایک بڑا نقصان دہ تصور کہا جا سکتا ہے۔

بعض اوقات بالخصوص امریکی یرغمالیوں کے سلسلہ میں ایران نے جو بے لچک رویہ اختیار کیا ہے اس سے اس شبہ کی تقویت ہوتی ہے کہ ملک ایران کا، اور نتائج و عواقب

---

[1] "الحکومۃ الاسلامیۃ" آیۃ اللہ خمینی۔

پر نظر رکھنے والوں کا پورا کنٹرول نہیں ہے اور ملک میں نوعمر اور جذباتی رجحان رکھنے والے عناصر کا تسلط ہے، اسی طرح امامت اور ائمہ کے بارے میں ان کے بعض ایسے بیانات سامنے آئے ہیں، جن سے مقام نبوت کی تنقیص اور بلا استثناء انبیاء کے اپنے مقاصد کی تکمیل میں ناکام رہنے کا نتیجہ نکلتا ہے۔[1]

اصلاحات کے سلسلہ میں بھی بعض اقدامات میں جلد بازی سے کام لیا گیا جس سے ردعمل پیدا ہوا اور اسلام دشمن طاقتوں کو شماتت کا موقع ملا شریعت کے احکام کے نفاذ میں انھوں نے سنی اقلیت کے احساسات کی رعایت نہیں کی جس کی وجہ سے سنیوں سے ٹکراؤ کی صورت پیدا ہو گئی اس کی وجہ سے اتحاد کی وہ شکل ملک میں باقی نہ رہ سکی جو تحریک کے زمانہ میں نظر آتی تھی۔

خمینی کی انقلاب کی کوشش میں کامیابی، اور اسلامی حکومت کی تاسیس کی وجہ سے ان کو عالم اسلام کے بعض حلقوں میں امام کا درجہ اور مقام دیا گیا، اور بعض حلقوں میں ان کو شیخ حسن البناؒ اور مولانا مودودی کا ہم پلہ قرار دیا گیا لیکن آنے والے دن بتائیں گے کہ انفرادی اور اجتماعی طور پر فکری اصلاح میں وہ کہاں تک کامیاب ہوتے ہیں، اور ان کی جد و جہد محض حکومت قائم کرنے یا ایک جابر حکومت کے خلاف بغاوت کرنے تک محدود رہتی ہے یا ایران کے عوام میں فکری انقلاب بھی ظہور پذیر ہوتا ہے جو حقیقت میں دعوتِ اسلام کا مقصدِ اصلی ہے۔

ابھی ایران کے حالات میں پورے طور پر استقرار پیدا نہیں ہوا تھا کہ دفعتاً اکتوبر ۱۹۸۰ء میں عراق نے اس پر حملہ کر دیا، ایران کی دفاعی طاقت پہلے سے کمزور ہو چکی تھی، اس حملہ نے اس کے اقتصادیات کو بھی بری طرح سے متاثر کیا، ابھی نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اس خطرہ سے کب اور کہاں تک عہدہ برآ ہو سکے گا، اور دنیا کے سیاسی و اخلاقی نقشہ میں اپنا وہ مخصوص کردار ادا کر سکے گا جس کے لئے اس نے ایسی زبردست قربانی دی۔

---

[1] ان سطور کی تحریر تک اس کی کوئی تردید سامنے نہیں آئی ہے۔

انڈونیشیا

تجدد اور مغربیت کے بارے میں آزاد ہونے والے مسلم ممالک کی جو عام روش ہے اور حکومت کے لا مذہبی ڈھانچہ کے ناگزیر ہونے اسلامی قانون کے اس زمانہ میں ناقابلِ عمل ہونے کا عقیدہ اور مغربی افکار و اقدار کے اختیار کرنے کا جو عام رجحان پایا جاتا ہے، انڈونیشیا (جس کی تقریباً ۹۰ فی صد آبادی مسلمان ہے) اس بارہ میں کوئی استثناء نہیں رکھتا، باوجود اس شدید اور طویل خونیں کشمکش کے جو دار الاسلام کی تحریک کی شکل میں برسوں جاری رہی اور اب تقریباً دم توڑ چکی ہے سابق صدر جمہوریہ ڈاکٹر احمد سکارنو کی رہنمائی میں ملک کا حکمراں طبقہ ایک سوچے سمجھے منصوبہ کے ماتحت اس کو ترکی کے نقش قدم پر لے جا رہا تھا، مشہور امریکی مبصر لوئی فشر (LOUIS FISHER) نے اپنی کتاب (THE STORY OF INDONESIA) میں مختصر الفاظ میں اس وقت کی موجودہ صورت حال کا نقشہ کھینچا ہے، اور صاحبِ اقتدار طبقہ کے ذہن کی صحیح ترجمانی کی ہے، وہ لکھتا ہے:

> "تنہا غیر اشتمالی (NON-COMMUNIST) مسلمان ملک جو ایک گہرے تہذیبی انقلاب سے گذرا ہے، وہ ترکی ہے جہاں کمال پاشا اتاترک نے ریاست کا مذہب (اسلام) منسوخ کر دیا، شرعی عدالتیں، خلافت، پردہ، حرم، اور عربی رسم الخط کا استعمال قانوناً ممنوع ہو گیا، اس کے بالمقابل مغربی لباس، لاطینی رسم الخط، عمومی تعلیم، عورتوں کا حق رائے دہندگی، اتوار کی تعطیل اور قوم پرستی کو قانونی حیثیت حاصل ہو گئی۔
>
> جہاں تک انڈونیشیا کا تعلق ہے وہاں ان "اصلاحات" میں سے کسی اصلاح یا تبدیلی کی ضرورت نہیں تھی اس حد تک انڈونیشیا میں خود مغربی انقلاب آ چکا ہے، انڈونیشیا کا جمہوریہ لا مذہبی ہے اگرچہ ۱۹۴۵ء اور ۱۹۵۰ء کے دستور اعلان کرتے ہیں کہ اس ریاست کی بنیاد "خدا کا یقین" ہے، لیکن صدر جمہوریہ سے لے کر ایک ادنیٰ سرکاری ملازم یا عہدہ دار کے لئے مسلمان ہونا شرط نہیں اور نہ کسی سرکاری ملازم یا عہدہ دار کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ وفاداری کے لئے خدا کے نام یا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ قسم کھائے[1] ہر شخص کو اپنے پسند کا مذہب اختیار کرنے اور اس پر قائم رہنے کی دونوں دستوروں میں آزادی دی گئی ہے۔

---

[1] مغربی مصنف کو یہ معلوم نہیں کہ اسلام میں اللہ کے نام کے علاوہ کسی کے نام کی قسم کھانا جائز نہیں۔

غیر اسلامی اور غیر مذہبی شخصیت کی انڈونیشیائی ریاست نے آبادی کے ایک نمایاں اور معتدبہ حصہ کو اپنا مخالف بنالیا اور اس نے حکومت کے خلاف وہ جنگ چھیڑدی جو اس جمہوریہ کی سب سے طویل اور سب سے پُرمصارف گوریلا وار (GUERILLA WAR) ثابت ہوئی، عام طور پر اس نامذہبیت کے جواز کے لئے یہ دلیل پیش کی جاتی ہے کہ ملک میں ایک قابل لحاظ تعداد عیسائیوں، ہندوؤں اور دوسرے فرقوں کی ہے لیکن حقیقتاً اس کی اصل دلیل جو زبانوں پر بہت کم آتی ہے وہ یہ ہے کہ کسی جدید حکومت کو اس قرآن کے اصول و تعلیمات کے مطابق چلایا نہیں جاسکتا جو ساڑھے تیرہ سو برس پہلے محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) پر نازل ہوا تھا، دوسری بات یہ ہے کہ قرآن مجید قانون رہا تو قدرتاً اس کے وکیل اور شارح تاریک خیال علماء ہوں گے اور سیاست پر صدیوں پرانے خیالات کی چھاپ پڑ جائے گی انڈونیشیا کی اکثر سیاسی جماعتیں، لیڈر اور اہل فکر، روشن خیال عصر جدید کے ذہن کے نامذہبی حکومت کے حامی اور اس بات کے قائل ہیں کہ ایک مسلمان ملک کے لئے نامذہبی ڈھانچہ ہی مناسب ہے اور اس طرح ان کی اکثریت مغربی انداز پر سوچنے والی ہے۔[1]

غیر واضح ردِّ عمل

تجدد و مغربیت اور نامذہبیت (SECULARISM) کے اس کھلے رجحان اور فیصلے کے ساتھ انڈونیشیا سوکارنو کی قیادت میں تیزی کے ساتھ کمیونزم کی طرف جارہا تھا کمیونسٹ فوجی و انتظامی عناصر نے فوج و حکومت پر پورے طور پر قبضہ کرنے کی کوشش کی جو ناکام رہی، اس طرز عمل کے خلاف انڈونیشیا کے مسلم عوام اور خاص طور پر طلباء میں ایک شدید ردِّ عمل رونما ہوا جس کے نتیجہ میں ان اشتراکی عناصر کو فوج و حکومت سے بے دخل اور صدر کو اپنے اختیارات سے محروم ہونا پڑا، اس ردِّ عمل کا مثبت اور ایجابی پہلو ابھی غیر واضح ہے نہیں کہا جاسکتا کہ تجدد اور مغربیت کے جس راستے پر انڈونیشیا تیزی کے ساتھ جارہا تھا، اس میں کیا تغیر واقع ہوگا، اور اسلامی نقطۂ نظر اور احیائے اسلام کی تحریکیں اس سے کیا فائدہ اٹھا سکیں گی۔

اتنی بات واضح ہے کہ عیسائیت کو اس ملک میں خصوصی مراعات حاصل ہیں اور اس کی وہاں

---

[1] (THE STORY OF INDONESIA) P. 250. 261. ملخص

اشاعت تیزی کے ساتھ ہو رہی ہے جس نے اس ملک کے نوے فی صدی آبادی کے مذہب (اسلام) کے لئے خطرات پیدا کر دیئے ہیں۔

نئے آزاد اسلامی ممالک مغرب زدگی کے راستہ پر

وہ مشرقی ممالک جو ابھی حال میں آزاد ہوئے ہیں، تجدد اور مغرب زدگی کے اسی راستہ پر گامزن ہیں، جس پر ترکی کمال اتاترک کی قیادت میں پیش قدمی کر چکا ہے، ایسا نظر آتا ہے کہ جیسے ان سب رہنماؤں اور لیڈروں نے مغرب کے فکری فلسفہ کو اپنے سارے اقتصادی، سیاسی اور ثقافتی پہلوؤں کے ساتھ نیز اس کی مادہ پرستانہ قومیت کو اپنے اپنے اسلامی ملک میں نافذ کرنے کا عزم مصمم کر لیا ہے، وہ اس اسلامی مزاج کے ساتھ جس کی جڑیں اور شاخیں ہر طرف پھیلی ہوئی ہیں اور اس کے اجتماعی علمی اور ثقافتی ڈھانچہ کے ساتھ (جس سے بہت فائدہ اٹھایا جا سکتا تھا، اور ملک و قوم کے مفاد میں اس سے بیش قیمت مدد لی جا سکتی تھی) مستقل طور پر برسر پیکار اور ان معنوی اور روحانی قوتوں کے ساتھ (جو زبردست قربانیوں، دینی مصلحین کی بے لوث اور بے نظیر اخلاص کی بدولت اس امت کے افراد اور اس نسل کے دلوں میں راسخ اور دل نشین ہو چکی ہیں) برسر جنگ ہیں، وہ اپنے طرز عمل، نظام تعلیم و تربیت اور اعلانات کے ذریعہ قوم کی اس قوت ایمانی اور جذبۂ دینی کو برابر کمزور کرتے چلے جا رہے ہیں، جو نہ کارخانوں اور فیکٹریوں سے ڈھل کر نکلتا ہے اور نہ پر جوش اور ولولہ انگیز تقریروں سے پیدا ہوتا ہے اس کو صرف انبیاء کی تاثیر و صحبت ان کی طاقتور شخصیت اور اسی طرز و نمونہ کے اہل اخلاص اور اہل دعوت کی جدوجہد پیدا کر سکتی ہے اگر خدا نخواستہ انسانی دلوں میں اس کا سوتا خشک ہو جائے تو اس خلاء کو کوئی قومی شعور، سیاسی بیداری اور علم و ثقافت کی ترقی پر نہیں کر سکتی، اس

قوتِ ایمانی نے گذشتہ عہد میں بھی محیر العقول کارنامے انجام دیئے، جن پر عقلِ انسانی صدیوں سے انگشت بدنداں ہے، اور اس کے اندر آج بھی وہی خارق عادت طاقت اور اعجاز پوشیدہ ہے، اسی قوتِ ایمانی، جذبۂ قربانی اور شوقِ شہادت کی مدد سے سویز کا معرکہ سر کیا گیا، الجزائر کی خون آشام اور طویل جنگ لڑی گئی، اور دس لاکھ انسانوں کی قربانی سے (جو جہاد کے جذبہ سے سرشار تھے) ملک کی آزادی اور عزت خریدی گئی۔

یہ تاریخ کا عجیب المیہ اور سیاست کی عجیب "ستم ظریفی" ہے کہ کسی ملک میں جب تک آزادی کا معرکہ درپیش رہتا ہے، اور غیر ملکی اقتدار سے نجات حاصل کرنے کے لئے ان عوام کی قربانیوں، سرفروشی اور جوش خروش کی ضرورت ہوتی ہے جو خدا کی رضا، اخروی اجر و ثواب اور اسلام کی سربلندی کے سوا کسی مقصد سے دلچسپی نہیں رکھتے، مذہب کی زبان کے سوا کسی زبان سے آشنا نہیں ہوتے اور مذہبی نعروں کے بغیر ان کے خون میں گرمی اور ان کے دماغوں میں نشہ پیدا نہیں کیا جا سکتا، تو جنگِ آزادی کے رہنما اس زبان کے سوا اپنے عوام سے کسی اور زبان میں گفتگو نہیں کرتے، وہ مذہبی نعروں ہی کے ذریعہ اور اللہ کے نام کی بلندی، اسلام کی سربلندی اور اللہ کے احکام کے اجراء کا لالچ دے کر ان کو آگ سے کھیلنے اور خاک و خون میں لوٹنے کی دعوت دیتے ہیں، اور اسی ایمانی طاقت سے (جس کے مقابلہ میں کم سے کم مسلمان اقوام میں کوئی طاقت نہیں پائی جاتی) آزادی کا قلعہ فتح کرتے ہیں اور ناقابلِ تسخیر دشمن کو سرنگوں ہونے پر مجبور کرتے ہیں، لیکن جیسے ہی یہ ناگزیر منزل طے ہوتی ہے اور ملک کا اقتدار اعلیٰ اور ان سیاسی رہنماؤں کی زبان میں "ملک و قوم کی قسمت" ان کے ہاتھ میں آجاتی ہے، وہ ملک کو مغربیت اور نامذہبیت (سیکولرازم) کے راستہ پر ڈال دیتے ہیں، اور جلد سے جلد مذہب اور معاشرہ کی اصلاح، اسلامی قانون (پرسنل لا) کی تنسیخ و ترمیم اور ملک کو مغرب کے سانچہ میں

ڈھالنے کا "ضروری" کام شروع کر دیتے ہیں، اور اس میں اتنی عجلت و شدت سے کام لیتے ہیں کہ بعض اوقات وہ لوگ جنھوں نے بے دریغ قربانیاں دی تھیں یہ سوچنے لگتے ہیں کہ انھوں نے شاید غلطی کی اور ملک کی آزادی اسلامی زندگی اور مذہبی آزادی کے حق میں مفید ہونے کے بجائے مضر ثابت ہوئی، ۱۹۲۴ء کے ترکی سے لے کر ۱۹۶۲ء کے الجزائر تک یہ ایک مسلسل داستان ہے جس میں کوئی استثناء نظر نہیں آتا، اور عرب ممالک بھی پورے عزم و ارادہ اور جوش و خروش کے ساتھ اسی ترکی کے نقشِ قدم پر چل رہے ہیں، جس کے اقتدار کے خلاف انھوں نے کبھی بغاوت کی تھی، اور جس کی سیاست سے وہ اب بھی بڑے بیزار نظر آتے ہیں۔

تونس

ان آزاد ہونے والے عرب ممالک میں سب سے پہلے تونس کا نام آتا ہے جس نے ۱۹۵۶ء میں آزادی اور حکومتِ خود اختیاری حاصل کی، اس کے پہلے صدر الحبیب بورقیبہ نے اپنے پُرجوش مسلمان عرب ملک (تونس) میں پوری سنجیدگی کے ساتھ کمالی اصلاحات و تجدد کے سلسلہ کا آغاز کر دیا، ان کے بیانات و رجحانات جو وقتاً فوقتاً اخباروں میں آتے رہتے ہیں، صاف بتاتے ہیں کہ وہ اپنے ملک کو تدریجی طور پر ترکی کے راستہ پر لے جانا چاہتے ہیں، اور اپنی فرانسیسی تربیت و ثقافت کے مطابق جدید تونس کی تشکیل کر رہے ہیں، اس سلسلہ میں ایک ایسے محتاط فرانسیسی اخبار کا اقتباس پیش کیا جاتا ہے جس کو اس سے انکار ہے کہ جدید تونس لادینیت کے رخ پر جا رہا ہے۔

پیرس کا مشہور اخبار (LE MONDE) ۲۹ جنوری ۱۹۵۸ء کی اشاعت میں "آزاد تیونس تیسرے سال کے دروازہ پر" کے عنوان کے ماتحت لکھتا ہے:۔

صدر حبیب بورقیبہ نے تعدد ازدواج کی آزادی کو محدود و مقید کر دیا ہے[1]، اسی طرح سے شوہر کے لئے اپنی بیوی کو خود طلاق دینے کی آزادی پر بھی پابندیاں عائد کر دی گئیں ہیں[2]، اسی طرح شوہر کے اختیارات کو بہت کچھ محدود و مقید کر دیا گیا ہے، یہ خاندانی آزادی سیاسی اور معاشرتی آزادی کے ساتھ مل کر دو چند ہو جاتی ہے اب عورتوں کو حق رائے دہندگی بھی حاصل ہے، اور مجالس قانون ساز کا ممبر بننے کی بھی، تمام ملازمتوں کے دروازے ان پر کھلے ہیں، اس وقت تنو خواتین محکمۂ تعلیم میں ہیں ڈیڑھ ہزار دفاتر میں اور سات ہزار مختلف منصوبوں میں۔

تیونس، ترقی کے اس میدان میں قیادت و رہنمائی کا پارٹ ادا کر رہا ہے، کمال اتاترک کے زیر قیادت ترکی نے اس راستہ کا آغاز کیا تھا، اس پر تیونس اب قدم بڑھا رہا ہے، اس ملک میں واضح طریقہ پر اور تیزی کے ساتھ تبدیلی آ رہی ہے، پردہ (خصوصیت کے ساتھ نئی نسل میں) کم ہوتا جا رہا ہے، باہر نکلنے والی عورتوں کی تعداد روز بروز بڑھ رہی ہے، سیاسی محفلوں میں وہ مردوں کے دوش بدوش نظر آتی ہیں، دیہاتوں میں البتہ (جہاں ابھی تک مخالفت سخت ہے) ترقی کے قدم سست ہیں۔

صدر بورقیبہ نے اس تبدیلی کو زبردستی مسلط کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی، وہ یہ پسند کرتے ہیں کہ یہ پرانے کپڑے خود کٹ کر اور گل کر جسم سے اتر جائیں، وہ اس بات کی شدت سے تردید کرتے ہیں کہ وہ لادینیت پر عقیدہ رکھتے ہیں یا زیادہ سے زیادہ

---

[1] یہ ۱۹۵۶ء کی بات ہے اس کے بعد تعدد ازدواج قانوناً ممنوع قرار دے دیا گیا۔

[2] یہ بھی اسی وقت کی بات ہے، اس کے بعد یہ حق شوہر سے لے کر عدالت کو دے دیا گیا ہے، اب شوہر ذاتی طور پر طلاق دینے کا مجاز نہیں ہے۔

صاف لفظوں میں اسلام کو ترک کرنا چاہتے ہیں، لیکن وہ برابر ضروری مغربی تمدن اور دینی روایات کے درمیان مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں، وہ اکثر یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اگرچہ ان کی اصلاحات لفظی طور پر قرآن مجید کی نصوص کی پابند نہیں ہیں، لیکن وہ ان کی روح کی منافی بھی نہیں ہیں، اس لئے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ تیونس کا جدید رخ کمالی فکر کے مقابلہ میں مصری فکر سے قریب تر ہے جس طرح مصر نے جامع ازہر کو باقی رکھا، اسی طرح بورقیبہ نے تیونس کے مدرسۂ اعظم جامع زیتونہ کی مخالفت میں احتیاط برتی، لیکن وہ دو سال سے اس کے دائرہ اثر اور اس کے کاموں کو محدود کرتے چلے جارہے ہیں، اور وہ اس پر غور کر رہے ہیں کہ وہ اس کو محض ایک ایسے کالج کی شکل میں باقی رکھیں جو تیونس یونیورسٹی کے ماتحت الہیات کی تعلیم کے ساتھ مخصوص رہے[1]"

پروفیسر جوزف شاخت (SCHACHT) نے بھی اپنے ایک جدید مقالہ "جدید اسلامی قانون سازی کے مسائل" میں تونس کی اس "ترقی پسندی" اور تجدد کے میدان میں پیش قدمی کا بہت صاف طریقہ سے اظہار کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:-

"آخر کار تونس نے ۱۹۵۶ء کے قانون کو منظور کر کے اپنے آپ کو ان ملکوں کا میر کارواں ثابت کر دیا جو اسلامی قانونی جدت پسندی کی منزل کی طرف سرگرم سفر ہیں، سب سے پہلے اوقاف عامہ ختم کئے گئے اور ان کی آمدنیوں کو حکومت کی ملک قرار دے دیا گیا، یہ عمل قانونی اہمیت کے اعتبار سے شام اور مصر کے اوقاف کے خاتمے سے کہیں بڑھ کر تھا، دوسرے ایک سال قبل کے مصری قانون کی پیروی کرتے ہوئے محاکم شرعیہ کے ان اختیارات کو جن کے تحت وہ روایتی اسلامی قانون کا انطباق کیا کرتے تھے، سلب کر لیا گیا، اور

---

[1] ملاحظہ ہو کتاب "المغرب المسلم ضد اللادینیة" تصنیف ادریس الکتانی ص ۹۵-۹۶

تیسرے تیونس کے لئے احکامِ شخصیہ (PERSONAL LAW) کا ایک نیا قانون بعنوان "مجلۃ الاحکام الشخصیۃ" (TUNISIAN CODE OF PERSONAL STATUS) منظور کرکے نافذ کر دیا گیا، اگرچہ تیونس کی وزارتِ انصاف نے ایک گشتی مراسلے میں اس بات کا دعویٰ کیا ہے کہ اس قانون کو اسلامی قانون کے اعلیٰ درجہ کے ماہرین نے پسندیدگی کی نظر سے دیکھا ہے اور اگرچہ اس قانون نے بعض ایسے اداروں کو برقرار رکھا جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے ــــ خالص اسلامی ہیں مثلاً مہر، رضاعت کی بناء پر حرمتِ نکاح، اور باوجودیکہ یہ قانون فروعی مسائل میں تیونس میں مستند سمجھے جانے والے دونوں فقہی مذاہب میں سے کسی ایک سے ضرور متفق ہے، تاہم کسی دور از کار تاویل کے ذریعہ اسے روایتی اسلامی قانون کا چربہ قرار دینا اور یہ کہنا کہ یہ روایتی اسلامی قانون ہی کی ایک بدلی ہوئی شکل ہے، ممکن نہیں، تونس کے بہت سے اعلیٰ درجہ کے علماء نے جن کا تعلق عدالتوں سے تھا اس قانون کے خلاف ایک فتویٰ صادر کیا جس میں اس کوڈ کی کھل کر مخالفت کی گئی، ان علماء میں سے چار نے جن میں مالکی اور حنفی دونوں مذاہب کے مفتی اعظم بھی شامل تھے بطورِ احتجاج کے عدالتِ عالیہ (TRIBUNAL SUPERIOR) سے جس کے وہ ممبر تھے استعفاء دے دیا، یہ صحیح ہے کہ کوڈ کا جو حصہ قانونِ وراثت سے متعلق ہے اس نے اسلامی قانون وراثت کو بغیر کسی تبدیلی کے بعینہٖ قبول کر لیا جس کی وجہ یقیناً یہ تھی کہ یہ سمجھا گیا کہ تونس کے سماجی حالات کے تقاضوں کو یہ قانونِ وراثت اب بھی بحسن وخوبی پورا کر سکتا ہے لیکن نکاح و طلاق کے قوانین کو ایسا بدلا گیا کہ ان کی شکل بھی اب نہیں پہچانی جاتی، مثال کے طور پر تعددِ ازواج کو ممنوع قرار دے کر اسے ایک قابلِ تعزیر فوجداری جرم

قرار دے دیا گیا، نکاح اب فریقین کی رضامندی سے ہوتا ہے، طلاق صرف عدالت کے ذریعہ ہو سکتی ہے اور وہ بھی صرف ان تین صورتوں میں (ا) فریقین میں سے کوئی ان شرائط کی بنا پر طلاق کی درخواست دے جو کوڈ میں معین کر دی گئی ہیں (ب) فریقین طلاق پر باہم رضامند ہوں (ج) صرف ایک فریق طلاق کی درخواست دے، اس صورت میں جج وہ رقم متعین کرے گا، جو ہرجانہ کے طور پر وہ فریق دوسرے کو ادا کرے گا، اس طرح نہ صرف یک زوجیت اور طلاق کے بارہ میں بیوی اصولی طور پر شوہر کی ہمسر بنادی گئی بلکہ ضمنی طور پر ملکیت کے ان معاملات کے بارہ میں بھی جو نکاح کا نتیجہ ہوتے ہیں، یہ تو بعید از قیاس ہے کہ تونسی قانون کا مسودہ تیار کرنے والوں کو خدا بخش کے خیالات کا علم رہا ہوگا، تاہم اس میں شک نہیں کیا جا سکتا کہ تونسی کوڈ اسی طرح کے خیالات سے متاثر ہے، تونس کے ارباب حل وعقد کچھ بھی اعلان کریں، ان کا مذکورہ شخصی قانون، اگر معروضی طور پر دیکھا جائے روایتی اسلامی قانون سے اتنا ہی مختلف ہے جتنا ترکی کا سکولرسول کوڈ (دیوانی قانون[1])"۔

تیونیسی صدر کے اقدامات وبیانات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کا ثقافتی سفر (جو ان افکار کے ہمرنگ ہے جن کی تلقین مغربی تہذیب کے داعی اور مسیحی مشنری اور مستشرقین کرتے رہتے ہیں) جاری رہے گا اور دور رس نتائج تک پہنچے گا، اب وہ اس مرحلے میں ہیں جہاں اشاروں اور کنایوں کے حدود ختم ہو جاتے ہیں، چنانچہ اب انھوں نے بے خوف وخطر اپنے افکار کو ظاہر کرنا اور جسارت سے کام لینا شروع کر دیا ہے، اس بات کی شہادت ان کے

---

[1] مضمون پروفیسر شاخت (SCHACHT) بعنوان (PROBLEMS OF MODERN ISLAMIC — LEGISLATION) ملخص ترجمہ از مولوی فضل الرحمٰن صاحب انصاری ایم اے ایل ایل بی (علیگ) شائع شدہ در رسالہ برہان دہلی دسمبر ۱۹۶۳ء

وہ بیانات ہیں جنھوں نے عالم اسلام میں ایک ہنگامہ پیدا کر دیا ہے ایک بیان انھوں نے تیونس میں مارچ ۱۹۷۴ء میں منعقد ہونے والی عالمی ثقافتی کانفرنس کے مدرسین و مربین کے شعبے میں دیا تھا (جسے تیونسی اخبارات نے کم ان فقروں کو حذف کر کے شائع کیا تھا جن میں اسلام اور ذات نبوی پر شدید حملے تھے) اور جنھیں سرکاری مجلات نے بھی حذف کر دیا تھا، لبنان سے نکلنے والے ہفتہ وار "الشہاب" نے ساتویں سال کے پہلے شمارے میں جو ۱۵ را پریل ۱۹۷۴ء میں نکلا تھا، یہ فقرے شائع کیے تھے:-

(۱) قرآن میں تضاد ہے جسے عقل نہیں قبول کرتی جیسے وہ ایک جگہ کہتا ہے "قل لن یصیبنا الا ما کتب اللہ لنا" اور دوسری جگہ کہتا ہے "ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیروا ما بأنفسہم"[1]

(۲) پیغمبر محمد ایک سادے انسان تھے، جو صحرائے عرب میں کثرت سے سفر کرتے رہتے اور رائج الوقت خرافات سنتے رہتے تھے، پھر انھوں نے خرافات کو قرآن میں نقل کر دیا، جیسے عصائے موسیٰ کا قصہ جسے عقل یا پھر کی تحقیق کے بعد ماننے پر تیار نہیں، اور جیسے اصحاب کہف کا قصہ[2]

---

[1] صدر موصوف نے جن آیتوں میں تضاد پایا ہے وہ یا تو عربی زبان سے ان کی ناواقفیت پر مبنی ہے (کیونکہ ان کی تعلیم فرانس میں ہوئی ہے) یا ان کے قرآن اور اس کی تفسیر کے عدم مطالعہ کا نتیجہ ہے اگر انھوں نے اسلامیات کے کسی معمولی عالم سے بھی رجوع کیا ہوتا تو وہ اس شبہ میں نہ پڑتے۔ [2] یہ الزام بھی صدر کی ناواقفیت یا اس فکری انتشار کی غمازی کرتا ہے جو ۱۹ ویں صدی کے نصف اخیر کے تعلیم یافتہ طبقہ میں رہا ہے جب علمی و تاریخی بحثوں نے بہت زیادہ فروغ نہیں پایا تھا، لیکن اب عصر جدید میں اس قسم کے دعاوی کا کوئی جواز نہیں اس لئے اس سے بہر حال یہی ظاہر ہوتا ہے کہ صدر بورقیبہ قرآن کو نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی تالیف مانتے ہیں اسے آسمانی کتاب نہیں تسلیم کرتے۔

(۳) مسلمانوں نے پیغمبر محمد کو بھی معبود بنالیا ہے کیونکہ وہ ہمیشہ محمد صلے اللہ علیہ وسلم کہتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ محمد پر رحمت بھیجتا ہے' جو محمد کو خدائی درجہ دینے کے مرادف ہے۔[1]

یہ صدر کے بیانات تھے جنھیں اسلامی جریدوں نے نقل کیا ہے' اور جنھیں سرکاری جریدوں نے حذف کردیا ہے لیکن تیونیسی جریدہ "الصباح" نے جو بیان نشر کیا ہے' اور جسے سرکاری تائید بھی حاصل ہے' وہ بھی صدر کو بری نہیں قرار دیتا اور نہ ان کے فکری انحراف کو کم دکھاتا ہے ہم اسے حرفاً حرفاً نقل کرتے ہیں :-

"یہاں کچھ اور چیزیں ہیں، جیسے عصائے موسیٰ جو پھینکنے پر اژدہا بن گیا' اس پر لوگوں کا ایمان تھا کہ جماد سے بھی زندگی پیدا ہو سکتی ہے' یہ خیال یورپ میں بھی موجود تھا' لکس پیسٹیر (LOUIS PASTEUR) (انیسویں صدی کے وسط کا مشہور فرانسیسی ماہر حیاتیات جس نے پہلی مرتبہ یہ انکشاف کیا کہ جراثیم بیماریاں پیدا کرتے ہیں) کے وقت سے بالکل ختم ہوگیا' انہی قصوں میں جن پر عرب ممالک میں لوگوں کا ایمان تھا' اصحاب کہف کا قصہ بھی ہے جو صدیوں سوتے رہے' پھر ان میں زندگی پیدا ہوئی۔"[2]

ہم ان بیانات پر یہاں کوئی تبصرہ نہیں کرنا چاہتے اس لئے کہ صدر بورقیبہ کوئی قابل ذکر علمی مقام نہیں رکھتے اور ان بیانات کے پیچھے کوئی فکر و مطالعہ نہیں ہے' البتہ ان سے جو نتیجہ نکلتا ہے وہ یہ ہے کہ صدر بورقیبہ احساس کہتری اور ذہنی غلامی کا شکار ہیں' انھوں نے

---

[1] یہ صدر کی ناواقفیت کی دوسری دلیل ہے جس سے ان کے ہر موضوع پر بلا تحقیق لب کشائی کے شوق کا اظہار ہوتا ہے' بھلا درود و برکت اور دعا کو کسی کے معبود بنانے سے کیا تعلق ہے' اور ایسی دعائیں تو تمام آسمانی کتابوں بلکہ تمام مذہبی کتابوں میں ملتی ہیں' ان سے تو خود ان انسانوں کی بندگی اور احتیاج ثابت ہوتی ہے' جن پر خدا سے رحمت نازل کرنے کی دعا کی جاتی ہے۔ [2] "الصباح" تیونس - ۲۰ / ۲۱ / مارچ ۱۹۷۴ء -

کسی اسلامی علم کی تحصیل اس عمر میں نہیں کی جس میں مہارت پیدا کی جا سکتی تھی، اب ضروری سوال صرف یہ رہ جاتا ہے کہ جو شخص اس قسم کے اسلام دشمن خیالات رکھتا ہے، وہ دائرۂ اسلام میں باقی بھی رہ سکتا ہے یا نہیں، اور کیا اسے ایک اسلامی اکثریت کے ملک پر حکمرانی کا حق حاصل ہے؟

صدر کی ان تصریحات نے دنیا کے اسلامی اور دینی حلقوں میں جو شدید ردعمل پیدا کیا وہ اس سوال کا بہترین جواب تھا،[1] مذکورہ بالا تین اعتراضات کے علاوہ جو صدر کے بیان میں ہیں، ان کے ان افکار سے جو حیات نبی صلی اللہ علیہ وسلم، عقائد اسلامیہ اور طریقہ ہائے عبادت کے متعلق ہیں، یہ معلوم ہوتا ہے کہ صدر موصوف نہ صرف یہ کہ اسلام کے اصولوں و مبادی اور شریعت سے متفق نہیں بلکہ وہ مسلمانان تیونس کو بھی اسی طرف لے جانا چاہتے ہیں، اور ان کے دلوں پر بھی دینی عقائد و حقائق کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا کر دینا چاہتے ہیں، اس واقعہ سے اس کا اندازہ کرنا مشکل نہیں ہے کہ وہ تیونس کدھر جا رہا ہے جس نے ابن خلدون جیسا بلند پایہ اسلامی مفکر، دانشور اور عالم پیدا کیا تھا، اور جس کی خاک سے صدہا محدثین، فقہاء اور مشائخ و اولیاء اللہ پیدا ہوئے، ہم جانتے ہیں کہ صدر بورقیبہ کے بیان پر وہاں کے اسلامی حلقوں میں شدید ردعمل نہ ہونے کے بعد تیونس کو ایک مغربی نمونے کا ملک بنانے کا خطرہ اور بڑھ گیا ہے،

---

[1] اتفاق سے اس زمانہ میں جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ (مدینہ یونیورسٹی) کی اعلیٰ تعلیمی کمیٹی کا اجلاس ہو رہا تھا جس میں ممالک اسلامیہ و عربیہ کے چیدہ ماہرین تعلیم اور دانشگاہوں کے سربراہ جمع تھے، راقم سطور بھی اس کا رکن ہونے کی وجہ سے موجود تھا اس موقع پر ایک علیحدہ نشست میں ان بیانات کا جائزہ لیا گیا، شرکائے مجلس نے ان پر اپنی سخت ناپسندیدگی کا اظہار کیا، پھر ایک برقیہ کے ذریعہ صدر بورقیبہ کو علماء کے اس نقطۂ نظر کی اطلاع دی گئی، اس میں یہ اشارہ موجود تھا کہ ایسے خیالات کا حامل دائرۂ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔

اور اس کی کوششیں اور تیز ہو گئی ہیں۔

الجزائر

۳ جولائی ۱۹۶۲ء کو لاکھوں مجاہدین کی بے مثال قربانی کے نتیجے میں فرانسیسی اقتدار ختم ہوا، اور الجزائر فوجی محاذ آزادی کے لیڈروں کے حوالہ کر دیا گیا، فرحات عباس اور احمد بن بلا کی قیادت میں آزاد حکومت قائم ہوئی جس نے بن خدہ کی جلاوطن حکومت کی جگہ لے لی، ۱۵ ستمبر ۱۹۶۳ء کو رائے شماری کرائی گئی اور بن بلا عوامی جمہوریہ الجزائر کے باقاعدہ صدر منتخب ہوئے، احمد بن بلا جمال عبدالناصر کے دوستوں اور ان کے ہم خیالوں میں سے تھے، ان کے انتخاب میں جمال عبدالناصر کے اثرات بھی معین و مددگار ثابت ہوئے تھے، ان کے اقتدار میں آنے سے الجزائر نے اشتراکی راستہ اختیار کیا اور انھوں نے جمال عبدالناصر کی طرح دینی ذہن کو محدود اور حکومت سے دور رکھنے کی کوشش کی، اور کمیونسٹ ممالک سے تعلقات بڑھائے۔

الجزائر کی جنگ آزادی جذبۂ جہاد شوق شہادت، اور غیرت اسلامی کی بنیاد پر لڑی گئی تھی جس میں قربانی اور جاں نثاری کے ایسے واقعات ظہور پذیر ہوئے جن کی مثال گذشتہ چند صدیوں میں نہیں ملتی[1]، لیکن آزادی ملنے کے بعد سیاسی قیادت ایسے لوگوں کے ہاتھ میں آئی جن کی تربیت دینی درسگاہوں، اور روحانی تربیت کے مراکز کے بجائے فرانسیسی فوج کی تربیت گاہوں، اور فرانس کے تعلیمی اداروں میں ہوئی تھی، ان میں کئی ایسے لیڈر بھی تھے، جن کے لئے عربی زبان اجنبی زبان کی طرح تھی، اور وہ عرصہ تک

---

[1] الجزائر کی تحریک آزادی میں ۱۵ لاکھ افراد شہید ہوئے۔ (الاصالۃ الجزائر)

جیلوں میں یا غیر اسلامی ماحول میں رہنے کی وجہ سے ذہنی طور پر اسلام کی اخلاقی تعلیم سے ناآشنا تھے، انھوں نے اس جذبہ سے ملک کی تعمیر میں مدد نہ لی اور ملک کی تعمیر غیر مذہبی بنیادوں پر کرنے کی کوشش کی۔[1]

اس صورتِ حال کا اندازہ جس کے خلاف الجزائر کی اسلامی روح اور شہیدوں کا خون احتجاج کر رہا ہے، علماء الجزائر کے ایک بیان سے ہوگا جو ہم کو لندن کے ایک یہودی اخبار (JEWISH OBSERVER) کی وساطت سے پہونچا ہے، اخبار مذکور اپنی اسر اگست ۱۹۶۲ء کی اشاعت میں الجزائر کے نامہ نگار کے حوالہ سے لکھتا ہے :-

"الجزائر کے دینی رہنماؤں نے اعلان کیا ہے کہ اسلام اور عربی زبان کو الجزائر میں بالاتری حاصل ہوگی، انھوں نے اپنے ایک بیان میں ان قوم پرست رہنماؤں پر شدید اعتراض کیا ہے، جو زمانۂ حال کے مطابق ایک جدید اشتراکی الجزائری حکومت کے حامی ہیں، جس میں مذہب کو حکومت کے معاملات میں دخل دینے کی اجازت نہ ہوگی۔

علماء کے اس بیان میں صاف طریقہ پر کہا گیا ہے کہ الجزائر کی جنگ اپنے ان شہیدوں کے ساتھ بے وفائی اور خیانت کا ارتکاب کرے گی جو اس جنگ میں کام آئے اور اپنے اس تاریخی مقصد میں مکمل طور پر ناکام سمجھی جائے گی، اگر اسلام کو حکومت کا سرکاری مذہب اور عربی زبان کو ملک کی سرکاری زبان قرار نہ دیا گیا۔

---

[1] ۵ راپریل ۱۹۶۳ء کو ہندوستان کے انگریزی پریس میں دہلی کی یہ خبر شائع ہوئی "ہندوستان میں الجزائر کی جمہوری حکومت کے نمائندہ جناب بکر نے آج یہاں ایک پریس کانفرنس میں کہا کہ آزاد الجزائر ایک سیکولر اور جمہوری ملک ہوگا، البتہ اس کا کلچر عرب اور اسلامی ہوگا، تمام شہریوں کے حقوق اور فرائض یکساں ہوں گے اور اقوام متحدہ کے منظور شدہ انسانی حقوق الجزائر میں نافذ العمل ہوں گے۔"

جنگ بندی کا معاہدہ ایریان واضح طریقہ پر اس بات کی تصریح کرتا ہے کہ الجزائر کے آنے والے آئین میں ایک دفعہ مذاہب کی آزادی ہوگی اور فرانسیسی زبان اور عربی زبان دونوں، حکومت کی سرکاری زبانیں ہوں گی اور یہ کہ ملک کے نمائندے جن کے متعلق طے تھا کہ ۹ ستمبر کو جمع ہوں گے، ملک کے دستور کا خاکہ بنائیں گے یہ نشست کئی مرتبہ ملتوی ہو چکی تھی اور فوجی افسروں اور سیاسی رہنماؤں کی کشمکش کی وجہ سے اس تاریخ کو بھی منعقد نہ ہو سکی۔

اب الجزائر کے علماء فرانسیسی اقتدار کے خاتمہ کے بعد پہلی مرتبہ اپنے کھلے ہوئے بیان کے ذریعہ اعلان کرتے ہیں کہ آزادی اور ملک کی معاشیات کی مادی ترقی الجزائر کے انقلاب کی غایت نہیں ہو سکتی، انھوں نے اپنے بیان میں کہا ہے کہ "ہر آزاد قوم اپنا ایک انفرادی وجود رکھتی ہے اگر ایسا نہ ہو تو دنیا کی قومیں ایک دوسرے سے ایسی خلط ملط ہو جائیں جیسے پانی میں مچھلیاں، اور الجزائریوں اور فرانسیسیوں اور اسپینیوں میں کوئی فرق نہ رہے، اگر ایسا ہوا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ الجزائر کھلی ہوئی بین الاقوامی ریاست بن جائے، ہم اس پوری صورتِ حال سے اختلاف رکھتے ہیں ہم الجزائری ہیں، ہماری ایک مخصوص آزاد وطنی شخصیت ہے اور یہ ہمارے مذہب اسلام، ہماری زبان، روایات اور تاریخ کا ناطق فیصلہ ہے۔

علماء کے اس بیان میں اسلام کو حکومت سے علیحدہ کرنے کی کوشش کو انقلاب سے منافقت، غداری، خود اس امتِ مسلمہ کے گھر میں اسلام پر حملہ اور پوری الجزائری قوم کی توہین کے مرادف قرار دیا گیا ہے"۔[1]

---

[1] المسلمون، شمارہ ۹ جمادی الاولیٰ ۱۳۸۲ھ (اکتوبر ۱۹۶۲ء)

۱۹۶۵ء میں فوجی انقلاب کے بعد ہواری بومدین اقتدار میں آئے اور احمد بن بلا قید کر دیئے گئے، بومدین بن بلا کے مقابلہ میں سیاسی ذہن سے زیادہ انتظامی ذہن رکھتے تھے، اس لئے انھوں نے تعلیم اور عربی زبان کی اشاعت کی طرف توجہ کی اور ملک کی تعمیر نو کے لئے اسکیم بنائی، بلا کے مقابلہ میں انھوں نے نعرہ بازی سے گریز کیا اور ملک کی سیاسی اور اجتماعی تنظیم کی طرف متوجہ ہوئے لیکن وہ اپنے خاص مزاج اور الجزائر کے مقامی مسائل کی پیچیدگی کی وجہ سے عالم اسلام کے مسائل سے زیادہ دلچسپی نہ لے سکے، اس کی وجہ سے الجزائر جو دوسرے ملکوں کے لئے سرفروشی اور جاں نثاری اور دینی غیرت وحمیت میں مثال اور رہنما بن سکتا تھا، اپنا رول ادا کرنے سے قاصر رہا۔

الجزائر میں جو سیاسی تنظیم قائم کی گئی اس نے اشتراکیت قومیت اور اسلام کا شعار اختیار کیا لیکن اس سلسلہ میں سیاسی تنظیم کے قائدین کی توجہ اشتراکیت کے نفاذ کی طرف زیادہ رہی، اشتراکیت کو اختیار کرنے اور اس کو ترجیح دینے کی وجہ سے الجزائر میں وہی فکری تضاد اور کشمکش پیدا ہو گئی جو دوسرے اسلامی اشتراکی ملکوں میں پائی جاتی ہے، اشتراکی فکر کی بنیاد پر الجزائر نے عرب مشرق کے ان ممالک سے زیادہ تعلقات اور روابط قائم کئے جو اشتراکی ذہن کے تھے، اور اشتراکی فکر کی وجہ سے مذہبی اداروں اور احیاء اسلام کے لئے کوشاں جماعتوں سے متصادم تھے۔

الجزائر میں انتظامیہ اور تعلیم کے مراکز اور سیاسی تنظیم میں صرف ان لوگوں کو کام کرنے کا موقع دیا گیا جو اشتراکی ذہن کے تھے، صدر رابح بیطاط نے جو صدر بومدین کے انتقال بعد کچھ عرصہ تک قائم مقام صدر رہے ہیں سیاسی تنظیم حزب جبهة التحریر الوطنی کے جلسہ میں صفائی کے ساتھ یہ اعلان کیا۔

"ملک میں اشتراکی انقلاب اس وقت تک نہیں آسکتا جب تک اہم عہدوں پر وہ لوگ قابض نہ ہوں جو اشتراکیت پر پورا یقین رکھتے ہیں" صدر نے اس پر اطمینان ظاہر کیا کہ اشتراکیت سے اتفاق نہ رکھنے والوں کو اثر اور نفوذ کے مواقع سے الگ کر دیا گیا ہے، اور ان کی صفائی کر دی گئی ہے۔

نظام تعلیم میں جو قوم کی ذہنی تکوین اور مستقبل کے لئے قوم کو رہنما فراہم کرنے کے لئے اہم وسیلہ ہے تبدیلی کی گئی میثاق قومی کے بموجب متحدہ نظام تعلیم رائج کیا گیا جس کی وجہ سے دینی تعلیم عصری تعلیم کے تابع ہو گئی اس صورت حال سے جو نقصان پہنچا اس کا شکوہ الجزائر کے مفکر اور دانشور شیخ احمد حمانی نے جو اسلامی کونسل کے صدر ہیں حزب جبہۃ التحریر الوطنی کے چوتھے اجلاس میں جس میں قائم مقام صدر رابح بیطاط اور نو منتخب صدر الشاذلی بن جدید شریک تھے اس طرح کیا:۔

"دینی تعلیم کا اہتمام الجزائر میں ہمیشہ رہا ہے، الجزائر کو یہ شرف حاصل ہے کہ حضرت عمر بن عبد العزیز نے دس فقہاء یہاں تعلیم کے لئے بھیجے قدیم عہد میں تلمسان اور بجایہ میں ایسے مراکز تھے، جہاں یورپ سے لوگ پڑھنے آتے تھے، اور یہیں سے یہ علوم یورپ پہنچے، دینی مدارس تحریک جہاد کے عہد میں بھی اپنا کام کرتے رہے اور قوم کو تیار کرنے میں انھوں نے اہم رول ادا کیا، لیکن میثاق وطنی نے تعلیم کے لئے جو متحدہ نظام نافذ کیا ہے اس سے دینی تعلیم کے مراکز کو سخت نقصان پہنچا ہے، ہم یہ سمجھتے تھے کہ اس نظام سے غیر دینی مدارس میں دینی تعلیم رائج ہو گی اور دینی تعلیم عام ہو گی مگر یہ نتیجہ اس کے برعکس ہوا۔"

شیخ حمانی نے اس خطرہ کا اظہار کیا کہ کچھ عرصہ کے بعد مکاتب اسلامیہ میں پڑھنے والے طلبہ اعلیٰ تعلیم سے محروم ہو جائیں گے، یونیورسٹیوں میں دینی تعلیم کا جو واجبی نظام ہے وہ

دینی ذہن بنانے اور دینی علوم کی ترویج کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا، اس نظام تعلیم سے جو لوگ تیار ہوں گے وہ دین اور اپنی ثقافت سے بیگانہ ہوں گے' انھوں نے اس صورتِ حال سے مقابلہ کے لئے مطالبہ کیا کہ اسلامی تعلیم' عقائد' عبادات' معاملات اور اخلاق کو تعلیم کے ہر مرحلہ میں داخل کیا جائے، اسکول' کالج اور یونیورسٹی کے ہر دور میں' اسلامی علوم میں اختصاص کے لئے شعبے کھولے جائیں' جس طرح دوسرے علوم میں اختصاص کے شعبے ہیں' اور اس کے لئے ہمت افزائی کے وہ سارے وسائل اختیار کئے جائیں' جو دوسرے علوم کے لئے اختیار کئے جاتے ہیں۔

اسلامی یونیورسٹی اور اسلامیہ کالج قائم کئے جائیں' ان کے لئے ایسے اساتذہ کا انتخاب کیا جائے' جو اس کے اہل ہوں اور دینی شعور رکھتے ہوں۔

حفظ قرآن کے لئے مکاتب عام کئے جائیں اور حفاظ کی ہمت افزائی کی جائے۔

مدارس' مساجد کی دیکھ بھال اور ان کے اخراجات کے لئے چندہ جمع کرنے پر جو پابندی ہے وہ ختم کی جائے' تاکہ یہ ادارے اپنے پیر پر کھڑے ہو سکیں۔

علماء اور ائمہ کی دینی تربیت کا اہتمام کیا جائے' تاکہ باہر سے اساتذہ بلانے کی ضرورت نہ پڑے۔

ٹیلیویژن اور ریڈیو اور وسائل ابلاغ میں دینی موضوعات اور تربیتی امور کے لئے وقت بڑھایا جائے، اور ان پروگراموں کے لئے دیندار اور تربیت یافتہ لوگ مقرر کئے جائیں۔

اسلامی تعلیمات کا احترام کیا جائے' اور ان کا مذاق اڑانے والوں کے خلاف کارروائی کی جائے' فلم اور ریڈیو کے ایسے پروگرام ممنوع قرار دیئے جائیں جن سے اسلام

اور شعائر اللہ کی توہین ہوتی ہو۔[1]

شیخ احمد حمانی کے مطالبات سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ الجزائر تعلیمی، دینی اور اخلاقی لحاظ سے کس راستہ پر گامزن ہے، اور نئے تعلیمی نظام نے جو مستقبل کے قائد تیار کرنے کا ضامن ہے، اور وسائل ابلاغ نے جو موجودہ نسل کی تربیت کر رہے ہیں، ملک کے لئے کیا مسائل پیدا کر دیئے ہیں، اور مستقبل کے لئے کیا خطرات ہیں؟

اس کے ساتھ ساتھ اس بات کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ الجزائر کی قیادت اشتراکیت کے نفاذ اور زندگی کے ہر شعبہ میں اس کی اجتماعی، اخلاقی اور فکری قدروں کے رواج میں کسی رعایت اور نرمی کی قائل نہیں اور اس کا اس کے لیڈر پوری صفائی سے اعلان کرتے رہے ہیں، اگرچہ وہ اس کے ساتھ اسلام کا بھی نام لیتے رہتے ہیں، اس سے ملک کی لیڈر شپ اور ملک کے عوام نیز سیاسی قیادت اور دینی قیادت کے درمیان فکری تضاد کا پیدا ہونا یقینی ہے۔[2]

یہ آزاد ہونے والے عرب ممالک اور ان کے قوم پرست رہنما وقتاً فوقتاً اسلام سے اپنی وابستگی اور دلچسپی کا اظہار بھی کرتے رہتے ہیں، وہ اس حقیقت سے ناواقف نہیں ہیں کہ اب بھی اسلام ان کے اور عوام کے درمیان سب سے بڑا اور طاقتور رابطہ ہے اور اس کا نام لئے بغیر وہ لاکھوں اور کروڑوں عوام کے دلوں پر حکومت نہیں کر سکتے لیکن اسلام کا مفہوم ان کے ذہن میں اس مفہوم سے بہت مختلف ہوتا ہے، جو ابھی تک ٹھیٹھ مسلمانوں کے ذہن و عقیدہ میں چلا آرہا ہے، اس سے مراد ان کے نزدیک وہ اصلاح شدہ (REFORMED) مذہب ہے، جو مغربی تمدن اور مغربی افکار و اقدار کے ساتھ ہم آہنگ ہو سکے اور ان کی

---

[1] الاصالہ الجزائر [2] الجزائر کی جدید صورت حال پر تبصرہ واضح رشید ندوی کے قلم سے ہے۔

قوم پرستی کا ساتھ دے سکے، نیز عقائد و اخلاقیات میں محدود دائرہ کار کی آئین سازی اور ان کے سیاسی مصالح و مسائل میں مزاحم نہ ہو، اس طرح ایک لبنانی عرب مبصر کی یہ رائے اور تبصرہ کچھ زیادہ مبالغہ آمیز اور حقیقت سے دور نہیں جس کا اس نے امریکہ کے مشہور رسالہ (MUSLIM WORLD) میں حال میں اظہار کیا ہے، ڈاکٹر سالم (SALEM) اپنے مضمون (NATIONALISM AND ISLAM) میں لکھتا ہے:-

"اس مقصد کے لئے "قومیت" نے کامل اتحاد اسلام سے پیدا کیا ہے، لیکن جس اسلام کو "قومیت" نے اپنایا ہے یہ وہ قدیم خشک اسلام نہیں ہے، بلکہ یہ بالکل تبدیل شدہ جدید اسلام ہے جدیدیت کے اس تحفہ میں جس پر اسلام کا صرف غلاف چڑھا ہوا ہے، محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) اور قرآن کے نام بیشک لئے جاتے ہیں، مگر اس لئے کہ ہر اس چیز کے لئے سندِ جواز ہاتھ آجائے جسے قوم پرور اختیار کرنا چاہیں، عرب قومیت کو عوام میں مقبولیت اسی اسلام سے لپٹے رہنے سے حاصل ہوتی ہے، ایک حد تک یوں کہئے کہ عرب قومیت ایک عرب قوم کی تشکیلِ نو کے لئے اسلام کے نام سے خوب نفع حاصل کر رہی ہے، عرب قوم پرور اسلامیت اور عربیت کو ملا دینے سے پوری جیت حاصل کر رہے ہیں۔"[1]

اشتراکیت اور اس کے حلیف

الجزائر کے سابق صدر بومدین اسے معاصر عرب سربراہوں میں اشتراکیت دوستی اور سیاسی امور میں سوویٹ روس سے مشورہ کرنے کے سلسلے میں پیش پیش رہے ہیں اور جب ۱۹۶۷ء

---

[1] رسالہ مسلم ورلڈ (MUSLIM WORLD) مضمون نیشنلزم اینڈ اسلام (NATIONALISM AND ISLAM) اشاعت اکتوبر ۱۹۶۲ء ترجمہ ماخوذ از "صدق جدید" ۳۰ نومبر ۱۹۶۲ء۔

کی جنگ میں روس نے ــــ ایسا موقف اختیار کیا جو شکست خوردہ عربوں کے لئے بالکل خلاف توقع تھا، اور اس کے نتیجے میں ان عرب ممالک میں ناراضگی اور ناامیدی کی لہر دوڑ گئی، جو اشتراکیت کی طرف خاصا میلان رکھتے تھے، اور روس کے خلوص و دوستی پر ان کا عقیدہ متزلزل ہونے لگا، تو ایسے وقت میں صدر ہواری بومدین نے عرب ممالک اور عرب قوم میں روس کے لئے نیا اعتماد پیدا کرنے میں خاصا اہم رول ادا کیا تھا، اور از سر نو تعلقات کو بحال کرنے کے سلسلے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔

اسی طرح ایشیا اور افریقہ کے بعض ممالک پر "ترقی" اور اشتراکیت کے دائرہ میں نئے داخل ہوئے تھے، اسلامی شعائر کو بدلنے اور ان ممالک کو تیزی سے سیکولرزم اور اشتراکیت کی طرف لے جانے کا گویا اعصابی دورہ پڑا اور اس سلسلے میں انھوں نے بعض اوقات بنیادی انسانی حقوق اور بنیادی جمہوری حقوق کو بھی پامال کر دیا اور ان کے سربراہوں سے بعض دفعہ ایسی وحشت و بربریت سفاکی کا اظہار ہوا، جس کی نظیر آج کی مہذب دنیا میں ملنا مشکل ہے، چنانچہ جمہوریہ جنوبی یمن سے شعائر اسلامی کی بے حرمتی، علمائے دین کی توہین اور دین سے استخفاف کی ایسی خبریں آئیں، جن سے ایک طفلانہ ذہنیت، جذبۂ انتقام اور دین سے سخت بیزاری کا اظہار ہوتا ہے۔

اسی طرح خبر رساں ایجنسیوں اور یورپی اخباروں نے یہ خبر نشر کی کہ علماء کی ایک جماعت (جس کی تعداد ۱۰ تک تھی) صومال میں اس لئے زندہ جلادی گئی کہ انھوں نے بعض سرکاری احکام کی مخالفت کی تھی، جو قرآنی نصوص اور اسلامی مسلّمات سے ٹکراتے تھے، جیسے ترکہ میں مرد و زن کی مساوات، اور عورتوں کو حق طلاق وغیرہ۔

لیبیا[1]

شمالی افریقہ کا مشہور ملک لیبیا جس کی سرحدیں مشرق میں مصر و سوڈان جنوب میں چاڈ اور نائجیریا اور مغرب میں الجزائر اور تیونس سے ملتی ہیں گذشتہ چند سالوں سے پٹرول کی کثیر پیداوار کی وجہ سے بڑی اہمیت کا حامل ہوتا جا رہا ہے۔

۱۸۴۳ء میں سید محمد بن علی السنوسی (۱۷۹۱ء ۔ ۱۸۵۹ء) نے جو مشہور صاحب سلسلہ بزرگ گذرے ہیں اپنے سلسلہ کی تعلیم و تربیت کے لئے یہاں قیام کیا تھا، ان سے سوڈان صحرائے اعظم اور مغربی افریقہ میں غیر مسلموں میں اسلام کی وسیع اشاعت ہوئی اور قدیم الاسلام مسلمانوں کی تربیت و قلب ماہیت ہوئی، ان کی دعوت اور تحریک جہاد کے اثرات لیبیا اور سنٹرل افریقہ میں بہت جلد پھیل گئے۔

۱۸۵۹ء میں ان کی وفات ہوئی، ان کے صاحبزادہ اور لائق جانشین سید مہدی السنوسی نے اسلام کی صحیح روح و تعلیم کے مطابق اور صحابۂ کرامؓ اور صدر اول کے نقش قدم پر باطنی اور جسمانی تربیت اور مجاہدہ و جہاد دونوں کو نہایت کامیابی کے ساتھ جمع کیا، اپنی وسیع النظری اور علمی و عملی جامعیت کی بدولت صحرا کو چمن، روحانی خانقاہ کو مدرسہ و انجمن اور طلبائے علوم اور سالکین طریق کو سر بکفن مجاہدین میں تبدیل کر دیا، ان کے بھتیجے سیدی احمد الشریف نے (جنہوں نے امام سنوسی کے نام سے ساری دنیا میں نام پیدا کیا) ان کے بعد اس تحریک کو چار چاند لگا دیئے اور برقہ و طرابلس کی جنگ میں اٹلی اور یورپ سے اپنی اور اپنے مجاہدین کی شجاعت و استقامت اور اپنی قائدانہ صلاحیت کا لوہا منوا لیا، سنوسی مجاہدین کامل ۲۰ برس تک اٹلی کی مستحکم و وسیع اطالوی سلطنت کے مقابلہ میں صف آرا رہے اور بالآخر اس کو لیبیا سے دستبردار ہونے پر مجبور کیا۔

---

[1] عنوان ذیل کے ماتحت مضمون مولانا ابوالحسن علی ندوی کے قلم سے ہے۔

۱۳۵۱ھ سنہ ۱۹۳۲ء میں سیدی احمد الشریف نے مدینہ طیبہ میں وفات پائی۔[1]

۱۹۵۱ء میں لیبیا کو مکمل آزادی ملی اور سیدی محمد ادریس السنوسی ۱۹۵۲ء میں پہلے سربراہ مملکت منتخب ہوئے جو سید مہدی کے صاحبزادہ اور امام سنوسی کے چچازاد بھائی تھے۔

سنوسی شیوخ کی روحانی تربیت اور دعوت وجہاد کے اثر سے لیبیا کے عوام پر دینی رجحانات کا غلبہ رہا اور ان کی دعوت کے نتیجہ میں ایسی مستحکم دینی بنیاد پڑ گئی جس کو کوئی قیادت آسانی سے توڑ نہیں سکتی تھی، اور یہی سبب ہے کہ لیبیا کے عوام پٹرول کی دریافت کے باوجود مغرب کی صنعتی اور تمدنی زندگی کے گہرے اثرات سے بڑی حد تک محفوظ رہے۔

۱۹۶۹ء میں لیبیا میں فوجی انقلاب ہوا، کرنل محمد قذافی نے جن کی عمر انقلاب کے وقت ۲۷ برس تھی، انقلابی کونسل کے صدر کی حیثیت سے ملک کی قیادت اپنے ہاتھ میں لی۔

کرنل قذافی نے اپنی انقلابی حکومت کی بنیاد عرب قومیت، اور مغرب کی غلامی سے مکمل آزادی پر رکھی، برطانیہ اور امریکہ کے فوجی اڈوں کے معاہدے منسوخ کئے، اور مغربی ممالک کے ماہرین کی جگہ عرب ملکوں کے ماہرین کا تقرر کیا، عربی زبان کی اشاعت اور ترقی کے لئے احکام جاری کئے، شراب پر پابندی لگائی، اور بعض شرعی حدود کا نفاذ کیا۔

برطانیہ اور اٹلی کے عہد حکومت میں عیسائیوں کے جو اثرات لیبیا میں پھیل گئے تھے کرنل قذافی نے ان کو دور کرنے کے لئے عیسائی مشنریوں پر پابندی لگائی، لیبیا کی فوجی طاقت کو ترقی دینے کے لئے اقدامات کئے، اور فرانس اور روس سے فوجی معاہدے کئے، تعلیم کے عام کرنے کے لئے

---

[1] سنوسیوں بالخصوص سیدی احمد الشریف کے مجاہدانہ کارناموں اور ان کی دلآویز شخصیت سے تعارف حاصل کرنے کے لئے "حاضر العالم الاسلامی" (جلد دوم) میں امیر شکیب ارسلان کا مفصل مضمون "السیدی احمد السنوسیۃ" (ص ۱۴۰-۱۶۵) نیز کتاب "السنوسیۃ دین و دولۃ" از محمد فواد شکری کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

تعلیمی ادارے قائم کئے، اور تعلیم بالغان کے لئے شبینہ مراکز کھولے۔

کرنل قذافی کے ان اصلاحی اقدامات اور ابتدائی عہد میں مذہبی رجحانات کی وجہ سے مغربی صحافت نے ان کی طرف خاص توجہ کی، ان کو کٹر مذہبی لیڈر کی حیثیت سے مغربی پریس نے پیش کرنا شروع کیا، اور ان کے ذریعہ اسلام کے احیاء کا پروپیگنڈہ زور وشور سے شروع کیا گیا۔

یہ تعجب کی بات ہے کہ عیسائیوں کے خلاف کرنل قذافی کی کارروائیوں اور بعض مغربی ملکوں خاص طور پر برطانیہ اور امریکہ سے فوجی معاہدوں کی منسوخی کے باوجود مغربی پریس میں ان کے خلاف نفرت یا ناگواری نہیں ظاہر کی گئی، اس کے برخلاف ان کی شخصیت کو نمایاں کرنے اور مذہبی حلقوں میں ان کی اہمیت کو بڑھانے میں مغربی پریس نے اہم رول ادا کیا، بعض مغربی کالم نویسوں نے انھیں اس عہد کا محمدؐ تک قرار دیا۔

کرنل قذافی بعض طبعی وجوہ کی بنا پر شروع سے غیر متوازن انتہا پسندانہ اقدامات کرنے کی وجہ سے پریس کی توجہ کا مرکز بنے رہے، اپنے ذاتی خیال کے مطابق اسلام کے احیاء کا غیر معمولی شوق، اور اس کے علمبردار بننے کی فکر کی وجہ سے مختلف عالمی کانفرنسوں اور عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان ڈائیلاگ (حوار) میں شرکت اور مستشرقین سے رابطہ کی وجہ سے بہت جلد ان کے انقلابی افکار کا دائرہ سیاست سے ہٹ کر دینی فکر میں انقلاب تک وسیع ہو گیا۔

سیاسی میدان میں جو اقدامات مختلف موقعوں پر ان سے ظاہر ہوئے انہی سے ان کے عدم توازن اور ذہنی اضطراب کا اندازہ ہوتا ہے، ۱۹۷۱ء میں لیبیا، مصر و شام کے ساتھ اتحاد میں شریک ہوا، ۱۹۷۳ء میں مصر و لیبیا کے درمیان مکمل اتحاد قائم ہوا اس کا مطالبہ خود قذافی کی طرف سے کیا گیا تھا۔

جمال عبدالناصر کے بارے میں کرنل قذافی کے خیالات کا اظہار اس وقت ہوا،

جب انورالسادات نے گذشتہ عہد کے بعض اقدامات اور تنظیموں کے خلاف کارروائی شروع کی، اور مصری پریس میں ناصر کے خلاف مضامین شائع ہوئے، اور ناصر کے بعض معتمد علیہ اشخاص کو ہٹایا گیا، معمر قذافی نے اس وقت ناصر سے اپنے تعلق اور ان سے انتساب اور شاگردی کا اعلان کیا، آخری مصر اسرائیل جنگ کے دوران دونوں ملکوں میں سخت اختلاف رونما ہوا، مصر میں ناصر کے بعد اخوان پر سے پابندیوں میں نرمی کی گئی، اور اسلامی لٹریچر کی اشاعت پر سے قیود کم ہوئے تو لیبیا میں اسلامی لٹریچر پر پابندیاں سخت کی گئیں، اسلامی مصنفین کی دعوتی کتابوں پر پابندیاں عائد کردی گئیں۔

مصر اسرائیل جنگ کے بعد روس لیبیا تعلقات میں اضافہ ہوا اور مصر کی جگہ روس نے لیبیا کو مرکز بنالیا۔

کرنل قذافی کی فکر میں انقلابیت کا شروع سے غلبہ رہا، انھوں نے جو اقدامات کیئے وہ انقلاب کی روح سے متأثر تھے، جمال عبدالناصر کے انتقال کے بعد سے خاص طور پر ان کو عالم عربی میں خلا محسوس ہوا جس کو پُر کرنے کے لئے انھوں نے صرف اپنے کو اہل پایا اور اس مقصد کی تکمیل کے لئے وہ برابر کوشاں رہے۔

کرنل قذافی نے شروع سے یہ اندازہ لگایا کہ یہ عہد اسلام کی نشأۃ ثانیہ کا ہے اس لئے انھوں نے شروع سے اپنے کو اس نشأۃ ثانیہ کا قائد تصور کرلیا لیکن انقلابی ذہن، تربیت و تعلیم کی کمی، مغربی افکار کے اثر سے جن کے سایہ میں ان کی پرورش ہوئی تھی، لیبیا کی دولت اور اس کی سیاسی، جغرافیائی اور اقتصادی اہمیت کے باعث اور حد سے بڑھی ہوئی خوداعتمادی کی وجہ سے انھوں نے یہ تصور قائم کرلیا کہ

وہ اسلام جو کتاب وسنت سے ماخوذ ہے، اس انقلابی عہد کا ساتھ نہیں دے سکتا، اس لئے انھوں نے اسلام کو اپنے انقلابی ذہن کے سانچہ میں ڈھالنے کی کوشش کی تاکہ اس سے وہ ایسے اسلام کا ایڈیشن تیار کر سکیں جو اس عہد کے پورے مغربی نظام کے ساتھ چل سکتا ہو، اس انقلابی کوشش کی وجہ سے ان کو بعض مغربی مفکرین نے اس عہد کا نبی تک قرار دے دیا، اور بعض انقلابی ذہن کے مسلمانوں نے مفکر عصر کا خطاب دیا۔

کرنل قذافی نے بعض مغربی اقدار، جو سرمایہ دارانہ تھے، اور بعض اشتراکی اقدار قبول کیئے، زندگی کے صنعتی تصور کے غلبہ کی وجہ سے انھوں نے لیبیا کو صنعتی ملک بنانے کی کوشش میں غیر ملکیوں کو کھلی چھوٹ دے دی، جس کے نتیجہ میں مذہب کی رعایت کے بغیر لیبیا کی آبادی میں غیر ملکیوں کا بڑا اضافہ ہوا، اور اس سے لیبیا کی اجتماعی زندگی بری طرح متاثر ہوئی یہ ان کی عجلت پسندی اور آمرانہ ذہن کا نتیجہ تھا۔

کرنل قذافی نے جمال عبدالناصر کے انتقال کے بعد مختلف ملکوں میں انقلاب کا نظریہ عام کرنے اور وہاں قائم نظاموں کے خلاف رجحانات کو تقویت پہونچانے کا کام اپنے ذمہ لیا، انھوں نے سرمایہ داری اور اشتراکیت، مذہب اور مغربی تمدن اور افکار کے درمیان مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی، اور کچھ ایسے اقدامات کیئے، اور بیانات دیئے، جو اسلام کے تسلیم شدہ افکار و نظریات کے خلاف تھے، ان کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسلام کو محض عبادت تک محدود کرنا چاہتے ہیں، عبادت اور عام زندگی کے بارے میں ان کا تصور تونس کے حبیب بورقیبہ کے بعض افکار سے بہت قریب ہے، جو مستشرقین کی طرف سے پیدا کیئے ہوئے شکوک و شبہات اور اعتراضات کا نتیجہ ہیں۔

حبیب بورقیبہ نے قرآن کریم کے بارے میں اپنے شکوک وشبہات کا اظہار کیا تھا، اور نماز، روزہ کے اوقات اور ضرورت پر اپنے مخصوص خیالات پیش کیے تھے، جو امت اسلامیہ کے تسلیم شدہ فکر کے خلاف تھے، معمر قذافی نے اسلامی زندگی پر حملہ کرنے کے لئے حدیث کا انتخاب کیا، ان کی رائے میں عبادت کے طریقۂ نظام تک حدیث کو محدود رکھنا چاہیے، باقی زندگی کے بارے میں احادیث کا انطباق اس زمانہ پر نہیں ہو سکتا، معمر قذافی کا اس سے ظاہری مقصد اسلام کو صرف عبادت تک محدود رکھنا ہے، تاکہ عیسائیت کی طرح اسلام زندگی سے منقطع ہو جائے، انھوں نے ایک مجلس میں علماء کے سامنے حدیث کے بارے میں ایسے خیالات کا اظہار کیا جن پر اسلامی حلقوں نے سخت احتجاج کیا، ان کے خیالات صرف حدیث سے انکار کے مرادف ہی نہیں ہیں، بلکہ اطاعتِ رسول سے انحراف کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اپنی گفتگو میں انھوں نے دعویٰ کیا کہ حدیث کی صحت مشکوک ہے اس لئے کہ تدوینِ حدیث کے عہد میں بقول ان کے کثرت سے جھوٹی حدیثیں حضور کی طرف منسوب کی گئیں، انھوں نے حدیث میں تعارض بھی ثابت کرنے کی کوشش کی جس طرح ان سے پہلے تونس کے حبیب بورقیبہ نے قرآن میں تعارض ثابت کرنے کی کوشش کی تھی، تیسری بات انھوں نے یہ کہی کہ اکثر اقوال حضور کے عہد کے تصور کے مطابق ہیں، اب حالات بدل گئے ہیں اس لئے دنیا کے معاملات میں ان اقوال کا انطباق نہ ہوگا، "انتم أعلم بأمور دنیاکم" کا ان کے نزدیک یہی مطلب ہے۔

معمر قذافی کا خیال ہے کہ حدیث پر اعمال کی بنیاد رکھنا صحیح نہیں ہے کیونکہ یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ صحیح حدیث ہے یا موضوع، اس لئے صرف قرآن پر انحصار کرنا چاہیے۔

معمر قذافی سے علماء نے جب اس سلسلہ میں گفتگو کی تو انھوں نے اپنے خیالات پر اصرار کیا، بعض اخبارات کی رپورٹوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے علماء کو دھمکی دی کہ اگر ان کے اصلاحی اقدامات کی راہ میں علماء رکاوٹ ڈالیں گے تو وہ ان کے ساتھ وہی معاملہ کریں گے، جو مصطفےٰ کمال نے علماء کے ساتھ کیا، اس گفتگو میں انھوں نے مصطفےٰ کمال کی کارروائیوں کو حق بجانب بتایا، علماء کے ساتھ ان کی گفتگو سے ان کا مصطفےٰ کمال سے تأثر اور مرعوبیت پوری طرح ظاہر ہوتی ہے، جمال عبدالناصر سے شاگردی کا تعلق تو وہ اکثر ظاہر کرتے رہے ہیں، عبادات اور نظام حیات کے بارے میں حبیب بورقیبہ سے اتفاق بھی پوشیدہ نہیں ہے، اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں ہیں، اور وہ اسی مدرسہ کے شاگرد ہیں، انھوں نے اپنے افکار کتابی شکل میں جو "الکتاب الاخضر" کے نام سے موسوم ہے، ظاہر کیے ہیں جس میں اقتصادی، اجتماعی اور سیاسی امور پر ان کے افکار ہیں۔

ایک مشہور عرب جماعت "حزب التحریر" کا ایک وفد معمر قذافی سے ملا، اور اس نے ان کے خیالات کی تصحیح کی کوشش کی [1]، اس کے علاوہ رابطہ عالم اسلامی کا ایک موقر وفد جس میں مختلف مسلم ملکوں کے نمائندے تھے، ان سے ملا، اور ان سے اس سلسلہ میں گفتگو کی لیکن ان کے خیالات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔

وفد سے قذافی نے کہا کہ سنت کو نماز، روزہ، حج کی ادائیگی کے سلسلہ میں وہ تسلیم کرتے ہیں، البتہ دوسرے معاملات میں وہ صرف ان احادیث کو تسلیم کریں گے جو ان کے نزدیک صحیح ہوں گی، یا عقل کے مطابق، وفد نے ان سے احادیث کی صحت، سالمیت اور

---

[1] ملاحظہ ہو اس کی رپورٹ یا اس کا اردو ترجمہ مندرجہ "تعمیر حیات" ۲۵ فروری ۱۹۷۹ء، ۱۰ مارچ ۱۹۷۹ء۔

پوری زندگی پران کا انطباق قرآن کی روشنی میں بیان کیا اور ان سے اپنے خیالات سے رجوع کرنے اور توبہ کرنے پر اصرار کیا، معمر قذافی نے جواب دیا کہ وہ اپنے خیالات کی وضاحت اپنی ایک مستقل تصنیف میں کریں گے۔

اسلامی تقویم (کیلنڈر) پر اعتراض

حدیث کے مسئلہ پر جمہور کی رائے سے اختلاف کے بعد قذافی نے ہجری سال کے افتتاح کے موقع پر ایک تقریر میں ہجری تقویم (کیلنڈر) پر اعتراض کیا، انھوں نے کہا کہ ہجرت سے کیلنڈر کو شروع کرنا غلطی ہے، اہم واقعہ حضور کی وفات ہے اس لئے کیلنڈر کو یوم وفات سے شروع ہونا چاہیے، علماء کی تفہیم کے باوجود معلوم ہوا کہ لیبیا میں ترمیم شدہ کیلنڈر شائع کر دیا گیا۔

اس کے علاوہ اخبارات کی بعض اطلاعات سے یہ بھی معلوم ہوا کہ قرآن اور نماز کے طریقہ پر بھی قذافی کے خیالات تسلیم شدہ اسلامی عقائد و فکر سے مختلف ہیں، جن کا اظہار انھوں نے مختلف مجالس میں کیا، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے خیالات کا مرجع مستشرقین اور اعدائے اسلام کے اقوال و نظریات ہیں، یا ان کے ذہن کی تشکیل ہی ایسی ہوئی ہے، جس سے اس طرح کے تفردات اور جدت کا اظہار ہوتا ہے۔

لیبیا اور مراکش

لیبیا و مراکش خالص مسلم اکثریت کے وہ دو عرب ملک ہیں، جہاں دینی دعوت، جہاد فی سبیل اللہ، اسلام کی راہ میں قربانی و سرفروشی پر ملک کی آزادی و حکومت کی بنیاد پڑی،

دونوں ملکوں میں ان خاندانوں نے حکومت کی داغ بیل ڈالی، جو اپنی شرافت نسبی وعلمی فضیلت کے ساتھ اپنے مستقل روحانی سلسلے رکھتے تھے، اوران ملکوں کے مسلمان (عرب وبربر) ان کو احترام وعقیدت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، ان کو اپنے ملکوں کا سیاسی قائد ورہنما سمجھنے کے ساتھ، بلکہ اس سے زیادہ اپنا روحانی پیشوا اور دینی مقتدا بھی سمجھتے تھے، مراکش میں صدہا سال تک سیدی ادریس، اور سیدی علی الشریف کے خاندان نے حکومت کی، اور لیبیا کو سیدی احمد الشریف السنوسی اور ان کے رفقاء کے مجاہدانہ کارناموں اور سرفروشیوں کی بدولت اٹلی کی غلامی سے آزادی اور خود مختار حکومت کا موقع نصیب ہوا، لیکن اب یہ دونوں ملک تہذیب وتمدن، تعلیم وتربیت کی پالیسی، زندگی کے مختلف شعبوں میں منصوبہ بندی کے کام میں اس وقت مغرب ہی کو عملاً اپنا امام مانتے ہیں، ریڈیو، ٹیلی ویژن اور جدید تعلیم کے ذریعہ ایک ایسی نسل کے تیار کرنے میں مصروف ہیں، جس کے احساسات وجذبات اور جس کے اقدار ومعیار اس نسل سے بنیادی طور پر مختلف ہوں گے، جس کی قربانیوں اور سرفروشیوں کی بدولت ان ملکوں میں آزادی کی صبح طلوع ہوئی، اور انھوں نے عزت واحترام کا مقام حاصل کیا، دونوں ملکوں میں اشتراکی رجحان پایا جاتا ہے، دونوں جگہ اسلامی فکر ودعوت کے علمبرداروں کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے، لیبیا نے جس فلسفہ ومسلک کو اپنایا ہے، وہ اسلام، اشتراکیت اور قومیت عربیہ کا مجموعہ ہے اس کے قائد معمر القذافی نے مصر کے سابق صدر جمال عبدالناصر کو ہمیشہ اپنا استاد ومربی، اور اپنے لئے مثالی شخصیت تسلیم کیا دونوں ملکوں کے سربراہوں کے مقاصد واعلانات کے غیر واضح ہونے کے باوجود اتنی بات صاف نظر آتی ہے کہ دونوں نے مغرب کو فکری اور تہذیبی طور پر اپنا قائد ورہنما تسلیم کرلیا ہے، اور وہ محتاط وتدریجی طور پر اسی منزل کی طرف سرگرم سفر ہیں۔

توڑ پھوڑ کا عمل اور قدیم ملبہ کا ازالہ

مغربی تہذیب و فلسفہ کا یہ شجر جس کی پرورش اور نشو ونما کے لئے یورپ کی آب و ہوا بہت راس آئی تھی اور اس میں اس کی غذا اور پرورش کے وافر اسباب موجود تھے یہ درخت مغرب سے اسلامی سرزمین میں منتقل کیا گیا، اس کے لئے فضا سازگار بنائی گئی، زمین ہموار کی گئی، پھر بہت اچھی طرح زمین کھود کر اس کو لگایا گیا، تا کہ وہ مضبوطی سے قائم رہے، اس کے بعد اس کے لگانے والوں نے توڑ پھوڑ کی کارروائی شروع کی بقول ان کے اس قدیم فکری اور اجتماعی ملبہ کو ہٹانا شروع کیا ہے، جو اس کے چاروں طرف پھیلا ہوا ہے، اس تخریبی عمل اور توڑ پھوڑ کی کارروائی میں اس قدر انسانی طاقتیں اور صلاحیتیں اور قیمتی اوقات صرف ہو رہے ہیں کہ اگر وہ کسی ایجابی اور تعمیری کوشش پر صرف ہوتے اور ایمان، دینی دعوت اور اخلاقی اصلاح کے ذریعہ اس مسلم قوم کی مخفی قوتوں اور پوشیدہ صلاحیتوں کو بیدار کرنے کی کوشش کی جاتی تو ملک و قوم کو یقیناً بڑا فائدہ پہونچ سکتا تھا۔

ترقی پسندوں کی رجعت پسندی

یہ متجددین (MODERNISTS) کبھی کبھی تجدد اور ترقی کی رو میں مغرب کے ایسے فلسفوں اور نظاموں اور ایسے تعلقات اور رشتوں کا سہارا ڈھونڈھنے لگتے ہیں، جو مغربی سوسائٹی میں عرصہ ہوا اپنی اہمیت اور قیمت کھو چکے ہیں، اور اب رجعت پسندی اور قدامت پرستی کی علامت اور پرانے تجربات کے ان بچے کھچے آثار کی حیثیت سے باقی رہ گئے ہیں، جن کو قائدین مغرب نے اپنے اجتماعی تجربوں کے دوران ایک محدود مدت کے لئے اختیار کیا تھا، لیکن اس کی مضرتیں اور نقصانات عیاں

ہونے کے بعد ان کو خیرباد کہنے پر مجبور ہوئے اور اس سے بہتر اور وسیع نظریہ اور فلسفہ کے سایہ میں پناہ لی۔

اس کی سب سے اچھی مثال قومیت (NATIONALISM) ہے جس کو اب یورپ ترک کر چکا ہے،
لیکن مشرق اسلامی کی بعض قیادتیں اس کو اب بھی سینہ سے لگائے رکھنے پر مصر ہیں اور اس کو انسانی
فکر کی پرواز اور ترقی کی آخری شکل سمجھتی ہیں، حالانکہ وہ محدود قبائلی زندگی اور بدویانہ طرز فکر کی
ایک وسیع تر اور ترقی یافتہ شکل تھی، وہ دراصل ایسا لباس کہنہ ہے جس کو خود اہل مغرب نے اتار کر
پھینک دیا ہے، اب ان کے نزدیک وہ تخریبی اور تباہ کن عنصر اور قوت ہے جس نے انسانی معاشرہ
کی وحدت کو پارہ پارہ کر دیا ہے، اور نسل انسانی کی شکل و صورت بگاڑ دی ہے۔

مغرب و مشرق کے بالغ نظر، کہن سال اور آزاد مفکرین و اہل نظر اب قوم پرستی (نیشنلزم)
کو نفرت و حقارت کی نظر سے دیکھنے کے عادی ہو گئے ہیں، وہ اس کو زمانۂ قدیم کا ایک پرانا
فیشن اور رجعت پسندی و قدامت پرستی کا ایک نشان تصور کرتے ہیں، اور اس کو انسانیت
اور امن عالم کے حق میں سب سے بڑا مہلک اور تخریبی عنصر سمجھتے ہیں، اور انسانی وحدت اور
عالمگیر برادری کے قیام کے داعی ہیں، یہاں عبرت کے لئے دو عظیم مغربی و مشرقی مفکرین کی رائے
پیش کی جاتی ہے، ان میں ایک مشہور مغربی فاضل آرنلڈ ٹائنبی (ARNOLD TOYNBEE) ہیں،
دوسرے ہندوستان کے مشہور فلسفی و مفکر، سابق صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر رادھا کرشنن ہیں،
ٹائنبی اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں :-

"انسانیت کا مستقبل اس روحانی اخوت پر منحصر ہے جسے کوئی مذہب ہی تشکیل دے سکتا ہے،
نوع انسانی کو آج اسی کی احتیاج ہے، کمیونزم کا دعویٰ ہے کہ وہ نوع انسانی کو متحد کر سکتا
ہے، اسلام افریقہ میں اپنے آپ کو نوع انسانی میں اتحاد پیدا کرنے والی ایک قوت ثابت کر رہا
ہے، عیسائیت بھی یہی کردار ادا کر سکتی ہے بشرطیکہ وہ اپنے اصولوں کو برت کر دکھائے،

تاہم نیشنلزم نوع انسانی کو متحد نہیں کرتا بلکہ اسے مختلف ٹکڑیوں میں تقسیم کرتا ہے چنانچہ
اس کا کوئی مستقبل نہیں ہے، وہ اس کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتا کہ نوع انسانی کو تباہ
کر دے اور اپنے آپ کو اس کے کھنڈرات میں دفن کر دے۔

ایٹمی دور میں ہمیں دو انتہاؤں میں سے کسی ایک کو منتخب کرنا ہوگا، اگر ہم اپنے آپ کو
تباہی اور بربادی سے ہمکنار کرنا نہیں چاہتے تو ہمیں کسی استثناء کے بغیر تمام نوع انسانی
کو اپنی آغوش میں لے کر ایک واحد متحدہ انسانی کنبہ کی حیثیت سے زندہ رہنا
سیکھنا ہوگا۔[1]

سابق صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر رادھا کرشنن نے ۱۰ رجون ۱۹۶۳ء کو انجمن اقوام متحدہ
(U.N.O.) میں تقریر کرتے ہوئے اقوام عالم سے "صفحۂ ارض پر ایک خاندان" کے ایک تصور کو اپنانے
کی تلقین کی تاکہ دنیا فوجی قوم پرستی کے پنجہ سے محفوظ رہ سکے۔ انھوں نے کہا کہ:۔

"خطرناک ایٹمی تجربات بند کرنے سے انسان کی معذوری کسی بہت بڑی غلط
اندیشی کی نشان دہی کرتی ہے۔

تاریخ شاہد ہے کہ سیاسی غلبہ، نسلی امتیاز، اور اقتصادی استحصال نے انسان کو
جنگ کی آگ میں جھونکا ہے، اور اگر آج آپ اس سیاسی غلبہ اور معاشی استحصال کو
ہر طرف خوشحالی لا کر اور نسلی امتیاز کا قلع قمع کر کے ختم کر دیں تو عالمی امن کے حق میں
یہ بہت بڑی خدمت ہوگی۔

وطن پرستی انسان کا اعلیٰ ترین تصور نہیں بلکہ اصل چیز ایک عالمی برادری کا تصور ہے،
ہم رہتے تو ایک نئی دنیا میں ہیں، مگر ہمارے خیالات فرسودہ ہیں۔"[2]

---

[1] NATIONAL HERALD   [2] ISLAMIC REVIEW - MARCH, 1961.

تجدّد کے داعیوں کی نقّالی

مغربی زندگی کے تجربوں کو ایک مشرقی اسلامی ملک میں دہرانے کی یہ مخلصانہ اور بااصرار کوشش اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ ان ممالک کے رہنما باوجود اپنی وسیع عصری تعلیم و ثقافت اور بڑی بڑی ذمہ داریوں پر فائز ہونے کے ابھی دماغی لحاظ سے عہدِ طفولیت' اور نقل و تقلید اور اپنے مغربی اساتذہ کی نیازمندانہ شاگردی کے دور میں ہیں' وہ آزادانہ طریقہ پر سوچنے' جدتِ فکر' تخلیقی صلاحیتوں' ٹھوس اور سنجیدہ طریقِ کار سے محروم ہیں' وہ نہ صرف اپنی قوم کے مزاج سے ناواقف اور اس کی طاقتوں اور صلاحیتوں سے بے خبر ہیں' بلکہ مغربی فکر کی ترقی و تبدیلی کا ساتھ دینے سے بھی قاصر ہیں' اور مغربی سوسائٹی جس بے چینی' بے یقینی' بے دلی اور اکتاہٹ کا شکار اور ایمان و روحانیت کی پیاسی ہے' اس سے بھی بے خبر اور ناواقف ہیں۔

نامذہبیت اور الحاد کی تبلیغ کرنے والوں کی دورخی پالیسی

اس نامذہبیت' روشن خیالی اور ترقی پسندی کے پرجوش و سرگرم داعیوں اور مبلغوں کا جنھوں نے عالمِ اسلام میں "تجدد" کا صور پھونک دیا ہے' خود اپنے حلقۂ اثر اور اپنے گھر میں اس بارے میں کیا طرزِ عمل ہے اور انھوں نے اپنی حکومتوں اور حدودِ مملکت میں نامذہبیت کو نافذ کیا ہے یا وہ جب موقع آیا تو کٹر مذہبی' رجعت پسند اور احیاء پرست ثابت ہوئے ہیں؟ جہاں تک ان دانشوروں اور حکومتوں کا سوال ہے جو مسیحی دنیا سے تعلق رکھتی ہیں' اس کے متعلق بہت کچھ لکھا جاچکا ہے۔[1]

---

[1] ملاحظہ ہو امیر شکیب ارسلان کی کتاب "حاضر العالم الاسلامی" ج ۳ عنوان "قضیۃ فصل الدین عن السیاسۃ" ص ۲۲۵ تا ۲۳۹

مسیحی مستشرقین کی تحریروں میں جو مشینری اسپرٹ جنگ صلیبی کی یادوں کی تلخی، ترکوں سے عصبیت ان کے خلاف انتقامی جذبہ نمایاں ہوکر سامنے آجاتا ہے، وہ کسی صاحبِ نظر سے مخفی نہیں ہے، ان مستشرقین میں (جو عالم اسلام کے لئے سیکولرزم اور اسلامی شریعت وقانون سے بغاوت اور بے اطمینانی کے سب سے بڑے مبلغ ہیں) بڑی تعداد یہودیوں کی ہے، جو اپنے مذہب اور ہم مذہبوں کے بارے میں سخت قدامت پسند، احیاء پرست اور غیر روادار واقع ہوئے ہیں، اسرائیل کی حکومت خود خالص مذہبی بنیاد پر قائم ہوئی اس نے ریاست کے دستور سے لے کر روزمرہ کی زندگی تک، اور مذہبی فرائض و احکام سے لے کر سیاسیات و اقتصادیات کے میدان تک جس طرح تورات کی تعلیمات کو دانتوں سے مضبوط پکڑا ہے، اور اس بارے میں لکیر کی فقیر ثابت ہوئی ہے، وہ عالم اسلام کے لئے صرف درس عبرت ہی نہیں بلکہ تازیانۂ غیرت بھی ہے، اور اس بات کا روشن ثبوت ہے کہ روشن خیالوں کے منہ میں دو زبانیں ہوتی ہیں، ایک دوسروں سے گفتگو کے لئے، اور ایک اپنوں سے بات چیت کرنے کے لئے، اور سیکولرزم بلکہ الحاد و مذہب دشمنی کی ساری تبلیغ بھولے بھالے اسلامی ممالک کے لئے ہے جنھوں نے نئی نئی آزادی حاصل کی ہے، یہاں پر ایک سابق کمیونسٹ عرب کے مضمون کے کچھ اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں جس نے عرصہ تک یہودی کمیونسٹوں کے دوش بدوش کام کیا ہے، وہ لکھتا ہے:۔

"عالم عربی کے قلب میں، تورات کے ایک نبی کے نام پر ایک حکومت قائم ہوئی ہے اس کا کوئی دستور نہیں، کیونکہ تمام مذہبی پارٹیاں تورات ہی کو دستور قرار دینے پر مصر ہیں اس میں سنیچر کے دن کام کرنا قانوناً ممنوع ہے، اس سے اس کی اقتصادیات اور عالمی بنکوں سے اس کے تعلقات میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا جو اتوار کو بند

ہوتے ہیں، بلکہ ان کو اس پر بھی اصرار ہے کہ کلیسا کے ہفتہ وار جلسے اتوار ہی کو ہوں، اس حکومت میں ہر سنیچر کے دن کھانا پکانا فوجیوں کے لئے بھی حرام ہے۔"

موشے دایان اپنی کتاب "ایک سپاہی کی سرگذشت" میں لکھتا ہے:۔

"ہم نے سنیچر (۳ر جون) کو حاخام اکبر کی خصوصی اجازت سے پکا ہوا کھانا کھایا۔ اسرائیلی فوج جو بہت جلد نیوکلیائی بموں کی مالک ہونے والی ہے، وہ سنیچر کے دن کھانا پکانے سے پرہیز کرتی ہے، بن گورین اور شازار برطانیہ کے سابق وزیر اعظم مسٹر چرچل کے جنازہ میں ڈیڑھ میل پیدل چلتے ہیں کیونکہ وہ اتفاق سے سنیچر کا دن تھا، اور تورات میں سنیچر کے دن سواریوں کا استعمال ممنوع ہے، اس وقت بن گورین کی عمر ۸۷ سال کی اور شازار کی ۷۶ سال کی تھی۔"

لیکن انگریزی صحافت اور رائے عامہ کو اس میں تضحیک کا کوئی پہلو نظر نہیں آیا، بلکہ یہ ان کے نزدیک انتہائی قابل قدر چیز ہے۔

اسی طرح شہر الخلیل میں حضرت ابراہیمؑ کی پرانی مسجد میں (جس کو یہودیوں نے اب اپنا معبد بنا لیا ہے) عبادت کرنے والوں کی نصف تعداد یہودی فوجیوں کی ہوتی ہے، سائرن سے روزہ کے افطار کا اعلان کیا جاتا ہے، اسرائیلی ایر لائنز "العال" کے طیاروں اور اسرائیلی شپ سروس "زیم" کے جہازوں میں خنزیر کا گوشت نہیں دیا جاتا، منظور شدہ اسرائیلی مذہبی پارٹیاں قائم ہیں اور با اثر ہیں، وہاں سول میرج خلاف قانون فعل ہے، اور اس میں اتنی شدت ہے کہ بن گورین کے پوتے کو اسرائیل کی شہریت صرف اس وجہ سے نہیں مل سکی کہ اس کی ماں یہودیہ نہیں، عبرانی وہاں کی سرکاری زبان ہے، اور اسی میں انھوں نے راکٹ اور راڈر کو بیکار

کر دیتے، اور ہوائی جہازوں کو برباد کرنے کی ٹکنک اور سائنس سیکھی، اور اسی زبان میں ایسا ادب پیدا کیا کہ نوبل پرائز کے مستحق قرار پائے۔

لیکن ٹھیک اسی وقت ہمارے معاشرہ میں اس نے اپنے ایجنٹ برآمد کئے، جن کی ساری کارگذاریوں، تمام مساعی کی اصل غرض اور اس کا خلاصہ ہے "مذہب و سیاست کی تفریق" جب وہ سنتے ہیں کہ فلاں اسلامی ملک میں دستور کی رو سے اسلام حکومت کا سرکاری مذہب تسلیم کیا جارہا ہے تو ان پر رعشہ طاری ہوجاتا ہے، اور قومی ترقیات اور پیداوار میں رمضان کے نقصانات سے رسائل اور اخبارات کے صفحے کے صفحے سیاہ کر ڈالتے ہیں۔

ادھر بعض اسلامی ملکوں کا حال یہ ہے کہ انھوں نے روشن خیالی اور سیکولرزم کے جوش میں جنگ کے وقت "اللہ اکبر" کے نعرے کو خلاف قانون قرار دیا تھا، جون ۱۹۶۷ء کی جنگ کے پندرہ مہینہ کے بعد اس کو پھر جاری کیا۔

اس کے مقابلہ میں اسرائیل کا طرز عمل کیا ہے؟ اس کا اندازہ اس سے کیجئے کہ پہلا ٹینک جو سینا میں داخل ہوا تھا تو اس پر توراۃ کی ایک آیت لکھی ہوئی تھی۔

زبان کے معاملہ میں ایک طرف ہمارا حال یہ ہے کہ ہمارے لئے عربی زبان کی دقت اور اس کا رسم الخط ایک اہم ترین مسئلہ بنا ہوا ہے، ہم کبھی لاطینی حروف کے اختیار کرنے کی باتیں کرتے ہیں، کبھی عربی زبان کو ایک پسماندہ زبان قرار دے کر علم و تعلیم کے میدان سے ہٹادینے کی کوشش کرتے ہیں؛ ادھر حال یہ ہے کہ وہ عبرانی زبان جو دو ہزار برس پہلے مٹ چکی تھی، اب علم و ادب صحافت و سیاست اور سائنس کی زبان بن چکی ہے۔[1]

---

[1] رسالہ "البعث الاسلامی" اپریل ۱۹۶۸ء۔

تعلیم کے میدان میں اسرائیل کی پالیسی اور اس کا طرزِ عمل کیا ہے؟ اس کا اندازہ مندرجہ ذیل معلومات سے ہوگا، جو مشرقِ وسطیٰ کے ماہرینِ تعلیم کی مستند کتابوں اور رپورٹوں سے ماخوذ ہیں۔

ڈاکٹر روڈر، ماتھیوز اور ڈاکٹر متی عقراوی اپنی کتاب "التربیۃ فی الشرق العربی" میں رقم طراز ہیں کہ:۔

"فلسطین کے اسرائیلی اسکول میں سب سے اہم اور قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ سارے مضامین میں تعلیمی زبان (انگریزی، فرانسیسی، اور عربی) کے علاوہ عبرانی زبان ہے، اور تعلیم کے سارے مراحل میں مذہبی تعلیم کا سخت اہتمام ہے، مذہبی تعلیم کو صیہونیت کی بنیاد اور اس کی ترقی کا راز قرار دیا جاتا ہے۔"

اس کے بعد انھوں نے جو کچھ لکھا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ:۔

"اسرائیل میں ہر قسم کے اسکول اور ان کے رجحانات ان پارٹیوں کے تابع ہیں، جن سے ان اسکولوں کے طلباء کے سرپرستوں کا تعلق ہے، یہ پارٹیاں اپنے تعلیمی، مذہبی اور سیاسی کردار و رجحان کے اختلاف کے باوجود اس بنیادی فکر پر متفق ہیں، اور مذہبی تربیت کا خاص اہتمام و خیال رکھتی ہیں، اور بعض پارٹیوں کا خیال ہے کہ یہود کی مذہبی روایات ہی وہ مشعلِ راہ ہے جس سے نظامِ تعلیم کو روشنی و ہدایت حاصل کرنی چاہیئے اور بعض پارٹیاں اساتذہ کے لئے یہ ضروری قرار دیتی ہیں کہ وہ روایات پرست ہوں یعنی وہ لوگ یہود کی اصل روایات کے پابند ہوں۔"

رسالہ "فلسطین" نے فلسطین ہائیر کمیٹی کی رپورٹ "تحقیق و مطالعہ" سے اقتباس کر کے ایک مضمون "اسرائیل میں اعلیٰ تعلیم" کے عنوان سے شائع کیا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ:۔

"اسرائیل میں اعلیٰ تعلیم کا مقصد اصلی یہودی عقیدہ کی پرورش و ترقی اور اس سے وفاداری کا جذبہ پیدا کرنا ہے، اور اسی کے ساتھ ساتھ اسرائیل کے لئے پروپیگنڈہ کرنے اور اس کے لئے نئے نئے دوست حاصل کرنے کا فن سکھانا ہے، اس مضمون میں اس کی حیرت انگیز تفصیلات و اعداد و شمار پیش کئے گئے ہیں کہ کس طرح اسرائیل عبرانی زبان کے احیاء و ترقی، اور اس کی یونیورسٹیوں کی مالی امداد و تقویت کے لئے بے دریغ رقوم صرف کرتا ہے۔"

اس دوعملی پالیسی سے واقف ہونے کے بعد جو غیر مسلم دانشوروں نے اپنے ممالک و اقوام اور مسلم ممالک و اقوام کے بارے میں اختیار کر رکھی ہے، اس بات پر حیرت ہوتی ہے کہ کس سادہ لوحی کے ساتھ مسلم ممالک کے رہنما و دانشور "لامذہبیت اور روشن خیالی" کے منافقانہ پروپیگنڈہ کا شکار ہو گئے ہیں، غالباً ان یہودی اور مسیحی دانشوروں، مستشرقین اہل قلم اور صحافیوں کو بھی اس کا اندازہ نہ تھا کہ مسلم زعماء اور دانشور اس آسانی کے ساتھ اور اس قدر جلد ان کی اس تلقین پر ایمان لے آئیں گے اور اپنے اپنے ملک میں اس کے پرجوش داعی بن جائیں گے، اور ان سے یہ روشن حقائق مخفی رہیں گے، جیسا کہ عملی تجربہ نے ثابت کیا، دنیا کی فکری اور تمدنی تاریخ میں قیادت کے ذہنی دیوالیہ پن اور فریب خوردگی کی ایسی کم مثالیں ملیں گی جیسی مسلم قیادت نے اس بیسویں صدی میں پیش کی۔

غریب مسلم ممالک کی شاہ خرچی

مسلم ممالک کی معاشی حالت بالعموم کمزور اور متزلزل ہے، وہ دوسرے ممالک کے دست نگر اور ضروریات زندگی تک میں ان کے محتاج ہیں، خاص طور پر ان ممالک کے

عوام معاشی لحاظ سے اور معیارِ زندگی کے اعتبار سے بہت پست زندگی گزارتے ہیں، جن ممالک میں آبادی زیادہ ہے، ان کا معیارِ زندگی اور بھی پست اور ان کی معاشی حالت اور بھی خستہ اور زبوں ہے، لیکن ان ممالک کی حکومتیں ترقی یافتہ اور مرفہ الحال مغربی حکومتوں کی پوری تقلید کرنے کی کوشش کرتی ہیں، ہر ملک میں بضرورت و بلا ضرورت سفارت خانے اور قونصل خانے قائم کرنا ضروری سمجھا جاتا ہے، پھر یہ سفارت خانے وہ تمام طریقے اختیار کرتے ہیں، جو ان مغربی ممالک کے (جو دینی و اخلاقی حدود و قیود سے یکسر بے نیاز ہیں) سفارت خانے اختیار کیا کرتے ہیں، مسلم و عرب ممالک کے ان سفارت خانوں کی طرف سے مختلف تقریبات کے لئے شاہانہ دعوتوں اور کاک ٹیل پارٹیوں (COCKTAIL PARTIES) کا انتظام کیا جاتا ہے، جن میں غریبوں سے جمع کی ہوئی دولت پانی کی طرح بہائی جاتی ہے، سفارت خانوں کی طرف سے ان تقریبات میں شراب بالعموم اور کہیں کہیں "لحمِ خنزیر" بھی پیش کیا جاتا ہے، بالعموم ان سفارت خانوں کو تبلیغ اسلام اور اپنے اخلاقی اصول و معیار کے مظاہرہ اور ان ممالک کے مسلمانوں کی ہمت افزائی اور دینی رہنمائی سے کوئی سروکار نہیں ہوتا، اور ان سے بہت کم علمی و ثقافتی فائدہ پہونچتا ہے۔

بہت سے مسلم ممالک کے سربراہ (حتیٰ کہ جنھوں نے جمہوریت اور اشتراکیت کو اصول و دستور کی حیثیت سے اختیار کیا ہے) سخت مسرفانہ زندگی گزارتے ہیں، ان کے مصارف شاہانہ ہیں، اور ان کے دور سے قیصر و کسریٰ اور زارِ روس کی یاد تازہ کرتے ہیں، ان کی معاشرت اور طرزِ رہائش کو دیکھ کر الف لیلہ کے دور کی یاد تازہ ہو جاتی ہے اور ہرگز یہ یقین نہیں آتا کہ یہ غریب و خستہ حال ممالک کے سربراہ و ذمہ دار اور اشتراکیت

عوامیت کے داعی و علمبردار ہیں، یہاں پر نمونہ کے طور پر صرف اشتراکی و عوامی جمہوریہ انڈونیشیا[1] کے سابق صدر سوئیکارنو کے طرزِ عمل کے متعلق صرف ایک تاثر پیش کیا جاتا ہے، لندن کا (SUNDAY TELEGRAPH) لکھتا ہے:۔

"انڈونیشیا کے صدر سوئیکارنو نے اپنے قیام ٹوکیو کے دوران ۵ ہزار پونڈ (۷۰ ہزار روپیہ) روزانہ خرچ کئے، ان کے ساتھ ۶ افسر تھے، "گیشائیں" (طوائفیں) اور دوسری عورتیں ان کی تفریحِ طبع کے لئے اس ہوٹل میں طلب کی جاتی رہیں، جہاں صدر سوئیکارنو ٹھہرے ہوئے تھے، اور ۵۵ پونڈ روزانہ کرایہ ادا کر رہے تھے، ان کی حفاظت کے لئے ۵۰ پہریدار مقرر تھے، وہ گیشاؤں کے آنے سے سخت پریشان ہوئے، جاپان کا دفترِ خارجہ بہت پریشان ہے کہ صدر سوئیکارنو اکثر ٹوکیو پہونچتے رہتے ہیں، اور اپنی تفریحات میں مصروف رہتے ہیں، مگر چونکہ جاپان انڈونیشیا کے قدرتی وسائل سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے، لہٰذا اس نے اب تک ناراضگی کا اظہار نہیں کیا۔"[2]

حکومت اور عوام کی کشمکش

یہ مسلم زعماء اپنے مسلمان عوام کی طرف سے بڑی دقت اور مصیبت میں مبتلا ہیں،

---

[1] انڈونیشیا اپنی کثیر اور گھنی آبادی کی وجہ سے ایک غریب ملک ہے، ابھی جاوا کے نائب گورنر کا یہ بیان شائع ہوا ہے کہ وسطی جاوا میں دس لاکھ کے لگ بھگ افراد قحط سالی کا شکار ہیں، انھوں نے بتایا کہ اس وقت سرکاری ہسپتالوں میں ۱۲ ہزار افراد کو جو غذائیت کی کمی میں مبتلا ہیں طاقت کی دوائیں دی جا رہی ہیں۔

[2] SUNDAY TELEGRAPH-LONDON, 21, JANUARY 1964

اس لئے کہ وہ اپنے دینی اصولوں، ایمان کی دولت اور اپنی تاریخی میراث اور زندگی اور قوت کے اس عظیم سرچشمہ سے بے تعلق ہونے پر تیار نہیں ہیں جو اسلام نے ان کو عطا کیا ہے، اور مصلحین و مجددین امت نے اس کو باقی رکھنے کے لئے اپنا خون پانی ایک کیا ہے، اس کے لئے ان کو ایک طویل المیعاد اور وسیع پیمانہ پر توڑ پھوڑ کی کارروائی کرنی پڑ رہی ہے اور متعدد سمتوں سے مقابلہ کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔

دوسری طرف خود مسلم قوم ان قائدین اور زعماء سے سخت نالاں اور پریشان ہے، اس لئے کہ وہ اس کے مزاج اور ذوق سے ہمیشہ برسرِ جنگ رہتے ہیں، وہ ان نعروں اور اعلانوں سے اس کی قیادت کرنا چاہتے ہیں جن کو قبول کرنے کے لئے وہ تیار نہیں ہے اور جو اس کے اندر کوئی جوش اور کوئی امنگ پیدا نہیں کرتے، وہ نہ اس کے لئے موت کو آسان اور زندگی کو دشوار بنا سکتے ہیں، نہ جان و مال کی قربانی، ہجرت، ترکِ وطن اور خواہشات اور شخصی انانیت پر قابو حاصل کرنے کی صلاحیت ہی پیدا کر سکتے ہیں، قوم کی رگِ حمیت کو چھیڑنے اور اس کے جذبات کو ابھارنے میں ان نعروں اور دعووں کی بے اثری اور ناکامی ان قائدین پر ظاہر ہو چکی ہے، چنانچہ نازک اور سنگین لمحات اور فیصلہ کن معرکوں میں انھوں نے ہمیشہ دینی نعروں، اسلام کے راستہ میں جہاد اور خدا کے راستہ میں شہادت کے نعروں کی پناہ لی لیکن جب جنگ ختم ہو گئی، اور ملک کی کنجیاں ان کے ہاتھ میں آئیں تو انھوں نے وہی پرانے قومی اور وطنی نعرے دہرانے شروع کئے اور یہ فرض کر لیا کہ وہ ایک ایسی قوم پر حکومت کر رہے ہیں جو کوئی ایسا مذہب نہیں رکھتی جس سے اس کو عشق ہے، اور وہ اس کے راستہ میں جان تک دینے پر آمادہ ہے، اور نہ کسی ایسے دینی جذبہ کی حامل ہے جو تھوڑی سی تربیت اور پرورش کے بعد دنیا کی سب سے عظیم طاقت بن سکتی ہے، اور جس کے اندر بڑے بڑے امکانات پوشیدہ ہیں۔

مخفی طاقتوں اور خزانوں کی ناقدری

اس طرح ان اقوام کی طاقتیں، صلاحیتیں اور ترقی کے امکانات ضائع ہو رہے ہیں، جو اگر اچھی طرح استعمال کئے جاتے اور ان سے صحیح طور پر فائدہ اٹھایا جاتا اور یہ قائدین "نظری" سے زیادہ حقیقت پسند ہوتے تو ان سے عجیب کارناموں کا ظہور ہوتا اور آج اسلامی بلاک، مشرقی و مغربی بلاک کے مقابلہ میں ایک تیسرا طاقت ور اور فیصلہ کن بلاک ہوتا، اس کا سبب صرف ان قائدین کی کوتاہ نظری، مغرب کی اندھی تقلید، اور اپنے ملک میں اس کو جوں کا توں نافذ کرنے کا عزم ہے، اور یہ نتیجہ ہے اس غیر ملکی ثقافت کا جس کو انھوں نے اپنے ملک سے باہر رہ کر حاصل کیا ہے یا خود اپنے ہی ملک میں اس کو اچھی طرح ہضم کیا ہے اور اس کے سامنے اپنا سر تسلیم بالکل خم کر دیا ہے۔

مغربی تہذیب کی پیروی کے نتائج!

اجتماع و معاشرت اور سوشل زندگی میں مغربی طریقوں کی پیروی اور ان کے اصولِ زندگی اور طرزِ معاشرت کو قبول کر لینا اسلامی معاشرہ میں بڑے دور رس نتائج رکھتا ہے، اس وقت مغرب ایک اخلاقی جذام میں مبتلا ہے، جس سے اس کا جسم برابر کٹتا اور گلتا چلا جا رہا ہے اور اب اس کی عفونت پورے ماحول میں پھیلی ہوئی ہے اس مرضِ جذام کا سبب (جو تقریباً لا علاج ہے) اس کی جنسی بے راہ روی اور اخلاقی انارکی ہے، جو بہیمیت و حیوانیت کے حدود تک پہونچ گئی ہے[1]

---

[1] جس کا ایک نمونہ (جو محض سیاسی اسباب کی بنا پر منظر عام پر آیا) پروفیومو کے رسوائے عالم واقعہ JOHN PROFUMO SCANDAL اور ڈاکٹر وارڈ کے مقدمہ کے سلسلہ میں نظر آتا ہے۔

لیکن اس کیفیت کا بھی حقیقی و اولیں سبب عورتوں کی حد سے بڑھی ہوئی آزادی مکمل بے پردگی،
مرد وزن کا غیر محدود اختلاط، اور شراب نوشی تھی کسی اسلامی ملک میں اگر عورتوں کو ایسی ہی آزادی
دی گئی، پردہ یکسر اٹھا دیا گیا، دونوں صنفوں کے اختلاط کے آزادانہ مواقع فراہم کئے گئے، مخلوط
تعلیم جاری کی گئی تو اس کا نتیجہ اخلاقی انتشار اور جنسی انارکی، سول میرج، تمام اخلاقی و دینی
حدود و اصول سے بغاوت، اور بالاختصار اس اخلاقی جذام کے سوا کچھ نہیں جو مغرب کو ٹھیک
انھیں اسباب کی بنا پر لاحق ہو چکا ہے، ان اسلامی ملکوں میں جہاں مغربی تہذیب کی پرجوش
نقل کی جا رہی ہے، اور جہاں پردہ بالکل اٹھ گیا ہے، اور مرد وزن کے اختلاط کے آزادانہ مواقع
حاصل ہیں، پھر صحافت، سینما، ٹیلی ویژن، لٹریچر اور حکمراں طبقہ کی زندگی اس کی ہمت افزائی
بلکہ رہنمائی کر رہی ہے، وہاں اس جذام کے آثار و علامات پوری طرح ظاہر ہونے لگی ہیں، اور
یہ قانونِ قدرت ہے، جس سے کہیں مفر نہیں۔

مغربیت کے عالمگیر رجحان

کے اسباب

اور ان کا علاج

تجدّد و مغرب زدگی کے اسباب اور ان کا علاج!

اس وقت جب کہ کمال اتاترک کی قیادت (۱۹۲۴ء - ۱۹۳۸ء) میں عالمِ اسلام میں تجدّد و مغرب زدگی کی تحریک کے آغاز سے لے کر اس تحریک کی تاریخ اجمال و اختصار کے ساتھ آ چکی ہے اور معزز ناظرین نے دیکھا ہے کہ آزاد ہونے والے اسلامی ممالک یا نئی قائم ہونے والی مسلمان سلطنتوں کے بانی اور رہنما کم و بیش کمال اتاترک کے فکر سے متفق یا اس سے متاثر نظر آتے ہیں، اور ہر ملک کے ذہین، اعلیٰ تعلیم یافتہ اور صاحبِ اختیار طبقہ کا رخ کمالی طرز کی اصلاحات و ترقیات اور تجدّد و مغربیت کی طرف ہے، ہم کو اس امر پر غور کرنا چاہیے کہ آیا یہ محض اتفاق ہے یا یہ کمال اتاترک کی طاقتور شخصیت کا نتیجہ ہے؟ یا اس کی تہ میں اس سے زیادہ ٹھوس، مؤثر اور عالمگیر اسباب پائے جاتے ہیں کہ عالمِ اسلام میں ملک اور سوسائٹی کی نئی تعمیر و تشکیل کے لئے جو اٹھتا ہے، وہ کمال اتاترک ہی کے نقشِ قدم پر چلتا ہے اور ملک کی ترقی اور استحکام کا راز تجدّد و مغربیت ہی میں سمجھتا ہے۔

ہمارے نزدیک اس کے کچھ گہرے ٹھوس اور عمومی اسباب ہیں، ہم یہاں مختصر طریقہ پہ علیحدہ علیحدہ ان اسباب و عوامل (FACTORS) کا جائزہ لیں گے۔

مغربی نظامِ تعلیم

اہلِ نظر جانتے ہیں کہ انسانی وجود کی طرح نظامِ تعلیم بھی اپنی ایک روح اور ضمیر رکھتا ہے، یہ روح اور ضمیر دراصل اس کے واضعین و مرتبین کے عقائد و نفسیات، زندگی کے متعلق ان کے نقطۂ نظر، مطالعۂ کائنات و علمِ اشیاء کی اساس و مقصد اور ان کے اخلاق کا

عکس اور پرتو ہوتا ہے، جو اس نظام کو ایک مستقل شخصیت ایک مستقل روح اور ضمیر عطا کرتا ہے، یہ روح اس کے پورے ڈھانچہ ادب و فلسفہ، تاریخ، فنونِ لطیفہ، علوم عمرانیہ حتیٰ کہ معاشیات وسیاسیات میں اس طرح سرایت کر جاتی ہے کہ اس کو اس سے مجرد کرنا بڑا کٹھن کام ہے، یہ بہت بڑے صاحبِ اجتہاد اور اعلیٰ تنقیدی صلاحیت رکھنے والے کا کام ہے کہ اس کے مفید اجزا کو مضر اجزا سے الگ کر کے "خذ ما صفا ودع ما کدر" پر عمل کرے، اور اصل و زوائد میں فرق کر کے اس کا جوہر اور اس کی روح لے لے طبعی و تجربی (سائنٹفک) علوم میں یہ کام بہت زیادہ مشکل نہیں لیکن ادب و فلسفہ اور علوم عمرانیہ میں یہ کام بڑا مشکل اور نازک ہے خاص طور پر جب کوئی ایسی قوم جو متعین و محکم عقائد، مستقل فلسفۂ حیات اور مسلکِ زندگی، اپنی ایک مستقل تاریخ (جو محض ماضی کا ایک ملبہ (DEBRIS) نہیں بلکہ آئندہ نسلوں کے لئے نشانِ راہ کی حیثیت رکھتی ہے) اور جس کے لئے پیغمبر کی شخصیت اور اس کا زمانہ آئیڈیل کی حیثیت رکھتا ہے جب کسی ایسی قوم یا دور کا نظامِ تعلیم قبول کرتی ہے جو اساس و بنیاد اور مثال و معیار میں اس سے مختلف بلکہ اس کی ضد واقع ہوئی ہے تو قدم قدم پر تصادم ہوتا ہے، اور ایک کی تعمیر دوسرے کی تخریب، اور ایک کی تصدیق دوسرے کی نفی و تردید، ایک کا احترام دوسرے کی تحقیر کے بغیر ممکن نہیں، ایسی حالت میں پہلے ذہنی کشمکش، پھر عقائد میں تزلزل، پھر اپنے دین سے انحراف اور قدیم افکار و اقدار کے بجائے جدید افکار و اقدار کا آنا ضروری ہے، یہ سب ایک قدرتی امر ہے اور بالکل قدرتی امور کی طرح اس کا پیش آنا ضروری ہے، کسی قسم کی خوش نیتی، ضمیر کی خلش، سرپرستوں کی خواہش، خارجی و جزئی انتظامات اس امر کے وقوع میں حارج نہیں ہو سکتے، اس کی رفتار کو سست اور اس کے وقوع کو موخر کر سکتے ہیں، ملتوی نہیں کر سکتے، درخت اگر اپنے طبعی نظام سے نشو و نما پائے تو وہ اپنے برگ و بار ضرور پیدا کرے گا اور وقت پر

پھل لائے گا، انسانوں کو اس کا اختیار ہے کہ درخت نہ لگائیں یا اس کو پانی نہ دیں یا جب تیار ہو تو اس کی ہستی کو ختم کردیں، مگر اس کا اختیار نہیں کہ ایک توانا و تندرست، سرسبز و شاداب درخت کو اپنے نوعی وجود و شخصیت کے اظہار اور وقت پر پھل پھول لانے سے روک سکیں۔

یہی معاملہ مغربی نظامِ تعلیم کا ہے، وہ اپنی ایک روح اور اپنا ایک منفرد ضمیر رکھتا ہے، جو اپنے مصنفین و مرتبین کے عقیدہ و ذہنیت کا عکس، ہزاروں سال کے طبعی ارتقا کا نتیجہ اہلِ مغرب کے مسلّمہ افکار و اقدار کا مجموعہ اور ان کی تعبیر ہے، یہ نظامِ تعلیم جب کسی اسلامی ملک یا مسلمان سوسائٹی میں نافذ کیا جائے گا تو اس سے ابتداءً ذہنی کشمکش، پھر اعتقادی تزلزل، پھر ذہنی اور بعد میں (اِلّا ماشاء اللہ) دینی ارتداد قدرتی ہے، ایک سلیم الطبع مغربی مبصر[1] نے جس کو مغرب کے نظامِ تعلیم اور مشرق میں اس کے نتائج کا وسیع تجربہ ہے صحیح لکھا ہے:-

"ہم نے گزشتہ صفحات میں اس بات کی تائید میں چند اسباب و دلائل پیش کئے ہیں کہ اسلام اور مغربی تمدن جو زندگی کے دو متضاد نظریوں پر قائم ہیں ایک دوسرے کے ساتھ مل کر نہیں رہ سکتے، جب واقعہ یہ ہے تو ہم کیسے اس بات کی توقع کرسکتے ہیں کہ مسلمانوں کی نئی نسل کی مغربی بنیادوں پر ایسی تعلیم و تربیت (جو مجموعی طور پر یورپ کے علمی و ثقافتی تجربوں اور ان کے تقاضوں پر مبنی ہے) مخالفِ اسلام اثرات سے پاک ہوسکتی ہے۔

ہماری اس توقع کے لئے کوئی وجہ جواز نہیں، اگر ہم بعض ایسے غیر معمولی حالات کا استثناء کردیں جن میں کسی انتہا درجہ کے روشن اور فائق دماغ کے لئے ایسا ممکن ہوا کہ وہ اپنے درسی مضامین سے متاثر نہیں ہوسکا تو بھی عام اصول یہی رہے گا کہ مسلمانوں کی نئی نسلوں کی مغربی تعلیم و تربیت ان کو اس قابل نہیں رکھے گی کہ وہ اپنے کو اس مخصوص

---

[1] محمد اسد، سابق (LEOPOLD WEISS)

ربانی تمدن کا نمائندہ سمجھیں جس کو اسلام لے کر آیا، اس میں ذرا بھی شک کی گنجائش نہیں کہ ان روشن خیالوں کے اندر دینی عقائد برابر مضمحل ہوتے جارہے ہیں جنھوں نے مغربی بنیادوں پر نشوونما حاصل کیا ہے"[1]

پھر وہ نصابِ تعلیم کے مختلف اجزاء کے متعلق علیحدہ علیحدہ گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"مغربی ادبیات کی تعلیم کا انجام اس شکل میں جو اس وقت اکثر اسلامی اداروں میں رائج ہے، اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اسلام مسلمان نوجوانوں کی نگاہ میں ایک اجنبی چیز بن جائے، یہی بات بلکہ اس سے بہت زیادہ یورپ کے فلسفۂ تاریخ پر صادق آتی ہے اس لئے کہ یورپ کا قدیم نظریۂ تاریخ یہ ہے کہ دنیا میں دو ہی گروہ ہیں، رومی (ROMANS) اور وحشی (BARBARIANS) تاریخ کو اس طرح پیش کرنے کا ایک پوشیدہ مقصد ہے وہ یہ کہ یہ ثابت کیا جائے کہ مغربی اقوام اور ان کا تمدن ہر اس چیز سے زیادہ ترقی یافتہ ہے جس کا اس وقت تک وجود ہوا یا آئندہ کبھی دنیا میں وجود ہو سکتا ہے، اس سے اہلِ مغرب کے حصولِ اقتدار کی کوشش اور مادی طاقت کا اخلاقی جواز پیدا ہوتا ہے اور وہ حق بجانب ثابت ہوتی ہے"[2]

آگے چل کر وہ لکھتے ہیں:۔

"تاریخ کی اس طرح کی تعلیم نوجوانوں کے دماغ میں اس کے علاوہ کوئی اور اثر نہیں چھوڑ سکتی کہ وہ احساسِ کہتری میں مبتلا ہوں اور اپنی پوری ثقافت (کلچر) اور اپنے مخصوص تاریخی عہد کو حقارت کی نظر سے دیکھنے لگیں اور مستقبل میں ان کے لئے ترقی و خدمت کے جو وسیع اور روشن امکانات ہیں ان کا انکار کرنے لگیں، اس طرح وہ ایک ایسی منظم تربیت حاصل کرتے ہیں جس میں اپنے ماضی اور اپنے مستقبل کی حقارت پورے طور پر

---

[1] ISLAM AT THE CROSSROADS P. 83. 84.

[2] P. 95

کارفرما ہوتی ہے ان کے نزدیک ان کے مستقبل کی کامیابی صرف اس میں ہے کہ وہ مغربی معیار کے مطابق اور مغرب کے افکار و اقدار سے ہم آہنگ ہوں[1]"۔

آگے چل کر وہ بڑی جرأت کے ساتھ کہتے ہیں:-

اگر مسلمانوں نے زمانۂ ماضی میں علمی تحقیق و تفکر کے کام کو نظر انداز کر کے غلطی کی تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس غلطی کی اصلاح کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ وہ مغرب کا نظامِ تعلیم جوں کا توں قبول کر لیں، ہماری پوری تعلیمی پسماندگی اور علمی بے بضاعتی اس مہلک اثر کے مقابلہ میں کوئی حیثیت نہیں رکھتی جو مغرب کے نظامِ تعلیم کی اندھی تقلید اسلام کی مخفی دینی طاقتوں پر ڈالے گی، اگر ہم اسلام کے جوہر کو یہ سمجھ کر محفوظ رکھنا چاہتے ہیں کہ وہ ایک مستقل علمی و تہذیبی عنصر ہے تو ہمارے لئے ضروری ہوگا کہ ہم مغربی تمدن کے ذہنی ماحول اور فضا سے دور دور رہیں، وہ فضا جو ہمارے معاشرہ اور ہمارے میلانات پر غلبہ حاصل کرنے کے لئے تیار ہے مغرب کے طور و طریق اور اس کے لباس و مظاہرِ زندگی کو قبول کر لینے سے مسلمان آہستہ آہستہ مغرب کے نقطۂ نظر کو قبول کرنے پر مجبور ہو جائیں گے، خارجی مظاہر کی تقلید اس ذہنی رجحان تک پہونچا دیتی ہے[2]"۔

اس نتیجہ کی پیشین گوئی ان بعض مفکرین نے بھی کی ہے جو ایشیائی اور مشرقی ممالک میں اس نظامِ تعلیم کو رواج دینے والے تھے، مشہور انگریز اہلِ قلم لارڈ میکالے نے جو ۱۸۳۵ء میں اس تعلیمی کمیٹی کے صدر تھے، جو یہ طے کرنے کے لئے بیٹھی تھی کہ ہندوستانیوں کو مشرقی زبانوں کی جگہ انگریزی زبان میں تعلیم دی جایا کرے، اپنی رپورٹ میں لکھا تھا:-

"ہمیں ایک ایسی جماعت بنانی چاہئے جو ہم میں اور ہماری کروڑوں رعایا کے درمیان

---

[1] P. 97 [2] P. 100

ترجمان ہو، یہ ایسی جماعت ہونی چاہیئے جو خون اور رنگ کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہو،
مگر مذاق اور رائے الفاظ اور سمجھ کے اعتبار سے انگریز ہو۔[۱]

یہ مغربی نظام تعلیم درحقیقت مشرق اور اسلامی ممالک میں ایک گہرے قسم کی لیکن خاموش نسل کشی (GENOCIDE) کے مرادف تھا، عقلاء مغرب نے ایک پوری نسل کو جسمانی طور پر ہلاک کرنے کے فرسودہ اور بدنام طریقہ کو چھوڑ کر اس کو اپنے سانچہ میں ڈھال لینے کا فیصلہ کیا اور اس کام کے لئے جا بجا مراکز قائم کیے، جن کو تعلیم گاہوں اور کالجوں کے نام سے موسوم کیا، اکبر مرحوم نے اس سنجیدہ تاریخی حقیقت کو اپنے مخصوص ظریفانہ انداز میں بڑی خوبی سے ادا کیا ہے، ان کا مشہور شعر ہے ؎

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

ایک دوسرے شعر میں انھوں نے مشرقی و مغربی حکمرانوں کا فرق اس طرح بیان کیا ہے ؎

مشرقی تو سر دشمن کو کچل دیتے ہیں
مغربی اس کی طبیعت کو بدل دیتے ہیں

اس سے کئی برس بعد اقبال نے (جنھوں نے اس نظام تعلیم کا خود زخم کھایا تھا) اس حقیقت کو زیادہ سنجیدہ انداز میں اس طرح پیش کیا ؎

مباش ایمن ازاں علمے کہ خوانی
کہ ازوے روح قومے می تواں کشت[۲]

تعلیم جو قلب ماہیت کرتی ہے، اور جس طرح ایک سانچہ توڑ کر دوسرا سانچہ بناتی ہے، اس کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:-

---

[۱] تاریخ التعلیم از میجر باسو ص۸ [۲] ارمغان حجاز ص۱۴۳

تعلیم کے تیزاب میں ڈال اس کی خودی کو — ہو جائے ملائم تو جدھر چاہے اسے پھیر
تاثیر میں اکسیر سے بڑھ کر ہے یہ تیزاب — سونے کا ہمالہ ہو تو مٹی کا ہے اک ڈھیر[1]

وہ مغرب کے اس نظامِ تعلیم کو دین و اخلاق کے خلاف ایک سازش قرار دیتے ہیں ۔۔۔۔ فرماتے ہیں ؎

اور یہ اہلِ کلیسا کا نظامِ تعلیم
ایک سازش ہے فقط دین و مروّت کے خلاف[2]

اقبال ان معدودے چند خوش قسمت افراد میں سے ہیں، جو مغربی نظامِ تعلیم کے سمندر میں غوطہ لگا کر ابھر آئے اور نہ صرف یہ کہ صحیح سلامت ساحل پر پہونچے بلکہ اپنے ساتھ بہت سے موتی تہ سے نکال کر لائے، اور ان کی خود اعتمادی، اسلام کی ابدیت، اور اس کے وسیع مضمرات پر ان کا یقین اور زیادہ مستحکم ہو گیا، اگرچہ یہ کہنا مشکل ہے کہ انھوں نے مغربی تعلیم اور مغربی فلسفہ کا مطلق اثر قبول نہیں کیا، اور ان کا دینی فہم کتاب و سنت اور سلفِ امت کے بالکل مطابق ہے[3]، لیکن اس میں شبہ نہیں کہ اس "آتشِ نمرود" نے ان کے ہزاروں معاصرین کی طرح ان کی خودی اور شخصیت کو جلا کر خاک نہیں کیا، اور بڑی حد تک ان کو یہ کہنے کا حق حاصل ہے کہ :۔

طلسمِ علمِ حاضر را شکستم — ربودم دانہ و دامش گسستم
خدا داند کہ مانندِ براہیم — بنارِ او چہ بے پروا نشستم[4]

اس جدید تعلیم اور اس کے اثرات کے متعلق مولانا محمد علی مرحوم کی شہادت بھی بڑی وقعت

---

[1] ضربِ کلیم [2] ایضاً ص ۷۴ [3] اس کا اندازہ ان کے ان خطبات سے ہو سکتا ہے جو انھوں نے مدراس میں دیئے تھے اور جن کا مجموعہ (RECONSTRUCTION OF RELIGIOUS THOUGHT IN ISLAM) کے نام سے شائع ہوا ہے اور جس میں کہیں کہیں حقائقِ غیبی کی فلسفیانہ تعبیر اور تاویل کا شدید رنگ صاف جھلکتا ہے۔

[4] ارمغانِ حجاز ص ۱۰۷

رکھتی ہے، جنھوں نے ایک راسخ العقیدہ دینی ماحول میں تربیت پائی تھی پھر مغربی تعلیم کے بہترین ہندوستانی مرکزوں میں اپنی تعلیم کا آغاز کیا، وہ اپنی خود نوشت سوانح میں لکھتے ہیں:۔

"حکومت برطانیہ مکمل مذہبی غیر جانبداری کی قائل اور علمبردار تھی، اور مذہبی حتیٰ کہ اخلاقی تعلیمات کو بھی بالکلیہ بے دخل کر کے اس نے اس (پالیسی) کو عملی جامہ بھی پہنایا، صرف وہ معلومات جن کو لڑکے از خود انگریزی اور مشرقی زبانوں کی درسی کتابوں میں پائے جانے والے لٹریچر سے اخذ کرلیں، رہ گئیں۔

دوسری طرف وہ تعلیمی نظریہ جو حکومت نے ہندوستانی نوجوانوں کے لئے بہم پہونچایا تھا "جدید" تھا، لیکن اپنی تمام تخریبی صلاحیت کے ساتھ اس کا سارا زور اس طرف تھا کہ طالب علم کے اندر ایک بیجا ہمہ دانی کا احساس پرورش پائے اور صدیوں پرانے توہمات کے ساتھ ساتھ روایت اور حجت وسند کی ساری عظمت کو ختم کردے، اس میں شبہ نہیں کہ رفتار زمانہ کے ساتھ یہ تعلیم حقیقت کی تلاش وجستجو کے ایک مخلصانہ جذبہ کو بیدار کرنے کا سبب بنی، لیکن اپنی پہلی پودش میں یہ خاص طور پر تخریبی ہی رہی ہے، اور ختم کئے ہوئے توہمات کے بدلے میں جو تھوڑا بہت اس نے دیا وہ بذات خود بے بنیاد عقائد اور توہمات پر مبنی تھا، ہاں یہ ضرور ہے کہ یہ تھوڑا بہت "جدید" تھا۔"[1]

ISLAM IN MODERN HISTORY کا مصنف (W. C. SMITH) جو اسلامی ممالک میں کام کرنے والے مختلف رجحانات اور وہاں کے مختلف طبقوں سے متعلق تازہ معلومات رکھتا ہے، اسلامی ممالک میں جدید مغربی تعلیم اور اس کے مرکزوں کے گہرے ذہنی اثر کا اعتراف کرتا ہے، وہ ممالک اسلامیہ کی حریت پسند تحریک (LIBERALISM) کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

---

[1] MY LIFE, A FRAGMENT, P. 23, 24.

"ممالک اسلامیہ میں آزاد خیالی اور حریت پسندی کی جو تحریک چل رہی ہے، اس کا ایک اہم سبب اور عامل (FACTOR) مغرب کا نفوذ بھی ہے۔ یورپ میں حریت پسندی کی تحریک انیسویں صدی کے اواخر سے لے کر پہلی جنگِ عظیم تک اپنے نقطۂ عروج پر رہی ہے، یہی معاملہ یورپ کے تفوّق اور ترقی کا ہے۔ بہت سے مسلمان نوجوانوں نے مغرب کا سفر کیا اور یورپ کی اسپرٹ اور اس کے اقدار سے انھوں نے واقفیت حاصل کی اور ایک حد تک وہ ان کے گرویدہ ہوئے۔ یہ بات ان طلباء پر خصوصیت کے ساتھ صادق آتی ہے جو روز افزوں تعداد کے ساتھ یورپ کی یونیورسٹیوں میں تعلیم و تربیت حاصل کرتے رہے ہیں، (ان کے ذریعہ) مغرب کی بہت سی چیزیں دنیائے اسلام میں آگئیں، اس کام میں پیش پیش وہ تعلیمی ادارے تھے جنھوں نے ایک پوری نسل کی تربیت کی اور اس کو مغرب کے جدید طرز کے حوالے کر دیا۔ مغرب سے آنے والی چیزوں میں وہ متعدد نئے خیالات اور کم از کم اتنے ہی زیادہ اہم، نازک اور باریک خام ذہنی اندازے اور نئے میلانات تھے، جن کو یہ مختلف تعلیمی اشغال پھیلانے کے ذمہ دار ہیں، مزید برآں مغرب کے دوسرے قانونی، سیاسی، اجتماعی اور دوسری قسم کے جدید اداروں کا بڑھتا ہوا اثر و نفوذ، ان میں سے بعض تو زبردستی مسلط کئے جاتے ہیں اور بعض کے لئے کوشش کی جاتی ہے، بعض مسلمانوں نے اس کا مقابلہ کیا، بعض نے اس کا خیر مقدم کیا، بعض کو ایسی تربیت دی گئی یا انھوں نے خود تدریجی طور پر ان کو خوش آمدید کہا، انجام کار بہت سے مسلمان ان نظریات اور اداروں کو مسلّمہ حقائق سمجھنے لگے، اس طرح سے مغربیت کی کارروائی تیزی اور طاقت کے ساتھ جاری رہی۔"[1]

لیکن ان چند مستثنیٰ شخصیتوں (اقبال و محمد علی وغیرہ) کو چھوڑ کر جن کی "فطرت ابراہیمی"

---

[1] P. 64

یا خارجی مؤثرات و واقعات نے ان کے نورِ ایمان اور فہمِ اسلام کی حفاظت کی یا ان کے اندر مغرب کی تہذیب و فکر کے خلاف کوئی شدید ردِ عمل پیدا ہوا، عام طور پر عرب اور عجمی ممالک کے ذہین مسلم نوجوانوں کو (جو اپنی قوم کا جوہر اور سرمایہ تھے) اس نظامِ تعلیم کے تیزاب نے اتنا بدل دیا کہ نہ اسلام (اپنی صحیح شکل و صورت میں) ان کے جدید ذہن میں فٹ ہو سکتا ہے، اور نہ وہ عام اسلامی معاشرہ میں فٹ ہوتے ہیں، اور بقول اقبالؔ ؎

فرنگی شیشہ گر کے فن سے پتھر ہو گئے پانی

مذہب کے ایک پرائیوٹ معاملہ ہونے پر اصرار جس کو سیاست و ریاست میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں، دینِ اسلام کے ساتھ مسیحی کلیسا کا سا معاملہ، مذہب و سیاست کی تفریق کا نظریہ مذہب کو ترقی، اکتشاف و تحقیق کی راہ میں حارج اور مخل سمجھنے کا خیال، علماءِ اسلام کو مسیحی کلیسا کے ان نمائندوں کی صف میں کھڑا کرنا جو قرونِ وسطیٰ میں مطلق العنان اقتدار کے مالک تھے، عورت کو بالکل مرد کے مساوی سمجھ کر اس کو زندگی کے تمام میدانوں میں دوڑنے اور حصہ لینے کا اہل اور مستحق سمجھنا، پردہ کو (خواہ وہ کسی شکل میں ہو) مشرق کے قدیم حرم کے نظام کی یادگار اور مردوں کے صنفی استبداد کا نشان سمجھنا اور اس کے ختم کرنے کو اصلاح و ترقی کا پہلا قدم تصور کرنا، اسلام کے قانونِ میراث اور ضابطۂ نکاح و طلاق کو قرونِ وسطیٰ کے مسلمان فقیہوں کا اجتہاد اور اس محدود اور ابتدائی معاشرہ کا طبعی نتیجہ سمجھنا جو ساتویں آٹھویں صدی مسیحی میں قائم تھا، اور اس کی تبدیلی و ترمیم اور مغربی اصولوں اور معیاروں کے مطابق بنانے کے کام کو وقت کا ایک ضروری فریضہ قرار دینا، سود، شراب، قمار، جنسی تعلقات میں آزادی و بے قیدی کو زیادہ معیوب نہ سمجھ کر نظر انداز کرنا، قوم پرستی، قدیم (ماقبل اسلام) تہذیبوں اور زبانوں کے احیاء کا جذبہ اور لاطینی رسم الخط کی افادیت و اہمیت پر یقین، یہ اور اس طرح کے بہت سے رجحانات

(جو اس جدید تعلیم یافتہ نسل کے نزدیک) حقائق و مسلمات کا درجہ رکھتے ہیں، اور روشن خیالی اور ترقی پسندی کی علامت ہیں، مغربی نظامِ تعلیم اور (محمد اسد صاحب کے الفاظ میں) اس کے ذہنی و فکری ماحول اور فضا اور اس کے تاریخی ورثہ کا نتیجہ ہیں۔

آپ کو ترکی سے لے کر انڈونیشیا تک مسلمان ممالک کے جتنے سربراہ اور رہنما نظر آئیں گے وہ سب اسی مغربی نظامِ تعلیم کی پیداوار ہیں، ان میں سے جن کو براہ راست کسی مغربی ملک یا یورپ کے کسی مشہور تعلیمی مرکز میں پڑھنے اور پروان چڑھنے کا موقع نہیں ملا، انھوں نے اپنے ملک میں رہ کر اس نظامِ تعلیم سے (اس کے مخلص نمائندوں کی نگرانی و سرپرستی میں) پورا فائدہ اٹھایا، ان میں متعدد اشخاص نے ملٹری کالجوں میں تعلیم پائی جہاں مغربی طرز کی تعلیم و تربیت کا خصوصی اہتمام ہوتا ہے۔

اس بنا پر آج عالم اسلام میں دو ذہنوں، دو فلسفوں، دو معیاروں اور دو رخوں کے درمیان جو کشمکش برپا ہے، اور جو عام طور پر منتج ہوتی ہے زیادہ طاقتور مسلح، صاحبِ اختیار و اقتدار گروہ کی کامیابی پر، وہ بالکل قدرتی ہے، وہ اگر ہے تو خواہ کتنے تأسف کی بات ہو، تعجب کی بات نہیں، تعجب اس وقت ہوتا جب یہ کشمکش اور تجدد و مغربیت کا یہ رجحان پایا نہ جاتا۔

زہر کا تریاق

اس کا علاج (خواہ وہ کتنا ہی مشکل اور کتنا ہی دیر طلب ہو) اس کے سوا کچھ نہیں کہ اس نظامِ تعلیم کو از سرِ نو ڈھالا جائے، اس کو مسلمان اقوام کے عقائد و مسلمات اور مقاصد اور ضروریات کے مطابق بنایا جائے، اس کے تمام علوم و مضامین سے مادہ پرستی، خدا بیزاری، اخلاقی و روحانی اقدار سے بغاوت اور جسم پرستی کی روح نکال کر اس میں خدا پرستی، خدا طلبی، آخرت کوشی، تقویٰ شعاری اور انسانیت کی روح پیدا کی جائے،

زبان وادب سے لے کر فلسفہ ونفسیات تک، اور علوم عمرانیہ سے لے کر معاشیات وسیاسیات تک سب کو ایک نئے سانچہ میں ڈھالا جائے، مغرب کے ذہنی تسلط کو دور کیا جائے، اس کی معصومیت وامامت کا انکار کیا جائے، اس کے علوم ونظریات کو آزادانہ تنقید اور جرأت مندانہ تشریح (پوسٹ مارٹم) کا موضوع قرار دیا جائے[1]، مغرب کی سیادت وبالا تری سے عالمِ انسانی کو جو عظیم الشان نقصانات پہونچے ان کی نشان دہی کی جائے، غرض مغرب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کے علوم وفنون کو پڑھایا جائے، اور اس کے علوم وتجارب کو موادِ خام (RAW MATERIAL) فرض کر کے اپنی ضرورت اور اپنے قد وقامت اور اپنے عقیدہ ومعاشرت کے مطابق سامان تیار کیا جائے۔

اس عظیم کام میں خواہ کتنی ہی مشکلات ہوں اور اس میں خواہ کتنی دیر لگے، عالمِ اسلام میں تجدد ومغربیت کی اس عالمگیر رَو کا اس کے سوا کوئی علاج نہیں جو اسلام کے وجودِ ملّی اور اس کے اجتماعی ڈھانچہ کو چیلنج کر رہی ہے، اور اس کے لئے شدید خطرہ بلکہ موت وحیات کا مسئلہ بن گئی ہے، اور جس کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمان عوام کا خلوص، ان کی قربانیاں، ان کا جذبہ اور ان کی قوتِ عمل (جس کے سر ان ملکوں کی آزادی اور سلطنتوں کے قیام کا سہرا ہے) اس روشن خیالی وتجدد کی آگ کا حقیر ایندھن بن کر رہ گئی ہے، اور یہ سادہ دل، بے زبان، گرمجوش اور مخلص عوام، ان قائدین اور حکمرانوں کے ہاتھ میں بھیڑ بکریوں کا ایک ریوڑ بن کر رہ گئے ہیں، جن کو جس منزل کی طرف چاہا جاتا ہے، خاموشی کے ساتھ

---

[1] ڈاکٹر رفیع الدین صاحبؒ کی فاضلانہ کتاب "قرآن اور علمِ جدید" اس کا اچھا نمونہ ہے، محمد اسد صاحب کی (ISLAM AT THE CROSSROADS) مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی "تنقیحات" اور "پردہ" اور سید قطب کی "العدالۃ الاجتماعیۃ فی الاسلام" میں بھی مغربی فکر اور مغربی افکار واقدار پر تنقیدی مواد ملتا ہے۔

ہنکایا جاتا ہے۔

ہندوستان میں انگریزی حکومت کی کامیابی اور استحکام کا راز سول سروس کے طبقہ اور حکام کی مغربی تربیت، سلیقہ مندی اور اطاعت شعاری میں تھا، انھیں نے اس ملک کا سانچہ بنایا اور سو برس تک کامیابی کے ساتھ اس ملک کو اس کے غیر ملکی حکمرانوں کے منشا اور مزاج کے مطابق چلاتے رہے، اب بھی اسلامی ممالک کے رخ کی تبدیلی اور اسلامی فکر اور اسلامی زندگی کی طرف ان کو لے چلنے کی تدبیر یہی ہے کہ اس طبقہ کی اسلامی تعلیم و تربیت کا اہتمام کیا جائے، جس کے ہاتھ میں ملک کی رہنمائی اور اس کی زمام کار آنے والی ہے اور اس نظام تعلیم کو درست کیا جائے، جو اس طبقہ کو تیار کرتا ہے۔

نظام تعلیم کی یہ بنیادی تبدیلی اور اس کی اسلامی تشکیل اگرچہ نہایت ضروری ہے، مگر دیر طلب اور طویل کام ہے، اور اس کے لئے وسیع و عظیم صلاحیتوں اور وسائل کی ضرورت ہے، جدید اسلامی نسل کا معاملہ ایک دن کی تاخیر اور التواء کا روادار نہیں، مندرجہ بالا کام کی تکمیل تک (اور حقیقتاً اس کی موجودگی میں بھی) یہ کام ان اسلامی اقامت خانوں (MUSLIM HOSTELS) سے لیا جا سکتا ہے جن میں یونیورسٹیوں اور کالجوں کے مسلم طلبہ قیام کریں اور وہاں اسلامی تربیت اسلامی زندگی اور ماحول کے قیام، اور صالح ذہنی و روحانی غذا کے مہیا کرنے کا خاص اہتمام کیا جائے، اقامت خانوں کا طلبہ کی زندگی و سیرت اور ان کے اخلاق و رجحانات کی تشکیل میں جو گہرا حصہ ہے، اس سے وہ حضرات بے خبر نہیں جو اس نسل کا کچھ تجربہ رکھتے ہیں، اسلامیہ اسکول اور کالج (جن پر ملت کے سرمایہ اور توجہ کا قیمتی حصہ صرف ہو چکا ہے) بہت جگہ حالات کی تبدیلی سے اپنی افادیت کھو چکے ہیں، پھر اکثر وہ "کوہ کندن وکاہ برآوردن" کا مصداق ثابت ہوتے ہیں، ان کے برعکس اقامت خانوں کی تاسیس و انتظام کی مشکلات کم اور فوائد

زیادہ ہیں، اور جہاں نظامِ تعلیم کا سررشتہ صحیح الخیال و دردمند مسلمان زعماء و قائدین کے ہاتھ سے نکل چکا ہے، اور اس کے بازیاب کی جلد امید نہیں، وہاں یہ اقامت خانے ہی زیرِ تعلیم مسلمان نوجوانوں کی اخلاقی حفاظت اور ذہنی و دینی تربیت کا سامان کرسکتے ہیں اور بہت سی سعید روحوں کو فاسد و مفسد ماحول اور مسخ کرنے والے نظامِ تعلیم اور مراکزِ تعلیم کی سمیت سے محفوظ رکھ سکتے ہیں۔[1]

ان اسلامی اقامت خانوں کی مسلم ممالک کے علاوہ مغربی ممالک میں بھی ضرورت ہے، جہاں وہ مسلمان نوجوان بڑی تعداد میں تعلیم پاتے ہیں، جو ذہانت و قوتِ عمل میں ملت کا سرمایہ اور جوہر ہیں، اور جن کے لئے بالعموم (اپنی ذہنی صلاحیتوں اور مغربی علوم والسنہ و سیاست سے واقفیت کی بنا پر) گویا مسلم ممالک کی قیادت اور کم سے کم ان کی کلیدی جگہیں مقدر ہوچکی ہیں، اگر ان مرکزوں میں ان کے رجحانات کی اصلاح اور اسلامی ذہن کی تعمیر کا سامان کیا جاسکے، اور اسلام اور اس کے مستقبل پر ان کا اعتماد بحال کیا جاسکے تو اس خاموش کام کے ذریعہ ان مسلم ممالک میں خاموشی کے ساتھ وہ اسلامی انقلاب لایا جاسکتا ہے جن کی قیادت دیر یا سویر یہ نوجوان سنبھالنے والے ہیں، اور یہ طریقہ ان تمام طریقوں سے زیادہ آسان اور محفوظ معلوم ہوتا ہے، جس کا عرصہ سے براہ راست ان ممالک میں تجربہ کیا جارہا ہے۔

مغربی مستشرقین اور ان کی تحقیقات و افکار کا اثر

موجودہ عالم اسلام کے رہنما و حکمراں طبقہ کے (جس نے عام طور پر اعلیٰ مغربی تعلیم گاہوں میں

---

[1] اسلامی اقامت خانوں کے قیام کی تحریک سب سے پہلے مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانیؒ نے اٹھائی ان کے بعد اس تحریک کے سب سے بڑے داعی ان کے رفیق اور ہمارے مخدوم مولانا عبدالباری ندوی مرحوم تھے، جو اس موضوع پر برابر مضامین لکھتے اور دردمند و فعال مسلمانوں کو توجہ دلاتے رہتے تھے۔

تعلیم پائی ہے، یا مغربی زبانوں میں اسلامی لٹریچر کا مطالعہ کیا ہے) دماغوں میں اسلام کے ماضی کی طرف سے بدگمانی، اس کے حال کی طرف سے بیزاری اس کے مستقبل کی طرف سے مایوسی، اسلام و پیغمبر اسلام اور اسلامی مآخذ (SOURCES) کے بارہ میں شکوک و شبہات پیدا کرنے اور "اصلاح مذہب" "اصلاح قانون اسلامی" کے اس طرز پر آمادہ کرنے میں جس کا نمونہ اوپر گزر چکا ہے، بہت بڑا حصہ ان علماء مغرب کا ہے جنھوں نے اسلامیات کے مطالعہ کے لئے اپنی زندگیاں وقف کر دی ہیں اور ان کو عام طور پر مستشرقین (ORIENTALIST) کہا جاتا ہے، اور جو اپنے علمی تبحر، تحقیقی انہماک اور مشرقیات سے گہری واقفیت کی بنا پر مغرب و مشرق کے علمی و سیاسی حلقوں میں بڑی عظمت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں اور ان مشرقی اسلامی مباحث و مسائل میں ان کی تحقیق و نظریات کو حرفِ آخر اور قولِ فیصل سمجھا جاتا ہے۔

اس استشراق کی تاریخ بہت پرانی ہے، وہ واضح طریقہ پر تیرھویں صدی مسیحی سے شروع ہو جاتی ہے اس کے محرکات دینی بھی تھے سیاسی بھی، اقتصادی بھی، دینی محرک واضح ہے اس کا بڑا مقصد مذہب عیسوی کی اشاعت و تبلیغ اور اسلام کی ایسی تصویر پیش کرنا ہے کہ مسیحیت کی برتری اور ترجیح خود بخود ثابت ہو اور نئے تعلیم یافتہ اصحاب اور نئی نسل کے لئے مسیحیت میں کشش پیدا ہو چنانچہ اکثر استشراق اور تبلیغ مسیحیت ساتھ ساتھ چلتے ہیں، مستشرقین کی بڑی تعداد اصلاً پادری ہے ان میں سے ایک بڑی تعداد نسلاً و مذہباً یہودی ہے۔

سیاسی محرک یہ ہے کہ یہ مستشرقین عام طور پر مشرق میں مغربی حکومتوں اور اقتدار کا ہراول دستہ (PIONEERS) رہے ہیں، مغربی حکومتوں کو علمی کمک اور رسد پہونچانا ان کا کام ہے، وہ ان مشرقی اقوام و ممالک کے رسم و رواج، طبیعت و مزاج، طریق ماند و بود اور زبان و ادب،

بلکہ جذبات ونفسیات کے متعلق صحیح اور تفصیلی معلومات بہم پہونچاتے ہیں تاکہ ان پر اہلِ مغرب کو حکومت کرنا آسان ہو، اسی کے ساتھ ساتھ ان حالات وتحریکات، عقائد وخیالات کا "توڑ" کرتے رہتے ہیں، جو ان حکومتوں کے لئے پریشانی اور دردِ سر کا باعث ہیں، اور ایسی ذہنی اور علمی فضا پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں جس میں ان حکومتوں کی مخالفت کا خیال ہی پیدا نہ ہونے پائے، اس کے بالمقابل ان کی تہذیب کی عظمت اور ان کی خدمات کی وقعت پیدا ہو اور اپنے ملک کی اصلاح وترقی اور ان کو مغرب کے نقشِ قدم پہ چلنے کا ایسا جذبہ پیدا ہو کہ ان مغربی حکومتوں کے ہٹ جانے پر بھی ان کا ذہنی اور تہذیبی اقتدار قائم رہے۔

اسی بنا پر مغربی حکومتوں نے مستشرقین کی اہمیت وافادیت کو پوری طرح محسوس کیا اور ان کے سربراہوں نے ان کی پوری سرپرستی کی، اور اسی مقصد کے ماتحت مختلف ممالک کے مستشرقین عالمِ اسلام سے متعلق رسائل اور مجلات شائع کرتے ہیں جن میں عالمِ اسلام کے مسائل اور رجحانات پر مبصّرانہ تبصرہ اور ماہرانہ مضامین شائع ہوتے ہیں، اس وقت بھی رسالہ "شرقِ اوسط" (JOURNAL OF NEAR EAST) اور مجلہ "عالمِ اسلامی" (THE MUSLIM WORLD) امریکہ سے اور (LEMONDE MUSALMANS) فرانس سے نکل رہے ہیں۔

ان اہم مذہبی وسیاسی محرکات کے علاوہ قدرتی طور پر استشراق کا ایک محرک اقتصادی بھی ہے، بہت سے فضلاء اس کو ایک کامیاب پیشہ کے طور پر اختیار کرتے ہیں، بہت سے ناشرین اس بنا پر کہ ان کتابوں کی جو مشرقیات اور اسلامیات پر لکھی جاتی ہیں، یورپ اور ایشیا میں بڑی منڈی ہے، اس کام کی ہمت افزائی اور سرپرستی کرتے ہیں، اور بڑی سرعت کے ساتھ یورپ وامریکہ میں ان موضوعات پر کتابیں شائع ہوتی ہیں جو بہت بڑی مالی منفعت اور کاروبار کی ترقی کا ذریعہ ہیں۔

ان مقاصد کے علاوہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بعض فضلاء مشرقیات و اسلامیات کو اپنے علمی ذوق و شغف کے ماتحت بھی اختیار کرتے ہیں اور اس کے لئے اس دیدہ ریزی دماغ سوزی اور جفاکشی سے کام لیتے ہیں جس کی داد نہ دینا ایک اخلاقی کوتاہی اور علمی ناانصافی ہے، ان کی مساعی سے بہت سے مشرقی و اسلامی علمی جواہرات و نوادر پردۂ خفا سے نکل کر منظرِ عام پر آئے اور جاہل وارثوں اور ظالم کیڑوں کی دست برد سے محفوظ ہو گئے، متعدد اعلیٰ اسلامی ماخذ اور تاریخی وثائق ہیں، جو ان کی محنت و ہمت سے پہلی مرتبہ شائع ہوئے[1] اور مشرق کے اہلِ علم نے اپنی آنکھوں کو ان سے روشن کیا۔

اس علمی اعتراف کے باوجود اس کے کہنے میں باک نہیں کہ مستشرقین عمومی طور پر اہلِ علم کا وہ گروہ ہے، جس نے قرآن و حدیث، سیرتِ نبوی، فقہ اسلامی اور اخلاق و تصوف کے وسیع مطالعہ سے حقیقی فائدہ نہیں اٹھایا، اور اس سے ان کے قلب و دماغ پر کوئی بڑا انقلاب انگیز اثر نہیں پڑا، اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ نتائج ہمیشہ مقاصد کے تابع ہوتے ہیں، عام طور پر ان مستشرقین کا مقصد کمزوریوں کا تلاش کرنا اور دینی یا سیاسی مقاصد کے ماتحت ان کو نمایاں کرنا اور چمکانا ہوتا ہے، چنانچہ صفائی کے انسپکٹر کی طرح ان کو ایک گلزار و جنت نشاں شہر میں صرف غیر صحتمند مقامات ہی نظر آتے ہیں۔

مستشرقین کا تاثر صرف ان کی ذات تک محدود نہیں، اگر تنہا یہ پہلو ہوتا تو وہ ہماری توجہ کا مرکز اور ہماری اس بحث کا موضوع نہ ہوتا، مسئلہ کا زیادہ سنگین اور دور رس پہلو یہ ہے کہ وہ اپنی تمام صلاحیتوں کو معقول و غیر معقول طریقہ پر ان کمزوریوں کی نشان دہی اور ان کو

---

[1] طبقات ابن سعد، تاریخ طبری، تاریخ کامل ابن اثیر، انساب سمعانی، فتوح البلدان بلاذری، کتاب الہند للبیرونی وغیرہ پہلی مرتبہ یورپ سے شائع ہوئیں پھر ان کے متعدد ایڈیشن مصر سے نکلے۔

نہایت مہیب شکل میں پیش کرنے میں صرف کرتے ہیں، وہ خوردبین سے دیکھتے ہیں، اور اپنے قارئین کو دوربین سے دکھاتے ہیں، رائی کا پربت بنانا ان کا ادنی کام ہے، وہ اپنے اس کام میں (یعنی اسلام کی تاریک تصویر پیش کرنے میں) اس چابک دستی، ہنرمندی اور صبر و سکون سے کام لیتے ہیں جس کی نظیر ملنی مشکل ہے، وہ پہلے ایک مقصد تجویز کرتے ہیں، اور ایک بات طے کر لیتے ہیں کہ اس کو ثابت کرنا ہے پھر اس مقصد کے لئے ہر طرح کے رطب و یابس، مذہب و تاریخ، ادب، افسانہ، شاعری مستند و غیر مستند ذخیرہ سے مواد فراہم کرتے ہیں، اور جس سے ذرا بھی ان کی مطلب برآری ہوتی ہو (خواہ وہ صحت و استناد کے اعتبار سے کتنا ہی مجروح و مشکوک اور بے قیمت ہو) اس کو بڑے آب و تاب سے پیش کرتے ہیں، اور اس متفرق مواد سے ایک نظریہ کا پورا ڈھانچہ تیار کر لیتے ہیں جس کا اجتماعی وجود صرف ان کے ذہن میں ہوتا ہے، وہ اکثر ایک برائی بیان کرتے ہیں، اور اس کو دماغوں میں بٹھانے کے لئے بڑی فیاضی کے ساتھ اپنے ممدوح کی دس خوبیاں بیان کرتے ہیں، تاکہ پڑھنے والے کا ذہن ان کے انصاف، وسعتِ قلب اور بے تعصبی سے مرعوب ہو کر اس ایک برائی کو (جو تمام خوبیوں پر پانی پھیر دیتی ہے) قبول کر لے، وہ کسی شخصیت یا دعوت کے ماحول تاریخی پس منظر قدرتی و طبعی عوامل و محرکات کا نقشہ ایسی خوبصورتی اور عالمانہ انداز سے کھینچتے ہیں (خواہ وہ محض خیالی ہو) کہ ذہن اس کو قبول کرتا چلا جاتا ہے، اور اس کے نتیجہ میں وہ اس شخصیت و دعوت کو اس ماحول کا قدرتی ردعمل یا اس کا فطری نتیجہ سمجھنے لگتا ہے، اور اس کی عظمت و تقدیس اور کسی غیر انسانی سرچشمہ سے اس کے اتصال و تعلق کا منکر بن جاتا ہے، اکثر مستشرقین اپنی تحریروں میں "زہر" کی ایک مناسب مقدار رکھتے ہیں، اور اس کا اہتمام کرتے ہیں کہ وہ تناسب سے بڑھنے نہ پائے اور پڑھنے والے کو متنفر اور بدگمان نہ کر دے ان کی تحریریں زیادہ خطرناک ثابت ہوتی ہیں، اور ایک متوسط آدمی کا ان کی زد سے بچ کر نکل جانا مشکل ہے۔

قرآن، سیرت نبوی، فقہ و کلام صحابۂ کرام، تابعین، ائمۂ مجتہدین، محدثین و فقہاء مشائخ و صوفیہ، رواۃ حدیث، فن جرح و تعدیل، اسماء الرجال، حدیث کی حجیت، تدوین حدیث، فقہ اسلامی کے مآخذ، فقہ اسلامی کا ارتقاء ان میں سے ہر موضوع کے متعلق مستشرقین کی کتابوں اور تحقیقات میں اتنا تشکیکی مواد پایا جاتا ہے، جو ایک ایسے ذہین و حساس آدمی کو، جو اس موضوع پر وسیع اور گہری نظر نہ رکھتا ہو، پورے اسلام سے منحرف کر دینے کے لئے کافی ہے اس کا علمی جائزہ لینا، ان کی تحریفات فنی غلطیوں اور ان کے دجل و تلبیس کو واضح کرنا اس وقت ہمارے دائرہ بحث سے خارج ہے یہ ایک اہم علمی موضوع اور عظیم الشان دینی خدمت ہے جس کے لئے ایک عظیم و منظم ادارہ کی ضرورت ہے۔

یہاں ہم نہایت اختصار کے ساتھ ان کی اس دعوت و تلقین کا خلاصہ پیش کرتے ہیں، جو وہ اپنے پڑھے لکھے حوصلہ مند اور ترقی پسند نوجوان قارئین کے سامنے بار بار اور مختلف عنوانوں سے پیش کرتے رہتے ہیں، اور جس کو ان نوجوانوں کا ذہن ایک معقول اور بدیہی حقیقت کی طرح قبول کرتا چلا جاتا ہے، اس دعوت و تلقین کا اسلامی ممالک کی "اصلاح و ترقی" کی تحریکات سے قریبی تعلق ہے، اور ان کی نوعیت کا اندازہ اس کے بغیر نہیں ہو سکتا، اس موقع پر ہم اس خلاصہ کو بطور اقتباس پیش کرتے ہیں، جو ایک مصری فاضل (ڈاکٹر محمد البہی[1]) نے اپنی فاضلانہ کتاب "الفکر الاسلامی الحدیث" میں پیش کیا ہے، اور جو اکثر و بیشتر مستشرقین کی کتابوں کا قدر مشترک اور ان کے خیالات کا عکس ہے:۔

"اسلامی معاشرہ کی وابستگی اسلام کے ساتھ صرف ایک مختصر وقفہ میں مستحکم رہی یہ وہ تاریخی وقفہ ہے جبکہ اسلامی معاشرہ ابتدائی حالت اور دورِ طفولیت میں تھا،

---

[1] سابق ڈائرکٹر شعبۂ ثقافتِ اسلامی حکومت مصر۔ وزیر اوقاف جمہوریہ عربیہ متحدہ۔

اس ابتدائی حالت اور دور طفولیت نے اس کا موقع دیا کہ زندگی اور اسلامی تعلیمات میں مناسبت اور ہم آہنگی پیدا ہو سکے لیکن اس مختصر ابتدائی وقفہ کے ختم ہوتے ہی اسلامی معاشرہ اور اسلام کے درمیان خلیج پڑ گئی، اور اسلام زندگی کی رہنمائی کا سرچشمہ نہیں رہا، کلچرل، سیاسی، اقتصادی اور دوسرے خارجی محرکات و عوامل کے نتیجہ میں اسلامی معاشرہ کے اندر زندگی جتنی تبدیل ہوتی رہی اور ترقی کرتی رہی اتنا ہی اسلام اس بدلتی ہوئی اور ترقی کرتی ہوئی زندگی کا ساتھ دینے سے قاصر ہوتا چلا گیا، یہ خلیج برابر وسیع ہوتی چلی گئی یہاں تک کہ خلافتِ اسلامی کے آخری مرکز (جدید ترکی) نے اس کا اعلان کر دیا کہ اسلام اب نظام زندگی میں دخل نہ دے سکے گا اور اب اس کی جگہ فرد کے ضمیر میں ہوگی اور یہ فرد بغیر کسی اعلان اور جوش کے اپنی ذات کے لئے اس کا اظہار کر سکے گا۔"[1]

"اسلامی تعلیمات کا نافذ نہ کر سکنا، اجتماعی ضرورت کا عین تقاضا ہے اور نتیجہ ہے روز بروز بدلتی ہوئی زندگی کے ان حالات کا جن کو اسلام اپنی تعلیمات کی روشنی میں اپنے مطابق نہیں بنا سکا، اور ان کے اور اپنی تعلیمات کے درمیان ہم آہنگی نہیں پیدا کر سکا اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے پر زور دینے کے معنی اس زمانہ میں اس کے سوا کچھ اور نہیں ہیں کہ زندگی سے کنارہ کشی اختیار کر لی جائے، تمدن جدید کے وسائل سے فائدہ اٹھانے میں مسلمان دنیا سے پیچھے رہ جائیں مسلمان ممالک میں غربت، بیماریوں اور جہالت کو بخوشی گوارا کیا جائے جیسا کہ اس وقت سعودی حکومت میں حال ہے، یہ وہ تنہا اسلامی ملک ہے جس نے سرکاری طور پر اسلام پر عمل کیا ہے اس لئے وہ اس بات کا نمونہ ہے کہ اسلام پر عمل کرنے سے کیا نتائج پیدا ہوتے ہیں۔"[2]

---

[1] الفکر الاسلامی الحدیث، ص۱۸۱-۱۸۲ [2] ایضاً ص۱۸۲

"تغیر و ترقی جو زندگی کا ایسا عام قانون ہے جس سے مفر نہیں، مسلمانوں کو اپنے اسلام کے بارے میں بھی اس سے کام لینا چاہئے تاکہ وہ جدید مغربی دنیا کے قدم بقدم چل سکیں اور کمزوری و بدنظمی کے اسباب سے نجات پا سکیں اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ خود اسلام پر بھی بحیثیت ایک مذہب کے اس قانون کو نافذ کریں اور اس کو زمانہ کے ساتھ بدلنے اور ترقی دینے کی کوشش کریں، ملت اسلامی کو بھی تغیر و ترقی کے اس فطری اور ابدی قانون کی پیروی میں مغربی معیار (IDEAL) کے مطابق چلنا اور اپنے مشرقی ماحول میں اس سے متأثر ہونا ضروری ہے، اس لئے کہ فکر و زندگی کے میدان میں اہل مغرب کے رجحانات طویل انسانی تجربوں کا نتیجہ ہیں، اہل مغرب نے ان رجحانات کی تشکیل میں علمی اور سائنٹفک طریقہ استعمال کیا، یہ طریقہ اوہام و خرافات اور مخصوص عقائد سے متأثر نہیں ہوتا، اس کے پیش نظر صرف انسانیت کی فلاح ہوتی ہے"[1]

تقریباً ڈیڑھ دو صدی کے طویل و مسلسل تجربہ کے بعد مستشرقین نے محسوس کیا کہ ان کے طریق کار میں بنیادی غلطی تھی جس کی وجہ سے ان کی جد و جہد کا پورا نتیجہ نہیں نکل رہا تھا اور بعض اوقات اس کے خلاف اسلامی حلقوں میں شدید ردعمل اور اشتعال پیدا ہو جاتا تھا جو تبلیغی و دعوتی نقطۂ نظر سے خطرناک تھا، وہ برابر اپنی مساعی اور ان کے اثرات و نتائج کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیتے رہے، اب ان نتائج کی روشنی میں انھوں نے طے کیا کہ ان کو اپنے رویہ اور طریق کار میں بنیادی تبدیلی پیدا کرنی چاہئے، اور بجائے مسلمانوں کو بدلنے کی کوشش کے اسلام کی جدید تعبیر پیش کرنے اور اصلاح مذہب (REFORM) کی

---

[1] ایضاً صفحہ ۱

تحریک چلانی چاہئے اور جہاں جہاں تجدد واصلاح مذہب کی تحریک چل رہی ہے، اس کی ہمت افزائی اور تائید کرنی چاہئے، اس ذہنی تبدیلی اور ایک نئے طریق کار کی حسب ذیل اقتباس سے بخوبی نشان دہی ہوتی ہے (HARRY GAYLORD DORMAN) اپنی کتاب (TOWARDS UNDERSTANDING ISLAM) میں لکھتا ہے :۔

"اصلاحی تحریکیں، دینی تعلیمات کی موجودہ تجربوں کی روشنی میں ازسرنو تشریح کرنے کی مخلصانہ کوششیں ہوتی ہیں یا ان کے ذریعہ نئے تجربوں کو دینی تعلیمات کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے، اور اس لئے وہ (مسیحیت کے) ایک مبلغ کے لئے اولین اہمیت رکھتی ہیں، اس کے معنی ہرگز یہ نہیں ہیں کہ ہر نئی تحریک جس کو کہ چند خبطی شروع کردیں وہ اس کا استحقاق رکھتی ہے کہ اس کا سنجیدگی کے ساتھ مطالعہ کیا جائے، ہماری مراد ان تحریکوں سے ہے جن کی حیثیت موجودہ زندگی کے سچے دینی اظہار کی ہے اور جو روزمرہ کے تجربہ کی روحانی تشریح کرنے کی کوشش کرتی ہیں اور پھیلتی جارہی ہیں، اور جس میں روحانی قوتیں حقائق سے نبرد آزما ہیں۔

بہت ممکن ہے کہ ان میں سے ایک اصلاحی تحریک مسلمانوں کے حضرت عیسیٰ کو سمجھنے کے سلسلہ میں بالآخر بڑی اہم ثابت ہوسکتی کہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آئندہ چند سالوں میں اسلامی ممالک میں (مسیحی) مبلغ کا اصل کارنامہ مسلمان افراد کی اصلاح واحیاء سے زیادہ خود اسلام کی تجدید واحیاء ہو[1]، بہرحال یہ کام کا

---

[1] یہ تجدید واحیاء ظاہر ہے کہ ان مستشرقین کے اصول ومعیار کے مطابق ہی ہوگا اور یہ درحقیقت تجدید کے بجائے تحریف وتجدد کا عمل ہے جو تقریباً تمام اسلامی ممالک میں شروع ہوگیا ہے۔

ایک میدان ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، اور جس سے غفلت نہیں برتی جا سکتی

یہ میدان کھلا ہوا ہے' یہ ان معذرت پسندوں کی مثال سے ظاہر ہے جو عیسائیوں

اور مسلمانوں کے ساتھ مل کر کام کرنے کا خیر مقدم کرتے ہوئے نظر آتے ہیں[1]"

اس نصف صدی کے اندر عالم اسلام میں اصلاح و ترقی (درحقیقت تجدد و

مغربیت) کے جتنے علمبردار پیدا ہوئے ان کے خیالات، اعلانات اور ان کے طریقۂ کار میں

مستشرقین کی اس دعوت و تلقین کا عکس صاف نظر آئے گا، یہاں تک کہ مستشرقین کے

ان خیالات کو ان مصلحین و زعماء کے فکر و عمل کی اساس قرار دیا جا سکتا ہے' اور اس کو

ان کا مشترک منشور (MANIFESTO) کہا جا سکتا ہے۔

ان مستشرقین نے ایک طرف اسلام کے دینی افکار و اقدار کی تحقیر کا کام کیا اور مسیحی

مغرب کے افکار و اقدار کی عظمت ثابت کی اور اسلامی تعلیمات و اصول کی ایسی تشریح

پیش کی کہ اس سے اسلامی اقدار کی کمزوری ثابت ہو اور ایک تعلیم یافتہ مسلمان کا رابطہ

اسلام سے کمزور پڑ جائے اور وہ اسلام کے بارے میں متشکک ہو جائے، کم از کم یہ سمجھنے

پر مجبور ہو کہ اسلام موجودہ زندگی کے مزاج کے ساتھ ساز نہیں کرتا اور اس زمانہ کی

ضروریات اور تقاضوں کو پورا کرنے سے عاجز ہے' ایک طرف انھوں نے بدلتی ہوئی

زندگی اور تغیر پذیر اور ترقی یافتہ زمانہ کا نام لے کر خدا کے آخری اور ابدی دین اور

قانون پر عمل کرنے کو روایت پرستی، رجعت پسندی اور قدامت و دقیانوسیت کا

مرادف قرار دیا، دوسری طرف اس کے بالکل برعکس انھوں نے ان قدیم ترین تہذیبوں

اور زبانوں کے احیاء کی دعوت دی جو اپنی زندگی کی صلاحیت اور ہر طرح کی افادیت

---

[1] HARRY GAYLORD DORMAN TOWARDS UNDERSTANDING ISLAM. P 125.

کھو کر ماضی کے ملبہ کے نیچے سیکڑوں ہزاروں برس سے مدفون ہیں، اور جن کے احیاء کا مقصد مسلم معاشرہ میں انتشار پیدا کرنے، اسلامی وحدت کو پارہ پارہ کرنے اسلامی تہذیب اور عربی زبان کو نقصان پہونچانے اور جاہلیت قدیمہ کو زندہ کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا، چنانچہ انہی کی تحریروں کے اثر اور انہی کے شاگردان رشید کے ذریعہ مصر میں "فرعونی" عراق میں "آشوری" شمالی افریقہ میں "بربری" فلسطین و لبنان کے ساحل پر "فینقی" تہذیب و زبان کے احیاء کی تحریکیں شروع ہوئیں، اور ان کے مستقل داعی پیدا ہو گئے، انہی مستشرقین اور ان کے شاگردوں نے شد و مد کے ساتھ یہ کہنا شروع کیا کہ قرآنی عربی زبان "فصحیٰ" اس زمانہ کی ضروریات کو پورا نہیں کر سکتی، اس کے بجائے عامی (COLLOQUIAL) اور مقامی زبانوں کو رواج دینا چاہئے اور انہی کو اخبارات اور کتابوں کی زبان بنانا چاہئے، یہ بات انھوں نے اتنی خوبصورتی سے اور اتنے بار کہی کہ مصر میں اچھے پڑھے لکھے اور صاحب قلم لوگوں نے اس تحریک کی حمایت شروع کر دی[1] جس کا نتیجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا تھا کہ ہر ملک و ہر صوبہ کی الگ الگ زبان ہو جائے قرآن مجید اور اسلامی ادب عرب قوموں کا رشتہ کٹ جائے اور وہ ان کے لئے ایک اجنبی زبان بن جائے، عربی زبان اپنی بین الاقوامی حیثیت ختم کر دے اور عرب اس پورے دینی سرمایہ اور روح سے محروم ہو کر الحاد و ارتداد اور اختلاف و انتشار کے نذر ہو جائیں۔

اسی طرح انھوں نے عربی رسم الخط کے بجائے لاطینی رسم الخط (ROMAN CHARACTER)

---

[1] سلامہ موسیٰ اس تحریک کا خاص علمبردار تھا، محمد حسین ہیکل، احمد امین اور احمد حسن الزیات بھی جزوی طور پر اس کے حامی تھے۔

کے اختیار کرنے کی دعوت دی اور ان کے تلامذہ نے وقتاً فوقتاً اس کی ضرورت ثابت کی، اور اس کے فوائد و فضائل بڑی بلند آہنگی سے بیان کیے، اس کا نتیجہ بھی اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ پوری عرب قوم صحیح طور پر قرآن مجید پڑھنے سے محروم و ناآشنا ہو جائے اور وہ پورا علمی ذخیرہ (جو اپنی وسعت اور علمی قیمت میں بے نظیر ہے) بے معنی اور بیکار ہو کر رہ جائے۔

ان تجاویز اور مشوروں سے مستشرقین کے حقیقی مقاصد و خیالات ان کی دور بینی اور ان کی اسلام دشمنی کا پورا اندازہ ہو سکتا ہے، ان میں سے اکثر کی تصنیفات اسلام کی بنیادوں پر تیشہ چلاتی ہیں، اسلامیات کے سرچشموں (بشمول حدیث و فقہ) کو مشکوک قرار دیتی ہیں، مسلم معاشرہ میں سخت ذہنی انتشار اور تشکک و ارتیاب پیدا کرتی ہیں، اسلام کے حاملین و شارحین (محدثین و فقہاء) کی علمیت و ذہانت کی طرف سے متشکک بناتی ہیں، فاحش علمی غلطیوں، مضحکہ خیز غلط فہمیوں، زبان و قواعد سے ناواقفیت اور بعض اوقات کھلی تحریفات کی ان میں بکثرت مثالیں ملتی ہیں لیکن ان کی اکثر و بیشتر تصنیفات مغربی و مشرقی دنیا میں مقبول ہیں، نیا تعلیم یافتہ طبقہ (جس میں سن رسیدہ اہل علم کی بھی ایک تعداد شامل ہے) اس کی حسن ترتیب، طرز استدلال، نتائج کے استنباط اور پیش کرنے کے علمی (سائنٹفک) طریقہ سے مرعوب و مسحور ہے اور اس کی تشفی خالص علمائے مشرق کی تصنیفات سے نہیں ہوتی، مغربی علمائے مستشرقین جس وقعت و اعتماد کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں، اور انھوں نے مشرق میں جو مقام حاصل کر لیا ہے، اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ مشرق وسطیٰ کی تینوں موقر مجالس علمیہ (ACADEMIES) المجمع اللغوی، (مصر) المجمع العلمی العربی (شام) المجمع اللغوی العراقی، (بغداد) میں مستشرقین کی ایک خاص تعداد رکن ہے، اور ان کے مطالعہ و آراء سے

استفادہ کیا جاتا ہے، عالمِ اسلام اور عالمِ عربی کی بے مائگی و کم ہمتی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ خالص اسلامی و عربی موضوعات پر بھی عرصۂ دراز سے مستشرقین ہی کی کتابوں پر دار و مدار ہے، اور وہ اپنے موضوع پر ایک طرح سے کتابِ مقدس (GOSPEL) کی حیثیت رکھتی ہیں، تاریخ ادبیاتِ عرب پر نکلسن (R. A. NICHOLSON) کی کتاب (A LITERARY HISTORY) تاریخ عرب و اسلام پر ڈاکٹر ہٹی (P. H. HITTI) کی کتاب (HISTORY OF ARABS) تاریخ ادبیاتِ اسلامیہ پر بروکلمان (CARL BROCKLEMANN) کی کتاب (GESCHICHTIE DER ARABISCHEN LITERATURE) جرمن میں، اور اس کا انگریزی ترجمہ (THE HISTORY OF ARAB LITERATURE) اسلامی قانون پر شاخت (SCHACHT) کی کتاب (THE ORIGINS OF MOHAMMADAN JURISPRUDENCE) اپنے اپنے موضوع پر منفرد سمجھی جاتی ہے اور بیشتر مشرقی جامعات میں شعبۂ عربی و اسلامیات میں ان کی حیثیت ایک علمی مرجع (REFERENCE BOOK) اور سند (AUTHORITY) کی ہے، مستشرقین کا مرتب کیا ہوا دائرۃ المعارف الاسلامیۃ (ENCYCLOPAEDIA OF ISLAM) جس کے متعدد ایڈیشن یورپ و امریکہ سے نکل چکے ہیں، اور جن میں برائے نام مسلمان مقالہ نگاروں کی ایک تعداد بھی شامل ہے، اسلامی معلومات و حقائق کا سب سے بڑا اور مستند ذخیرہ سمجھا جاتا ہے، اور مصر و پاکستان میں اسی کو بنیاد بنا کر عربی اور اردو میں منتقل کیا جا رہا ہے۔

اس صورتِ حال کی اصلاح اور مستشرقین کی تخریبی و تشکیکی اثرات کو روکنے کی صرف یہی صورت ہے کہ ان علمی موضوعات پر مسلمان محققین و اہلِ نظر قلم اٹھائیں اور مستشرقین کی ان تمام قابلِ تعریف خصوصیات کو ملحوظ رکھتے ہوئے بلکہ ان کو ترقی دیتے ہوئے جو ان کا حصہ سمجھی جاتی ہیں، مستند و صحیح اسلامی معلومات اور نقطۂ نظر پیش کریں، یہ ایسی تصنیفات ہوں جو اپنی تحقیقات کی اصلیت (ORIGINALITY) مطالعہ کی وسعت نظر کی گہرائی اور عمق، مآخذ کے

استناد وصحت اور اپنے محکم استدلال میں مستشرقین کی کتابوں سے کہیں فائق وممتاز ہوں، ان میں ان کی تمام خوبیاں ہوں، اور وہ ان کی کمزوریوں اور عیوب سے پاک ہوں، دوسری طرف ان مستشرقین کی کتابوں کا علمی محاسبہ کیا جائے اور ان کی تلبیسات کو بے نقاب کیا جائے، متن کے سمجھنے میں ان کی غلط فہمیوں اور ترجمہ و اخذ مطلب میں ان کی غلطیوں کو واضح کیا جائے، ان کے مآخذ کی کمزوری اور ان کے اخذ کئے ہوئے نتائج کی غلطی کو روشن کیا جائے، اور ان کی دعوت و تلقین میں ان کی جو بدنیتی، مذہبی اغراض اور سیاسی مقاصد شامل ہیں، ان کو طشت ازبام کیا جائے اور بتایا جائے کہ یہ اسلام اور ملت اسلامیہ کے خلاف کیسی گہری اور خطرناک سازش ہے۔

اس پہلے مثبت و ایجابی کام (اسلامی موضوعات پر تصنیف) اور اس دوسرے سلبی وجوابی جزو (علمی محاسبہ) کے بغیر دنیائے اسلام کا ذہین و حوصلہ مند طبقہ جو یورپ و امریکہ کی بلند پایہ یونیورسٹیوں یا اپنے ملک کی اعلیٰ تعلیم گاہوں میں تعلیم پاتا ہے، اور مغربی زبانوں ہی میں (جن میں وہ زیادہ مہارت رکھتا ہے) اسلامی لٹریچر کا مطالعہ کرنا چاہتا ہے، مستشرقین کے زہر آلود خیالات کے اثر سے آزاد نہیں ہو سکتا، اور جب تک اس اثر سے آزاد نہ ہو اسلامی ممالک برابر فکری انتشار اور ذہنی ارتداد کے خطرہ سے دوچار رہیں گے، اور ان ممالک میں تجدد و مغربیت کے علمبردار برابر ان خیالات کا اظہار کرتے رہیں گے، اور جب اقتدار ان کے ہاتھ میں آئے گا تو ان کو بروئے کار لانے کی کوشش کریں گے، جو اسلام کی روح کے منافی ہیں، اور ایک ایسے معاشرہ کی تشکیل کرتے ہیں، جو صرف نسل و قومیت میں قدیم اسلامی معاشرہ سے مشابہت رکھتا ہے، اور جس کا رخ مغرب اور خالص مادیت کی طرف ہوگا، اور جس کو دیکھ کر کم سے کم عالم اسلام

کے ان فضلاء اور رہنماؤں سے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ

ترسم نرسی بکعبہ اے اعرابی
کیں رہ کہ میروی بترکستان است

علوم اسلام کا زوال اور علماء کا فکری اضمحلال

عالم اسلام کے جدید اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ اور ان لوگوں کی (جن کے ہاتھ میں حکومت و سیاست کی باگ ڈور ہے) بے راہ روی، غلط اندیشی اور دین سے مایوسی کا کسی قدر سبب وہ جمود و اضمحلال بھی ہے جو علوم اسلامیہ کے مرکزوں اور نمائندوں پر طویل مدت سے طاری ہے اس جمود و اضمحلال کی وجہ سے یہ علوم جو نمو و ارتقاء کی اعلیٰ صلاحیتوں سے بھرپور ہیں اپنی صلاحیت و افادیت اور بدلتی ہوئی زندگی کی رہنمائی کی قابلیت کا وہ روشن ثبوت پیش نہیں کر سکے جو تنازع للبقاء کے اس دور میں درکار تھا، علوم اسلامیہ کا قدیم نصابِ تعلیم اس زمانہ میں تو برابر بدلتا اور زندگی کا ساتھ دیتا رہا جس میں انقلابات بہت دیر میں آتے تھے اور ان کی نوعیت میں بنیادی فرق نہیں ہوتا تھا، یہ انقلابات اشخاص اور حکمراں خاندانوں کی تبدیلی کا نام تھے لیکن اس کے باوجود واضعینِ نصاب اور عالمِ اسلام میں علمی و تعلیمی تحریک کے رہنما برابر اپنی ذہانت و حقیقت پسندی کا ثبوت دیتے اور تبدیلی و اضافہ سے کام لیتے رہے لیکن جب انیسویں صدی عیسوی کا وہ زمانہ آیا جس میں حکمراں خاندانوں کا نہیں بلکہ تہذیبوں اور افکار و اقدار کا انقلاب رونما ہوا اور انقلابات کی کثرت اور شدت دونوں حد سے متجاوز ہو گئیں تو یہ نصاب ایک منزل پر آکر ٹھہر گیا اور اس نے ہر تغیر و اضافہ سے انکار کر دیا، مضامین، مقررہ کتابوں اور طرزِ تعلیم ہر چیز میں

اس روش پر اصرار کیا گیا جو ہندوستان میں بانیٔ درسِ نظامی (ملا نظام الدین لکھنوی م ۱۱۶۱ھ) اور مشرق وسطیٰ میں اٹھارھویں صدی کے علماء ازہر کے زمانہ میں قائم ہوگئی تھی، فقہ وقانونِ اسلامی میں توسیع واضافہ، ان نئے مسائل میں (جو جدید انکشافات نئی اقتصادیات اور نئی تنظیمات نے پیدا کر دیئے تھے) اجتہاد سے کام لینا چھوڑ دیا گیا، اجتہاد جو اپنے اعلیٰ، نازک اور نہایت ضروری شرائط[1] کے ساتھ بہرحال علماء اسلام کا فریضہ اور بدلے ہوئے زمانہ کی رہنمائی کا ذریعہ تھا، عملاً معطل ومسدود ہو گیا، اور ایک معاصر عرب عالم[2] کے بلیغ الفاظ میں "علماء کے نزدیک اس دروازہ کو کھولنا تو (شرعاً) ممنوع نہیں تھا، مگر جس کنجی سے وہ کھل سکتا تھا، وہ عرصے سے گم شدہ تھی"

اسلامی علوم، معارف قرآنی اور شریعت اسلامی کے لئے جس طاقتور، موثر و دلپذیر و دلنشیں تعبیر وتشریح اور اس کے لئے زبان وادب کے اس نئے دور میں جس اسلوب و پیرایۂ بیان کی ضرورت تھی، وہ اگر نایاب نہیں تو کمیاب ضرور تھا، ایسے علماء خال خال پائے جاتے تھے، جو ان دینی حقائق کی ابدیت، زندگی کی صلاحیت اور اسلام کی فوقیت وبرتری کا نقش جدید طبقہ کے دل ودماغ پر قائم کر سکیں اور اپنی بھرپور علمی تنقیدوں اور ماہرانہ تحلیل وتجزیہ سے تہذیب جدید کے طلسم کو توڑ سکیں۔

قانونِ اسلامی کی تدوینِ جدید کی ضرورت!

اس میں شبہ نہیں کہ عالم اسلام کے مختلف گوشوں میں ایسی ممتاز دینی شخصیتیں

---

[1] جن کی تفصیل کتب اصول فقہ میں ہے۔

[2] استاذ مصطفےٰ احمد الزرقاء، استاذ فقہ اسلامی جامعہ عمان وسابق وزیر قانون حکومت شام۔

پیدا ہوئیں جنھوں نے بعض وسیع حلقوں کو اپنی طاقتور اور دل آویز شخصیتوں سے متأثر کیا اور ایک بڑے طبقہ کو ذہنی ارتداد سے بچا لیا اور بعض گوشوں میں فقہ و مسائل اسلامیہ پر کسی حد تک انفرادی کام بھی ہوا اور فقہ و قانون اسلامی کو نئے لباس میں پیش کیا گیا[1] لیکن عالم اسلام میں ایک ایسی طاقتور عالمگیر علمی تحریک کی کمی برابر محسوس کی جا رہی ہے، جو جدید طبقہ کا اسلام کے علمی ذخیرہ سے رشتہ و رابطہ قائم کر سکے، اسلامی علوم میں نئی روح پھونک سکے، اور اس حقیقت کو ثابت کر سکے کہ اسلامی قانون اور فقہ نہایت وسیع اور ترقی پذیر قانون ہے، اور وہ ایسے ابدی اصولوں پر قائم ہے، جو کبھی فرسودہ اور از کار رفتہ نہیں ہو سکتے، جس میں زندگی کے تغیرات و ترقیات کا ساتھ دینے کی پوری صلاحیت ہے، اور جس کی موجودگی میں کسی وضعی و انسانی قانون کی پناہ لینے کی ضرورت نہیں، یہی عصر حاضر کا وہ ضروری کام ہے، جو اسلامی ملکوں اور موجودہ اسلامی معاشرہ کو ذہنی و معاشرتی ارتداد سے بچا سکتا ہے، اور مغرب زدگی اور تجدد کے اس تیز دھارے کو روک سکتا ہے، جو عالم اسلام میں اس وقت اپنی پوری طغیانی پر ہے، علامہ اقبال نے اس کام کی ضرورت و اہمیت اور اس کے دور رس نتائج کے متعلق بجا طور پر لکھا ہے:۔

> "میرا عقیدہ ہے کہ جو شخص زمانۂ حال کے جورس پروڈنس (JURISPRUDENCE) (اصول قانون) پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر احکام قرآنیہ کی ابدیت کو ثابت کرے گا وہی اسلام کا مجدد ہو گا اور بنی نوع انسان کا سب سے بڑا خادم بھی وہی شخص ہو گا، قریباً تمام ممالک میں اس وقت مسلمان یا تو اپنی آزادی کے لئے لڑ رہے ہیں یا قوانین اسلامیہ پر

---

[1] مثال کے طور پر استاذ مصطفیٰ زرقاء کی قابل قدر کتاب "المدخل الفقهي العام" ڈاکٹر مصطفیٰ السباعی کی کتاب "الاحوال الشخصية" (۱-۲-۳) مصر میں شیخ محمد ابو زہرہ کے بعض مضامین مسائل جدیدہ پیش کئے جا سکتے ہیں۔

غور کر رہے ہیں، غرض یہ وقت عملی کام کا ہے، کیونکہ میری رائے ناقص میں مذہب اسلام اس وقت گویا زمانہ کی کسوٹی پر کسا جا رہا ہے، اور شاید تاریخ اسلام میں ایسا وقت اس سے پہلے کبھی نہیں آیا۔"[1]

فقہ اسلامی کی جدید تدوین و توسیع کا کام کسی نئے قانون کی بنیاد رکھنے کے مرادف نہیں جس کے لئے نئے اصول وضع کرنے اور ایک چیز کو عدم سے وجود میں لانے کی ضرورت ہو، اسلامی فقہ، قانون کا وہ عظیم سرمایہ اور انسانی ذہانت و محنت کا وہ عجیب و غریب نمونہ ہے جس کی نظیر دنیا کے قانونی ذخیروں میں ملنی مشکل ہے، یہ زندگی کے بہت بڑے حصہ اور عصر قدیم کے اکثر حالات پر حاوی ہے، صرف اس کی ضرورت ہے کہ ان حکیمانہ اصول و کلیات سے (جو سراسر قرآن و حدیث پر مبنی ہیں) نئے جزئیات کا استنباط کیا جائے اور ان سے موجودہ زندگی کی ضروریات اور تبدیلیوں میں رہنمائی حاصل کی جائے، اس فقہی ذخیرہ کی وسعت اور اس کی قانونی قدر و قیمت کا اندازہ کرنے کے لئے مشہور شامی فاضل و ماہر قانون مصطفےٰ احمد الزرقاء کی کتاب "المدخل الفقهي العام إلى الحقوق المدنية" کے مقدمہ سے ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے جس میں انھوں نے پیرس یونیورسٹی کے ہفتہ "قانونِ اسلامی کے سیمینار میں مغربی ماہرین قانون کا فقہ اسلامی سے متعلق تاثر و نظریہ پیش کیا ہے، وہ کہتے ہیں:۔

• مماثل قوانین کی عالمی اکیڈمی کی مشرقی قانون کی شاخ نے پیرس یونیورسٹی کے لا کالج میں ۲ر جولائی ۱۹۵۱ء میں فقہ اسلامی کا ہفتہ منایا اور ایک کانفرنس منعقد کی، یہ کانفرنس موسیو MILLIOT پروفیسر فقہ اسلامی پیرس یونیورسٹی کی

---

[1] اقبال نامہ حصہ اول صفحہ ۵۰

صدارت میں ہوئی، اس میں عرب غیرعرب ملکوں کے لاکالجوں کے اساتذہ، ازہر کے نمائندے، عرب اور فرانسیسی وکلاء نیز مستشرقین بڑی تعداد میں مدعو کئے گئے، مصر سے چار نمائندے منتخب ہوکر گئے، دو جامعہ فواد سے، ایک جامعہ ابراہیم کے لاکالج کے پرنسپل اور ازہر کی ھیئۃ کبار العلماء[1] کا ایک نمائندہ، دمشق یونیورسٹی کے لاکالج کی طرف سے میں نے اور ڈاکٹر معروف الدوالیبی نے نمائندگی کی، نمائندوں نے دیوانی، فوجداری اور مالی قوانین کے پانچ عنوانات پر بحث کی جو اکیڈمی کی طرف سے پہلے متعین کر دیئے گئے تھے، وہ حسب ذیل تھے :-

(۱) ملکیت کا اثبات (۲) عام مفاد کے لئے استملاک (عوام کی املاک پر قبضہ) (۳) جرم کی ذمہ داری (۴) اجتہادی مذاہب فکر کا ایک دوسرے پر اثر (۵) سود کے بارے میں اسلام کا نقطۂ نظر۔

یہ سب لیکچر اور مباحث فرنچ میں ہوئے تھے اور ہر موضوع کے لئے ایک دن مقرر تھا، ہر لیکچر کے بعد مقرر اور کانفرنس کے نمائندوں کے درمیان مباحثہ ہوتا تھا، جو موضوع اور ضرورت کے اعتبار سے کبھی طویل ہوتا تھا کبھی مختصر، اس کا خلاصہ قلمبند کر لیا جاتا تھا۔

اسی قسم کے مباحثہ کے درمیان ایک ممبر جو پیرس کے بار ایسوسی ایشن کے صدر تھے، کھڑے ہوئے اور انھوں نے کہا ــــــــــ "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اس عمومی خیال میں کہ اسلامی فقہ جامد ہے، اور اس میں جدید معاشرہ کی ضروریات کی تکمیل کی صلاحیت نہیں ہے، اور اس کانفرنس کی تقریروں اور مباحثوں سے اصول و شواہد کی بنیاد پر اس کے بالکل برخلاف جو بات ثابت ہو رہی ہے، ان دونوں میں کیسے مطابقت

---

[1] علماء ازہر کی وہ بڑی کونسل جو اہم دینی و علمی مسائل میں فیصلہ کرتی ہے۔

پیدا کروں؟"

کانفرنس کے اختتام پر تمام نمائندوں نے بالاجماع ایک تجویز پاس کی جس کا ترجمہ حسب ذیل ہے:۔

اس کانفرنس کے شرکاء ان مباحث کے پیش نظر جو فقہ اسلامی کے سلسلہ میں پیش ہوئے اور ان بحثوں کی بنا جس سے یہ بات اچھی طرح ظاہر ہو گئی کہ:——

(الف) اسلامی فقہ کی ایک خاص (قانونی و دستوری) قیمت ہے جس میں شبہ نہیں کیا جا سکتا——(ب) اس عظیم قانونی سرمایہ میں فقہی مذاہب کا یہ اختلاف، معلومات، مدلولات اور قانونی اصولوں کا بڑا خزانہ ہے، جو اعتراف و تحسین کا پورا مستحق ہے، اور اس کے ذریعہ فقہ اسلامی اس قابل ہے کہ جدید زندگی کی ضروریات اور مطالبات کی تکمیل کر سکے—— اپنی اس خواہش کا اظہار کرتے ہیں کہ یہ ہفتہ ہر سال منایا جایا کرے، اور کانفرنس کے سکریٹریٹ کو اس کا ذمہ دار قرار دیتے ہیں کہ وہ ان موضوعات کی ایک فہرست تیار رکھے جن کو آئندہ جلسہ میں بحث و مذاکرہ کی بنیاد بنانے کی ضرورت ہے، اور جن کی اہمیت کا گذشتہ مباحثات سے اظہار ہوتا ہے۔

کانفرنس کے نمائندے اس کی بھی امید رکھتے ہیں کہ فقہ اسلامی کی ایک ڈائرکٹری تیار کرنے کے لئے ایک کمیٹی بنا دی جائے گی جس کے ذریعہ قانون کی کتابوں سے استفادہ اور مراجعت آسان ہو جائے گی اور وہ ایک ایسا فقہی انسائیکلوپیڈیا بن سکے گی جس میں اسلامی قانون کی تمام معلومات جدید طرز پر مرتب کی گئی ہوں گی۔[1]

---

[1] المدخل الفقہی العام، ص، ج، د، ۱۷، تیسرا ایڈیشن ۱۹۵۲ء۔

امید کی روشنی

جدید تعلیم یافتہ طبقہ جو اپنی مخصوص عصری تربیت اور جدید صلاحیتوں کی بنا پر قیادت و رہنمائی کے منصب پر فائز ہے، اپنی ان تمام کمزوریوں اور مزاج کے باوجود جو مغربی تعلیم و تربیت کا نتیجہ ہے، سلامت فہم اور قبولِ حق کی استعداد و صلاحیت سے محروم نہیں، بلکہ عام طور پر وہ قوتِ فیصلہ، قوتِ عمل اور حقیقت پسندی میں بعض دوسرے طبقوں سے بھی ممتاز ہے، اس طبقہ کے بہت سے افراد جب کسی بات کو صحیح اور حق سمجھ لیتے ہیں تو بڑے جوش اور انہماک کے ساتھ اس کی تبلیغ و اشاعت میں مشغول ہو جاتے ہیں، اس طبقہ میں بکثرت ایسے افراد پائے جاتے ہیں جن کو اسلام سے گہرا تعلق اور سچا عشق ہے، اس طبقہ سے اسلام کو بعض بڑے صحیح الخیال، عمیق النظر مفکر، اسلام کے شیدائی اور سرفروش مجاہد حاصل ہوئے، بہت سی دینی دعوتوں اور اسلامی تحریکات کو اسی طبقہ سے پرجوش داعی اور باعمل سپاہی ملے، مشرق وسطیٰ میں سید جمال الدین افغانی، شیخ محمد عبدہٗ اور شیخ حسن البنّا کو اور ہندوستان میں تحریکِ خلافت سے لے کر عصرِ حاضر کی تمام دینی تحریکات کے قائدین کو اسی طبقہ میں سے اپنے بہترین کارکن ہاتھ آئے، اب بھی اگر دین کے داعی بے لوث اور مخلصانہ طریقہ پر اس کو دین سے مانوس کرنے کی کوشش کریں، ان کے ذہن کی ان شکنوں کو دور کر دیں جو مغرب کی مخصوص مزاج کی تعلیم نے ڈال دی ہیں، اور ایمان کی اس چنگاری کو متحرک کرنے میں کامیاب ہو جائیں، جو اب بھی ان کے دل و دماغ کے اندر دبی ہوئی ہے تو اب بھی اس طبقہ میں اقبالؔ و محمد علی جیسے صاحبِ فکر و صاحبِ عمل افراد پیدا ہو سکتے ہیں، یہ دین کے داعی کے لئے ایک ایسا حیرت انگیز لیکن مسرّت بخش انکشاف ہوگا کہ اس کی زبان سے بے اختیار نکلے گا کہ۔ ؎

ایسی چنگاری بھی یارب اپنے خاکستر میں تھی

عالمگیر صورتِ حال کی تبدیلی کے لئے اور عالمِ اسلام کے حالات میں انقلابِ عظیم پیدا کرنے کے لئے دین کے داعیوں کو اس طبقہ پر اپنی توجہ مرکوز کرنے کی ضرورت ہے کہ اسی طبقہ کی غلط اندیشی اور بے راہ روی نے عالمِ اسلام کو ذہنی ارتداد کے خطرہ میں مبتلا کر دیا ہے، اسلامی ممالک کا رخ خالص اسلامیت کے بجائے خالص مغربیت کی طرف موڑ دیا ہے، اور عوام کو بے زبان گلّہ اور جانوروں کے ریوڑ کی طرح غیر اسلامی قیادت کے ہاتھ میں دے دیا ہے، اور اسی طبقہ کی اصلاح سے دوبارہ اِن ممالک کا رخ مغربیت سے اسلامیت کی طرف موڑا جا سکتا ہے۔

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

عالمِ اسلام کا مستقل و مجتہدانہ کردار

تیسرا موقف

اب دیکھنا یہ ہے کہ تیسرا موقف کیا ہے، وہ متوازن اور صحیح موقف، جو عالم اسلام کو مغربی تہذیب کے بارہ میں اختیار کرنا چاہیئے، اور جو مغربیت و اسلامیت کی اس کشمکش میں اس کی شخصیت کی حفاظت کر سکتا ہے۔

عالم اسلام کے موقف کا تعین اس وقت تک نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ ہم امت اسلامیہ کے مزاج اور اس دنیا میں اس کے منصب اور حیثیت سے واقف نہ ہوں پھر اس زندگی کے بارہ میں اس کے نقطۂ نظر سے باخبر ہوں جو تہذیب کو پیدا کرتا ہے، اور سوسائٹیوں اور تمدنوں کی تشکیل کرتا ہے۔

امت اسلامیہ کا مقام اور اس کی دعوت!

امت اسلامیہ، آخری دینی پیغام کی حامل ہے، اور یہ پیغام اس کے تمام اعمال اور حرکات و سکنات پر حاوی ہے، اس کا منصب قیادت و رہنمائی اور دنیا کی نگرانی و احتساب کا منصب ہے، قرآن مجید نے بہت قوت اور صراحت کے ساتھ اعلان کیا ہے:۔

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ	(اے پیروان دعوت ایمانی) تم تمام امتوں میں
تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ	"بہتر امت" ہو جو لوگوں (کی ارشاد و اصلاح)
عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ۔	کے لئے ظہور میں آئی ہے تم نیکی کا حکم دینے والے برائی
(آل عمران۔۔۱۱۰)	سے روکنے والے اور اللہ پر سچا ایمان رکھنے والے ہو۔

دوسری جگہ کہا گیا ہے:۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ (البقرہ ۱۴۳)

اور اسی طرح تو ہم نے تمہیں ایک "امت وسط" بنایا ہے تاکہ تم دنیا کے لوگوں پر گواہ ہو۔

اس لئے اس کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ اس امت کی جگہ قافلہ کے پیچھے اور شاگردوں اور غاشیہ برداروں کی صف میں ہو اور وہ دوسری اقوام کے سہارے زندہ رہے، اور قیادت و رہنمائی، امر و نہی اور ذہنی و فکری آزادی کے بجائے تقلید اور نقل، اطاعت و سپر اندازی پر راضی اور مطمئن ہو، اس کے صحیح موقف کی مثال اس شریف قوی الارادہ، آزاد ضمیر شخص سے دی جا سکتی ہے، جو ضرورت و احتیاج کے وقت دوسروں سے اپنے ارادہ و اختیار سے وہ چیزیں قبول کرتا ہے، جو اس کے حالات کے مطابق ہوں اور اس کی شخصیت اور خود اعتمادی کو مجروح نہ کرتی ہوں، اور ان چیزوں کو مسترد کر دیتا ہے، جو اس کی شخصیت اور حیثیت کے مطابق نہ ہوں یا اس کو کمزور کرتی ہوں، یہی وجہ ہے کہ اس قوم کو کسی دوسری قوم کے شعائر اور امتیازات اختیار کرنے سے منع کیا گیا ہے۔[1]

---

[1] علامہ (حسین بن محمد عبداللہ) طیبی (م ۷۴۳ھ) اپنی کتاب "الکاشف عن حقائق السنن المحمدیۃ" (شرح مشکوٰۃ المصابیح) میں حدیث "من تشبہ بقوم فھو منھم" کی شرح بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں، یہ اخلاق، شکل و صورت اور شعار تینوں کے لئے عام ہے، لیکن چونکہ شعار سب سے زیادہ نمایاں اور ظاہر ہوتا ہے اس لئے اس کو اس باب میں ذکر کیا ہے، ملا علی قاری (م ۱۰۱۴ھ) نے مرقاۃ میں لکھا ہے کہ یہاں شعائر ہی میں تشبہ مراد ہے اس لئے کہ صوری اخلاق میں تشبہ کا تصور نہیں ہوتا، اور معنوی اخلاق کے لئے تشبہ کا نہیں بلکہ تخلق کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے، اس لئے اس سے مراد قومی خصائص اور علامات ہی ہیں (ج ۴ ص ۱۵۵)

یہ قوم زندگی کا ایک خاص متعین مقصد رکھتی ہے، دنیا کے لئے اس کے پاس ایک مکمل دعوت ہے اس کی تہذیب و ثقافت، اس کی جدوجہد اور عمل اور اس کی ہر قسم کی سرگرمی اور نشاط اس کے عقیدہ، مقاصد اور پیغام کی تابع ہے، اس کے نزدیک علم برائے علم، اور طاقت برائے طاقت، اور اتحاد برائے اتحاد کی کوئی قیمت نہیں، انسان اور کائنات پر فتح حاصل کرنا اور طبعی و فلکی طاقتوں کی تسخیر (اگر وہ اپنی قوت یا اپنی مادی اور علمی فتوحات کے اظہار کے لئے ہو) اس کے نزدیک لہو و لعب یا حد سے بڑھی ہوئی انانیت کے سوا کچھ نہیں، قرآن مجید اس کے جذبات اور میلانات کو اس آیت سے قابو میں رکھتا ہے:۔

تِلْكَ الدَّارُ الْآخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِينَ	یہ عالم آخرت ہم ان لوگوں کے لئے خاص
لَا يُرِيدُونَ عُلُوًّا فِي الْأَرْضِ	کرتے ہیں جو دنیا میں نہ بڑا بننا چاہتے ہیں
وَلَا فَسَادًا وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ	اور نہ فساد کرنا، نیک نتیجہ متقی لوگوں کو
(القصص۔ ۸۳)	ملتا ہے۔

طاقتور، باخبر، صالح اور مصلح مسلمان!

ضرورت کی حد تک اور انسانیت کے مفاد اور نیک مقاصد کے لئے اسلام زندگی کائنات اور علم کی راہ میں جدوجہد کو نا جائز قرار دیتا ہے، بلکہ بعض اوقات اس کی ترغیب بھی دیتا ہے، اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے طاقتور، باخبر و ہوشمند اور صالح و مصلح مومن کی مثال دی ہے، جو کائناتی و مادی طاقتوں کو مسخر بھی کرتا ہے، اور اسباب و وسائل کا ذخیرہ بھی جمع کرتا ہے، اور اپنی فتوحات اور مہمات کا دائرہ بھی برابر وسیع

کرتا رہتا ہے لیکن اپنی طاقت، سلطنت اور قیادت کے شباب میں بھی اور ظاہری اسباب پر تصرف کے بعد بھی اپنے رب پر ایمان رکھتا ہے، اس کے سامنے سر تسلیم خم کرتا ہے، آخرت پر یقین رکھتا ہے، اور اس کے لئے جدوجہد کرتا ہے، اپنے ضعف کا معترف ہے، انسانیت اور کمزور قوموں پر رحم دل اور حق کا حامی ہے، اور اپنی ساری قوت، جدوجہد، صلاحیتیں اور اپنے سارے وسائل اور ذخائر، اللہ کے نام کی بلندی اور انسانوں کو ظلمتوں سے نور کی طرف اور انسان کی بندگی سے اللہ کی بندگی کی طرف بلانے میں صرف کرتا ہے، وہ سیرت اور کردار جس کی نمائندگی سلیمان بن داؤد علیہما السلام، ذوالقرنین اور خلفاء راشدین اور ائمۂ اسلام نے اپنے اپنے زمانہ میں کی ہے۔

زندگی، آخرت کے لئے ایک عبوری مرحلہ!

اس زندگی کے بارہ میں اس کی پالیسی اور موقف یہ ہے کہ وہ اس کو سب سے بلند مقصد "آدرش" اور ترقی و کامیابی کی معراج نہیں سمجھتا، وہ اس کو ایک ایسا عبوری مرحلہ سمجھتا ہے جس کو پار کرنا انسان کے لئے ضروری ہے، اس کے نزدیک وہ عظیم تر کامیابی، لافانی اور پُر مسرت زندگی کا ایک ذریعہ اور واسطہ ہے، قرآن مجید اس دنیا کی بے ثباتی اور آخرت کے مقابلہ میں اس کی بے حقیقتی بیان کرتے ہوئے بہت وضاحت اور قوت کے ساتھ کہتا ہے:۔

فَمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِيْلٌ ۝ (التوبہ۔ ۳۸)

(یاد رکھو) دنیا کی زندگی کی متاع تو آخرت کے مقابلہ میں کچھ نہیں ہے مگر تھوڑی!

دوسری جگہ ارشاد ہے :۔

وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَھِیَ الْحَیَوَانُ	اور اصل زندگی عالمِ آخرت ہے اگر ان کو
لَوْ کَانُوْا یَعْلَمُوْنَ ○ (العنکبوت ۶۴)	اس کا علم ہوتا تو ایسا نہ کرتے!

ایک اور جگہ آتا ہے :۔

اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا لَعِبٌ	تم خوب جان لو کہ (آخرت کے مقابلہ میں) دنیوی
وَّلَھْوٌ وَّزِیْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌ بَیْنَکُمْ	زندگی محض لہو و لعب اور (ایک ظاہری) زینت
وَتَکَاثُرٌ فِی الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ ؕ	اور باہم ایک دوسرے پر فخر کرنا اور اموال اور
کَمَثَلِ غَیْثٍ اَعْجَبَ الْکُفَّارَ	اولاد میں ایک دوسرے سے زیادہ بتلانا ہے جیسے
نَبَاتُهٗ ثُمَّ یَھِیْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا	مینہ (برستا) ہے کہ اس کی پیداوار (کھیتی) کاشتکاروں
ثُمَّ یَکُوْنُ حُطَامًا ؕ وَفِی الْاٰخِرَةِ	کو اچھی معلوم ہوتی ہے پھر وہ خشک ہو جاتی ہے سو
عَذَابٌ شَدِیْدٌ ۙ وَّمَغْفِرَةٌ مِّنَ	اس کو تو زرد دیکھتا ہے پھر وہ چورا چورا ہو جاتی
اللّٰهِ وَرِضْوَانٌ ؕ وَمَا الْحَیٰوةُ	ہے اور آخرت (کی کیفیت یہ ہے کہ اس) میں عذاب
الدُّنْیَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ	شدید ہے اور خدا کی طرف سے مغفرت اور رضامندی
(الحدید۔ ۲۰)	ہے اور دنیوی زندگانی محض دھوکے کا اسباب ہے

وہ بہت صفائی کے ساتھ اس کو آخرت کا پل اور عمل کا ایک موقع قرار دیتا ہے ارشاد ہے :۔

اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَی الْاَرْضِ زِیْنَةً	روئے زمین پر جو کچھ بھی ہے اسے ہم نے زمین کی
لَّھَا لِنَبْلُوَھُمْ اَیُّھُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا	خوشنمائی کا موجب بنایا ہے اور اس لئے بنایا ہے
(الکہف۔ ۷)	کہ لوگوں کو آزمائش میں ڈالیں کون ایسا ہے جس کے
	کام سب سے زیادہ اچھے ہوتے ہیں۔

ایک اور موقع پر آتا ہے:۔

الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ وَھُوَ الْعَزِیْزُ الْغَفُوْرُ ۙ (الملک۔۲)

جس نے موت اور حیات کو پیدا کیا تاکہ تمہاری آزمائش کرے کہ تم میں کون شخص عمل میں زیادہ اچھا ہے، اور وہ زبردست (اور) بخشنے والا ہے۔

وہ کہتا ہے کہ آخرت زیادہ بہتر اور زیادہ پائدار حقیقت ہے:۔

وَمَا الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَآ اِلَّا لَعِبٌ وَّلَھْوٌ ؕ وَلَلدَّارُ الْاٰخِرَۃُ خَیْرٌ لِّلَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ○ (الانعام۔۳۲)

اور دنیا کی زندگانی تو کچھ نہیں ہے مگر (ایک طرح کا) کھیل اور تماشا، اور جو متقی ہیں تو یقیناً ان کے لئے آخرت ہی کا گھر بہتر ہے (افسوس تم پر) کیا تم (اتنی بات بھی) نہیں سمجھتے!

وَمَآ اُوْتِیْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَمَتَاعُ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَزِیْنَتُھَا ۚ وَمَا عِنْدَ اللّٰہِ خَیْرٌ وَّاَبْقٰی ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ○ (القصص۔۶۰)

اور جو کچھ تم کو دیا دلایا گیا ہے وہ محض (چند روزہ) دنیوی زندگی کے برتنے کے لئے ہے اور یہیں کی (زیب) زینت ہے اور جو (اجر و ثواب) اللہ کے ہاں ہے وہ بدرجہا اس سے بہتر ہے اور زیادہ باقی رہنے والا ہے کیا تم لوگ (اس تفاوت کو) نہیں سمجھتے؟

وہ ان لوگوں کی مذمت کرتا ہے، جو اس فانی، عارضی، ناقص اور پرعیب دنیا کو ابدی، لازوال، وسیع، ہر قسم کی کدورت اور آلائش، بیماری اور نقصان سے خالی، ہر اندیشہ سے آزاد اور ہر خطرہ سے پاک آخرت پر ترجیح دیتے ہیں، قرآن مجید کہتا ہے:۔

اِنَّ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا

جو لوگ (مرنے کے بعد) ہم سے ملنے کی توقع

وَرَضُوْا بِالْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا	نہیں رکھتے صرف دنیا کی زندگی ہی میں مگن ہیں
وَاطْمَاَنُّوْا بِہَا وَالَّذِیْنَ ھُمْ عَنْ	اور اس حالت پر مطمئن ہو گئے ہیں اور جو لوگ ہماری
اٰیٰتِنَا غٰفِلُوْنَ ۝ اُولٰٓئِکَ مَاْوٰھُمُ	نشانیوں سے غافل ہیں تو ایسے ہی لوگ ہیں جن کا
النَّارُ بِمَا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ ۝	(آخری) ٹھکانا دوزخ ہوگا، بسبب اس کمائی کے
(یونس - ۷،۸)	جو (خود اپنے ہی عملوں کے ذریعہ) کماتے رہتے ہیں۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:۔

مَنْ کَانَ یُرِیْدُ الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا	جو کوئی (صرف) دنیا کی زندگی اور اس کی
وَزِیْنَتَھَا نُوَفِّ اِلَیْھِمْ اَعْمَالَھُمْ	دلفریبیاں ہی چاہتا ہے تو (ہمارا ٹھہرایا ہوا
فِیْھَا وَھُمْ فِیْھَا لَا یُبْخَسُوْنَ ۝	قانون یہ ہے کہ) اس کی کوشش و عمل کے
اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ لَیْسَ لَھُمْ فِی	نتائج یہاں پورے پورے دے دیتے ہیں ایسا نہیں
الْاٰخِرَۃِ اِلَّا النَّارُ وَحَبِطَ مَا	ہوتا کہ دنیا میں اس کے ساتھ کمی کی جائے لیکن
صَنَعُوْا فِیْھَا وَبٰطِلٌ مَّا کَانُوْا	یاد رکھو) یہ وہ لوگ ہیں جن کے لئے آخرت (کی
یَعْمَلُوْنَ ۝	زندگی) میں (دوزخ کی) آگ کے سوا کچھ نہ ہوگا
(ہود - ۱۵،۱۶)	جو کچھ انھوں نے یہاں بنایا ہے سب
	اکارت جائے گا اور جو کرتے رہے ہیں سب
	نابود ہونے والا ہے۔

وَوَیْلٌ لِّلْکٰفِرِیْنَ مِنْ عَذَابٍ	اور عذاب سخت کی خرابی ہے ان منکروں کے
شَدِیْدِ ۝ الَّذِیْنَ یَسْتَحِبُّوْنَ	لئے جنھوں نے آخرت چھوڑ کر دنیا کی زندگی
الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا عَلَی الْاٰخِرَۃِ	پسند کرلی، جو اللہ کی راہ سے انسانوں کو روکتے

وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ يَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۗ اُولٰٓئِكَ فِیْ ضَلٰلٍۭ بَعِيْدٍ ○ (ابراہیم ۲، ۳)	ہیں اور چاہتے ہیں کہ اس میں کجی ڈالیں یہی لوگ ہیں کہ بڑی گہری گمراہی میں جا پڑے۔
يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ ○ (الروم۔۷)	یہ لوگ صرف دنیوی زندگی کے ظاہر کو جانتے ہیں، اور یہ لوگ آخرت سے بے خبر ہیں!
فَاَعْرِضْ عَنْ مَّنْ تَوَلّٰى ۙ عَنْ ذِكْرِنَا وَلَمْ يُرِدْ اِلَّا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۗ ذٰلِكَ مَبْلَغُهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ ۗ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۙ وَهُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اهْتَدٰى ○ (النجم ۲۹، ۳۰)	آپ ایسے شخص سے اپنا خیال ہٹا لیجئے جو ہماری نصیحت کا خیال نہ کرے اور بجز دنیوی زندگی کے اس کو کوئی (اخروی مطلب) مقصود نہ ہو ان لوگوں کی فہم کی رسائی کی حد بس یہی (دنیوی زندگی) ہے، تمہارا پروردگار خوب جانتا ہے کہ کون اس کے راستہ سے بھٹکا ہوا ہے اور وہی اس کو خوب جانتا ہے جو راہ راست پر ہے۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:۔

اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ يُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ وَيَذَرُوْنَ وَرَآءَهُمْ يَوْمًا ثَقِيْلًا ○ (الدھر۔ ۲۷)	یہ لوگ دنیا سے محبت رکھتے ہیں اور اپنے آگے (آنے والے) ایک بھاری دن کو چھوڑ بیٹھے ہیں۔

ایک اور جگہ یہ آیت ملتی ہے:۔

فَاَمَّا مَنْ طَغٰیۙ وَ اٰثَرَ الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَاۙ فَاِنَّ الْجَحِیْمَ ھِیَ الْمَاْوٰیؕ (النّٰزعٰت۔ ۳۷، ۳۸، ۳۹)

جس شخص نے (حق سے) سرکشی کی ہوگی اور (آخرت کا منکر ہوکر) دنیوی زندگی کو ترجیح دی ہوگی سو دوزخ (اس کا) ٹھکانہ ہوگا۔

وہ اس شخص کی تعریف کرتا ہے' جو آخرت کو ترجیح دیتے ہوئے اور پیش نظر رکھتے ہوئے دنیا و آخرت دونوں میں کامیاب زندگی گذارتا ہے' وہ کہتا ہے:۔

رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّ فِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ (البقرہ۔ ۲۰۱)

اے ہمارے رب ہمیں دنیا میں بھی بھلائی دے اور آخرت میں بھی بھلائی، اور آگ کے عذاب سے ہمیں بچا۔

حضرت موسیٰؑ کی زبان سے ارشاد ہوتا ہے:۔

وَاکْتُبْ لَنَا فِیْ ھٰذِہِ الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّ فِی الْاٰخِرَۃِ اِنَّا ھُدْنَآ اِلَیْکَ ط (الاعراف۔ ۱۵۶)

اور (خدایا!) اس دنیا کی زندگی میں بھی ہمارے لئے اچھائی لکھ دے اور آخرت کی زندگی میں بھی ہمارے لئے اچھائی کر ہم تیری طرف لوٹ آئے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تعریف کرتے ہوئے قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:۔

وَاٰتَیْنٰہُ فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً ط وَاِنَّہٗ فِی الْاٰخِرَۃِ لَمِنَ الصّٰلِحِیْنَ ؕ (النحل۔ ۱۲۲)

اسے دنیا میں بھی بہتری دی اور بلاشبہ آخرت میں بھی اس کی جگہ صالح انسانوں میں ہوگی۔

وہ تعبیر اور تمثیل جو اس دنیا کے بارہ میں ایک مسلمان کے موقف کو بہت کامیابی اور نزاکت کے ساتھ متعین کرتی ہے' وہ یہ ماثور حکیمانہ جملہ ہے، جو جمعہ کے بعض خطبات کا جزو ہے "اِنَّ الدُّنْیَا خُلِقَتْ لَکُمْ وَ اَنْتُمْ خُلِقْتُمْ لِلْاٰخِرَۃِ" (دنیا تمہارے لئے

پیدا کی گئی ہے، اور تم آخرت کے لئے پیدا کئے گئے ہو) مسلمان دنیا کے اسباب و وسائل سے اس طرح فائدہ اٹھاتا ہے، جیسے کہ یہ چیز اس کے لئے مسخر کر دی گئی بلکہ اسی کے لئے وجود میں آئی ہے، اور آخرت کے لئے وہ اس طرح کوشش کرتا ہے جیسے کہ وہ اسی کے لئے پیدا کیا گیا ہے، وہ دنیا اور اس کے اسباب و وسائل کو مرکب سمجھتا ہے، راکب نہیں، غلام اور ماتحت سمجھتا ہے آقا اور مالک نہیں، ذریعہ اور وسیلہ سمجھتا ہے، مقصد اور غایت نہیں، آخرت کو وہ اپنے سفر کی "منزلِ مقصود" سمجھتا ہے، جہاں اس کو پہونچنا ہے، ایسا وطن سمجھتا ہے، جہاں اس کو پناہ لینا ہے، چنانچہ وہ اس کے لئے اپنی ساری قوت جمع کرتا ہے، ہر قسم کی زحمت مول لیتا ہے، عزم اور شوق کے ساتھ اپنے وسائل کو کام میں لاتا ہے، اور یہ نبوت کی وہ مثال ہے، جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے دی تھی، آپ نے فرمایا تھا:۔

مَالِی وَلِلدُّنْیَا، اِنَّمَا اَنَا کَرَاکِبٍ اسْتَظَلَّ تَحْتَ شَجَرَۃٍ ثُمَّ رَاحَ وَتَرَکَھَا۔[1]	میرا اور دنیا کا تعلق صرف اتنا ہے کہ میری مثال اس سوار کی طرح ہے جو تھوڑی دیر کے لئے ایک درخت کے نیچے سایہ لینے کے لئے بیٹھ گیا پھر اس کو چھوڑ کر چلا گیا!

دنیا کی زندگی کے بارہ میں قرآن کا یہ طرزِ بیان اور تمثیل رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی زندگی، آپ کی تعلیمات، آپ کی گفتگو، آپ کے جذبات، آپ کی دعاؤں آپ کی خلوت و جلوت، ہر چیز سے عیاں ہے، ان قدسی نفوس کی زندگی بھی اس کی تصویر پیش کرتی ہے جنھوں نے آپ کے دامنِ عاطفت میں تربیت پائی اور ان کی شخصیت اور سیرت کی تعمیر آپ کی تربیت میں ہوئی اور اسی طرح وہ تابعین اور دوسرے اہلِ ایمان و

---

[1] مسند احمد و ترمذی۔

یقین جو ان کے راستہ پر چلتے رہے اور ان کی ہدایت پر عمل پیرا رہے۔

یہ ان کا مزاج اور سرشت بن گئی تھی' اور ایک ایسی تاریخی حقیقت جس میں شبہ کی کوئی گنجائش نہیں' یہ وہ نقطہ ہے جہاں آسمانی مذاہب اور نبوت کی تعلیمات یا (اگر یہ تعبیر صحیح ہو) مدرسۂ نبوت مادی فلسفوں اور اس مادی فکر سے ٹکراتا ہے جس کا اصرار یہ ہے کہ یہی دنیا سب کچھ ہے، یہی انسان کا منتہا ہے' چنانچہ وہ اس کی تعریف و تقدیس' اور اس کی عزت و محبت میں اور اس کو آرام دہ اور اچھے سے اچھا بنانے میں مبالغہ سے کام لیتا ہے۔

دینی و روحانی قدروں سے باغی تہذیب

یہ انسانیت کی ایک بہت بڑی ٹریجڈی اور تاریخ کا عظیم المیہ تھا کہ مغربی تہذیب اس زمانہ اور اس قوم میں وجود میں آئی جو ایمان بالغیب جیسی دین کی بنیادوں سے باغی تھی' اور دین کے ان نام نہاد علمبرداروں سے سخت بیزار اور متنفر تھی جنھوں نے دین کو اپنے ذاتی مصالح اور نفسانی خواہشات کا تابع اور آلۂ کار بنا رکھا تھا، ان کی بدکرداری' ان کی وحشت و جہالت، اور علم و عقل کے راستہ میں رخنہ اندازی کی کوشش سے وہ ان سے برافروختہ و بیزار تھی' چنانچہ تہذیب و صنعت اور تیز مادی رجحان ساتھ ساتھ آگے بڑھے' یہ رجحان یہ تھا کہ زندگی کی تنظیم خالص مادی بنیادوں پر کی جائے، جس میں انسانیت اور معاشرۂ انسانی کا اس کے خالق و رب سے کوئی تعلق نہ ہو' یہ سب ان اسباب اور یورپ کے مخصوص حالات کا نتیجہ تھا' جن حالات میں اس تہذیب کا نشو و نما ہوا، وہ مادی اسباب اور کائناتی قوتوں پر قابو پا چکی تھی' اور سائنس و صنعتی علوم میں

بہت آگے بڑھ چکی تھی، یہاں تک کہ آخر میں مسافتیں اور فاصلے بھی اس کے لئے ختم ہوگئے اور وہ اس قابل بھی ہوگئی کہ ہوائی کرہ کو پار کر سکے، خلا میں آزادانہ سفر کرے اور کم سے کم وقت میں کرۂ ارضی کے گرد چکر لگائے اور وہ کامیابیاں حاصل کرے جو پچھلی نسلوں کے خواب و خیال میں بھی نہیں آسکتی تھیں۔

مشرق اسلامی کے تجدّد پسند رہنماؤں پر مادّیت کا غلبہ!

یہ مادی رجحان اور نفسیات مشرق اسلامی کے تجدّد پسند بلکہ زیادہ صحیح الفاظ میں مغرب پرست قائدین میں بھی منتقل ہوگئی، کمال[1] سے جمال[2] تک اسلامی ممالک کے تمام رہنما مادیت کے عشق میں یکساں طور پر سرشار نظر آتے ہیں، انھوں نے بھی "قوت" اور "ترقی" کو ایسا معبود مطلق بنا لیا ہے جس کی پرستش واجب ہے، اور جس کے علاوہ کوئی حقیقت موجود نہیں جس کی قربان گاہ پر ساری اخلاقی و روحانی قدریں اور ہر وہ چیز جس کی مادی افادیت نہ ہو بھینٹ چڑھا دی جانی چاہئیں۔

اس کے ثبوت کے لئے ان قومی رہنماؤں اور سیاسی لیڈروں کے بیانات، ان کے مضامین، ان کے اعلانات و منشور اور ان کی عملی کارروائیاں اور اقدامات اور وہ معاملہ جو یہ لوگ ان جماعتوں کے ساتھ کرتے ہیں، جو ان رجحانات پر تنقید کرتی ہیں، بالکل کافی ہے جو شخص حکومت کے منصوبوں اور پلانوں اور اس کی سرگرمیوں کا دیانتدارانہ جائزہ لے گا، وہ محسوس کرے گا کہ ان کے سامنے ملک کی صرف مادّی ترقی و خوشحالی ہے، اس کا مقصد معیارِ زندگی کو بلند کرنا اور ان قوموں کی برادری میں شامل ہونا ہے، جو مادّہ اور محسوسات

---

[1] کمال اتاترک [2] جمال عبدالناصر

کے سوا کسی اور چیز سے واقف نہیں اور طاقت کے سوا ان کا کوئی معبود نہیں، مادی ترقی اور ارضی خوشحالی کے سوا ان کا کوئی نصب العین اور مقصود نہیں، وہ صرف انسانوں کے اس مجموعہ کو معتبر مانتی ہیں، جن کو کوئی قومی یا سیاسی معاہدہ مربوط کرتا ہے اور وہی اس کے نزدیک عزت و احترام کا مستحق ہے، اس ذہن و مزاج اور نفسیات (سائیکالوجی) نے ہر دور میں دنیا کو مصیبت میں ڈالا ہے، مذاہب نے اس تنگ اور مریض ذہنیت کے خلاف جہاد کیا ہے، اسلام بھی اس کو مٹانے کے درپے ہے، کسی اسلامی ملک کے رہنما کا اس ذہنیت کو اپنانا اور اس طرز فکر کو اختیار کرنا بہت بڑے فکری انحطاط اور پستی کی علامت ہے جس سے ایمان کی کمزوری، تربیت کی خرابی، پست ہمتی اور تنگ نظری کا پتہ چلتا ہے، اور یہ خود اس ملک کے لئے اور اس کے نتیجہ میں ساری دنیا کے لئے ایک بڑی بدنصیبی ہے۔

اپنی اسلامی شخصیت اور اس دنیا میں اس امت کے منصب و مقام کی حفاظت اس کا احساس کہ اس کا پیغام اور دعوت کیا ہے، اخروی زندگی اور زندگی کے اخلاقی و روحانی پہلو پر اصرار اور وہ حدِ فاصل (LINE OF DEMARCATION) ہے، جو ان دو تہذیبوں کو ایک دوسرے سے جدا کرتی ہے، ایک وہ تہذیب جس کا سرچشمہ اسلام ہے، اور اس کی ذمہ داری اس نے قبول کی ہے، اس میں اسلامی شخصیت کی خودنگری اور خودشناسی نظر آتی ہے، دوسری تہذیب وہ ہے جس سے اسلام نے برأت کا اظہار کیا ہے، اور مسلمانوں کا اس میں نقصان ہی نقصان ہے، اور اس میں ذہنی غلامی، شکست خوردگی پوری طرح نمایاں ہے، اور بندروں کی طرح نقل کرنے (APING) کا جذبہ اور طوطے کی طرح ہر سنی ہوئی چیز کو دہرانے کا طریقہ اس سے صاف ظاہر ہے۔

ذہانت اور قوت ارادی کا امتحان

تہذیب کا ڈھانچہ تیار کرنا اور تمدن کی تشکیل، انسانی ذہانت، کسی قوم کی عبقریت (GENIUS) اس کی قوتِ ارادی اور حوصلہ مندی اور دین کے صحیح فہم کا امتحان ہے، وہ مجرد نقل و تنقید یا اضافہ و ترمیم کا عمل نہیں ہے، اسلام نے حرام و حلال کے حدود مقرر کئے ہیں، ان حدود سے آگے بڑھنا اس نے ناجائز بتایا ہے، اس کے درمیان پاکیزہ اور مناسب طریقہ پر زندگی سے تمتع کا وسیع میدان ہے، شرط یہ ہے کہ اس میں اسراف و بخل نہ ہو، دوسروں کی حق تلفی نہ ہو، گناہ میں ملوث ہونے اور اسراف وغیرہ میں مبتلا ہو جانے کا ڈر نہ ہو، غرض کہ زندگی کا وہ طرز نہ ہو جو مردانہ اوصاف اور شریفانہ خصائل کے منافی ہو، یہ اسپرٹ لباس، غذا، گھر اور گھر کے ماحول اور زندگی سے لطف اندوزی کے ہر شعبہ میں جاری و ساری ہے، اس نے مصالح کی رعایت، مفاسد اور مضرتوں سے احتیاط، مادی اور دفاعی قوت کا ممکن حد تک حصول، اور مفید اور نافع علوم سے استفادہ کی ترغیب دی ہے، بشرطیکہ وہ اس کی شخصیت کی بنیادوں کو کمزور اور اس کی اسلامی قومیت کو مجروح نہ کرتی ہوں، نیز اس قوم میں احساس کمتری، بے اعتمادی اور دوسروں کی بے ارادہ اور جذباتی طریقہ پر اندھی تقلید، ان کے رنگ میں رنگ جانے اور ان کے طرزِ حیات کو عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھنے کا جذبہ اور خواہش پیدا نہ ہو۔

فولاد کی سختی اور ریشم کی نرمی!

یہ اس تہذیب کی اساس ہے جس میں ایک طرف فولاد کی سختی ہے دوسری طرف ریشم کی سی نرمی،

یہ تہذیب، حقائق، نئے مسائل اور وقت کے نئے تقاضوں کے معاملہ میں (بغیر مبالغہ اور خیال آرائی اور تخیل پسندی کے) ریشم کی نرمی رکھتی ہے، عقیدہ و اخلاق کی سرحدوں پر وہ فولاد سے زیادہ سخت ہے، اور پہاڑوں کی طرح ثابت قدم اور غیور، وہ دنیا کے علوم کے بارہ میں خواہ وہ کسی دور دراز ملک اور خطہ میں ہوں اپنی ضمیر و عقل کی آنکھ کھلی رکھتی ہے اور سینہ کشادہ، نیز ان تنظیموں اور منصوبوں کو قبول کرنے کے لئے آمادہ رہتی ہے، جو نہ دین کو مجروح کرتے ہیں، نہ اس کے اخلاقی نظام میں کوئی تغیر پیدا کرتے ہیں۔

مغرب سے استفادہ کا حقیقی میدان اور اس کے حدود!

یہاں پر محمد اسد صاحب کی کتاب (ROAD TO MECCA) کا ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے جس میں خیالات کا توازن اور فکر و نظر کی پختگی بہت نمایاں ہو کر سامنے آئی ہے اور جس میں انھوں نے بہت خوبی کے ساتھ اس شاہراہ کی نشان دہی کی ہے جس پر عالم اسلام کو مغرب سے استفادہ اور جدید وسائل سے کام لینے کے میدان میں چلنا چاہیئے، وہ کہتے ہیں :-

"عالم اسلام اور یورپ کبھی ایک دوسرے سے اتنے قریب نہیں ہوئے تھے جتنے آج ہیں، اور یہی قرب اس ظاہری اور پوشیدہ کشمکش کا باعث ہے جو آج ان دونوں میں پائی جاتی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد (مردوں، عورتوں) کی روحیں مغربی ثقافت کے اثر سے آہستہ آہستہ سکڑتی اور سمٹتی جا رہی ہیں، اپنے اس گذشتہ احساس سے وہ دور ہوتے جا رہے ہیں کہ معیار معیشت کی درستی اور اصلاح صرف انسان کے روحانی احساسات کی اصلاح و ترقی کا ایک ذریعہ ہے، وہ اسی ترقی کے بت کی پرستش کا شکار ہوتے جا رہے ہیں، جس کی وجہ سے یورپ تباہ ہو رہا ہے،

ان لوگوں نے دین کو واقعات و حوادث کے پیچھے کی ایک فرسودہ آواز سمجھنا شروع کر دیا ہے اس لئے وہ بجائے بلند ہونے کے اور پست ہوتے جارہے ہیں۔

میرے کہنے کا مطلب یہ نہیں کہ مسلمان مغرب سے کچھ فائدہ نہیں اٹھا سکتے بالخصوص صنعتی علوم وفنون کے میدانوں میں اس لئے کہ علمی افکار و اسالیب کا اختیار کرنا درحقیقت تقلید نہیں، خصوصاً اس امت کے لئے جس کے نبیؐ نے اس کو ہر ممکن ذریعہ سے علم حاصل کرنے کا حکم دیا ہو علم نہ مغربی ہے، نہ مشرقی، علمی انکشافات و تحقیقات ایک ایسے سلسلہ کی کڑی ہیں جس کی کوئی انتہا نہیں، اور جس میں تمام بنی نوع انسان برابر کے شریک ہیں، ہر عالم اور سائنٹسٹ ان ہی بنیادوں پر اپنی تحقیق کی بنیاد رکھتا ہے، جو اس کے پیشروؤں نے قائم کی تھیں، خواہ وہ اس کی قوم سے تعلق رکھتے ہوں یا کسی اور قوم سے، اسی طرح ایک انسان سے دوسرے انسان، ایک نسل سے دوسری نسل، ایک تہذیب سے دوسری تہذیب تک، تعمیر و اصلاح و ترقی کا کام برابر جاری رہتا ہے، اس لئے اگر کسی خاص زمانہ یا خاص تمدن میں یہ کام انجام پائیں تو یہ قطعاً نہیں کہا جاسکتا ہے کہ وہ اس زمانہ یا اس تہذیب کے ساتھ مخصوص ہیں، ہوسکتا ہے کہ کسی اور زمانہ میں کوئی دوسری قوم جو زیادہ باہمت اور حوصلہ مند ہو میدانِ علم میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے لیکن بہر حال سب اس کام میں برابر کے حصہ دار ہیں۔

ایک دور ایسا بھی آیا تھا جب مسلمانوں کی تہذیب و تمدن یورپ کے تہذیب و تمدن سے زیادہ شاندار تھی، اس نے یورپ کو بہت سی انقلابی قسم کی صنعتی و فنی ایجادات عطا کیں، اس سے بڑھ کر یہ کہ اس نے یورپ کو اس عملی طریقہ کے اصول و مبادی دیئے جس پر علم جدید اور تہذیب جدید کی بنیاد ہے لیکن اس کے باوجود جابر بن حیان کا

کیمسٹری کا علم عربی نہیں کہلایا، اسی طرح الجبرا اور علم مثلثات کو اسلامی علوم نہیں کہا گیا حالانکہ اول الذکر کا موجد خوارزمی ہے اور موخر الذکر کا بتانی، اور یہ دونوں ہی مسلمان تھے، ٹھیک اسی طرح نظریۂ کشش کو کوئی انگریزی علم نہیں کہہ سکتا، اگرچہ اس کا موجد انگریز تھا یہ بڑے بڑے علمی کام نوع انسانی کی مشترک میراث ہیں۔

اسی طرح اگر مسلمان (جیسا کہ ان کے اوپر واجب ہے) صنعتی علوم و فنون کے نئے ذرائع اپناتے ہیں تو وہ صرف ارتقاء و ترقی کی فطری خواہش اور جذبہ سے کرتے ہیں یا دوسروں کے تجربات اور معلومات سے فائدہ اٹھانے کی فطری خواہش اور جذبہ، لیکن اگر وہ (اور ان کو اس کی ضرورت بھی نہیں ہے) مغربی زندگی کی اشکال (FORMS) آداب، عادات (MANNERS) اور مغرب کے اجتماعی تصورات کو اپناتے ہیں تو اس سے ان کو ذرہ برابر بھی فائدہ نہ ہوگا، اس لئے کہ یورپ ان کو اس میدان میں جو دے سکے گا وہ اس سے بہتر نہیں ہوگا جو خود ان کی ثقافت اور ان کے دین نے ان کو عطا کیا ہے۔

اگر مسلمان ذرا ہمت بلند کریں اور حوصلہ سے کام لیں اور ترقی کو ایک ذریعہ اور وسیلہ کی حیثیت سے اپنائیں تو وہ اس طرح نہ صرف اپنی باطنی حریت کی حفاظت کر سکیں گے بلکہ شاید یورپ کے انسان کو زندگی کے گم شدہ لطف کا راز بھی بتا سکیں گے۔[1]

ممالک اسلامیہ میں اسلامی تمدن کی اہمیت

تمدن کی جڑیں، انسانی نفسیات اور قوم کے جذبات و احساسات کی گہرائیوں

---

[1] ROAD TO MECCA P. 347, 349 ترجمہ ماخوذ از "طوفان سے ساحل تک" صفحہ ۱۸۶-۱۸۹

تک اتری ہوئی ہوتی ہیں' اور کسی قوم کو اس کی مخصوص تہذیب و تمدن سے الگ کر دینا جو اس کے دین و شریعت کے سایہ میں پروان چڑھا ہے' اور مخصوص دینی ماحول میں اس کا نشو ونما ہوا ہے' اسے کارزار حیات سے الگ' اور عقیدہ و عبادت اور دینی رسوم تک محدود کر دینے اور اس کے حال کو اس کے ماضی سے کاٹ دینے کے مرادف ہے' اس کا قوموں اور انسانی معاشروں پر بڑا گہرا اثر پڑا ہے' اور بالآخر وہ معاشرے ان معاشروں میں ضم ہو گئے ہیں' جن کی تہذیب انھوں نے اپنائی تھی' اور اس طرح وہ آسانی کے ساتھ رفتہ رفتہ... اپنے بنیادی عقائد اور مسلکِ حیات سے بھی الگ ہو گئے ہیں' جس کو وہ دانتوں سے پکڑے ہوئے تھے۔

اسلامی شخصیت اور ملت مسلمہ کے وجود کے لئے مغربی تمدن کے خطرناک ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ زندگی کی سہولتوں سے استفادہ اور مغرب کی دریافت کردہ سائنس اور ٹکنالوجی' ایجادات و تفریح و سہولت کے وسائل کو مطلق حرام کہہ دیا جائے' اور یہ دروازہ بالکل بند کر دیا جائے' اسلام ہمیشہ سے وسیع ذہن کا مالک اور ہر صالح اور مفید شئی سے استفادہ کرنے کے سلسلہ میں فراخ دل اور کشادہ چشم رہا ہے' اور رہے گا' لیکن اس معاملہ میں مغربی تمدن کا مفہوم آلات و ایجادات اور زندگی کے مفید تجربات سے استفادہ سے زیادہ وسیع معنوں پر مشتمل ہے' اور وہ افکار و اقدار اور مفاہیم و مطالب بھی اس میں شامل ہیں' جن پر مغربی تہذیب کی بنیاد ہے' پوری زندگی کو مغربی رنگ اور تمدنی منصوبہ بندی کا تابع کرنا' اس طرزِ حیات کو اپنانا جو اسلامی معیارِ طہارت و نظافت اور اعتدال و میانہ روی کی روح سے بیگانہ ہے' آداب شریعت اور سنت نبوی پر عمل کی راہ میں بھی رکاوٹ بن جاتا ہے' اور اس اسلامی زندگی سے بھی

بہت دور کر دیتا ہے جس کا نمونہ رسولِ خداؐ، صحابہ کرامؓ اور ان کے صحیح تبعین نے دنیا کے سامنے پیش کیا، وہ امت پر ایک اجنبی رنگ چڑھا دیتا ہے، جس کے بعد وہ صرف اپنے ناموں یا اپنے ملّی و قومی لباسوں (جنھیں بعض عرب و مسلم اقوام ابھی تک اپنائے ہوئے ہیں) یا اس کی مسجدوں سے بلند ہونے والی اذانوں یا مختلف ملکوں میں کم و بیش تعداد میں مسجد جانے والوں سے پہچانی جاتی ہے، گویا اسے اسلام سے رسوم کا ایک باریک دھاگہ باندھے ہوئے ہے، جو خدا نخواستہ اگر ٹوٹا تو ہر چیز ٹوٹ کر بکھر جائے گی۔

میرا یقین ہے کہ بیک وقت موجودہ تمدنی سہولتوں، جدید آلات و ایجادات اور سائنسی ترقیات سے استفادہ اور اسلامی تمدن کے حسن و سادگی، حقیقت پسندی، طہارت و نظافت اور اسلام کے اخلاقی اصولوں اور معاشرتی تعلیمات کا کاربند رہنا ممکن اور قابلِ عمل ہے، مگر یہ اس وقت ممکن ہے، جب اسلامی حکومتوں اور معاشروں کو آزادانہ و مجتہدانہ فکر و نظر اور جرأتمندانہ منصوبہ بندی کی توفیق ملے، اور جب ان کے اندر فراست ایمانی، اصلیت پسندی، اسلامی تعلیمات و ثقافت اور شخصیت کی برتری پر ایمان ہو، یہ منصوبہ بندی اتنی جاذب نظر، دلفریب اور قابلِ قدر و لائق احترام ہو گی کہ ان اسلامی شہروں کا رخ بیرونی ممالک کے مفکر اور دانشور اس کثرت سے کریں گے جتنے آج تفریح کرنے والے بھی نہیں کرتے، اور تمدن کا یہ نقشِ جمیل، بہت سے مغربی ممالک کو کم سے کم اس مسئلہ پر سنجیدگی سے سوچنے اور اسلامی تمدن کی برتری کا اعتراف کرنے پر مجبور کرے گا، جیسا کہ اندلس کے اسلامی تمدن کے بارے میں دیکھنے میں آچکا ہے جس کا مغربی تہذیب اور اس کے ادب و فلسفہ پر گہرا اثر پڑا ہے۔

لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ مشرق و مغرب اور عرب و عجم کے کسی اسلامی ملک کو ابھی تک اس کی توفیق نہیں ہوئی، نہ ان میں سے کسی ایک کو اتنی جرأت ہوئی کہ وہ تجربہ کے طور پر ہی ایسا کر کے دیکھتا، نتیجہ یہ ہوا کہ یہ سب ممالک مغربی کتاب تمدن کا ایک ناقص اور غلط ایڈیشن اور ایک روکھی پھیکی تصویر بن کر رہ گئے ہیں، جو اہل مغرب کے لئے کوئی کشش نہیں رکھتی، جب وہ کبھی ان ممالک سے تفریحاً گذرتے ہیں تو یہی کہتے ہیں کہ "بضاعتنا ردت إلينا" (یہ ہماری ہی چیز ہے جو ہمیں مل رہی ہے۔)

تہذیبی لائحہ عمل، محنت و ذہانت، تخلیق و اجتہاد، اور جرأت و عزم کا نام ہے، وہ نقل و تقلید اور جزوی اصلاح و ترمیم کا نام نہیں، اسلام نے حلال و حرام کے حدود قائم کر کے ان کے توڑنے کی ممانعت کر دی ہے، اور پاک اور بے ضرر تفریح کے لئے (جو اسراف اور حق تلفی، فحش و گناہ سے خالی ہو) بڑی گنجائش دے رکھی ہے، وہ اس زندگی کو ناپسند کرتا ہے، جو شریف و بہادر مردوں کے شایان شان نہیں، اور یہی روح لباس و غذا، معاشرت و اجتماع، تفریح و لذت اندوزی کے اسلامی احکام میں کارفرما ہے، اجتماعی مصالح کی رعایت، مفاسد اور مضرتوں سے اجتناب، فوجی طاقت اور دفاع کی تیاری، اور علم و حکمت کے صالح، اور نافع پہلو کو اختیار کرنے کی وہ نہ صرف اجازت بلکہ ترغیب دیتا ہے، بشرطیکہ یہ چیزیں اسلامی قومیت و شخصیت کی قیمت دے کر نہ حاصل کی جائیں، اور ان سے امت میں احساس کہتری، بے اعتمادی، عاجلانہ و سطحی تقلید، دوسروں کی نقل کا مجنونانہ شوق اور ان کی زندگی پر رشک بے پایاں کے جذبات نہ پیدا ہوں۔

یہ ایسی تہذیب کے اصول و اساس ہیں، جن میں ریشم کی نرمی بھی ہے، اور

فولاد کی سختی بھی، نرمی حقیقی و فطری ضرورتوں اور جائز تقاضوں کی تکمیل اور حقائق کو تسلیم کرنے میں ہے، جو تخیل اور مبالغہ پر مبنی نہ ہوں، اور سختی عقیدہ و اخلاق کے حدود پر ثابت قدمی کے سلسلہ میں ہے، اسلامی تہذیب کھلے ذہن و ضمیر کی مالک ہے، وہ ان ترقی پذیر علوم و فنون اور انسانی تجربوں سے فائدہ اٹھانے میں جو کسی خطۂ زمین یا کسی دور تاریخ میں کئے گئے ہوں، بہت کشادہ قلب واقع ہوئی ہے، بشرطیکہ وہ اس کے بنیادی اصولوں اور مقاصد کے منافی اور دین و اخلاق کے لئے فتنہ کا سامان نہ بنیں۔

عالم اسلام کا سب سے بڑا خلا

عالم اسلام کا اس وقت سب سے بڑا خلا اس قائد اور حوصلہ مند انسان کا فقدان ہے جو مغربی تہذیب کا جرأت، اعتماد اور یقین کے ساتھ سامنا کرے اور اس تہذیب جدید کے مختلف سانچوں، مختلف مکاتب فکر اور راستوں کے درمیان ایک نیا راستہ پیدا کرے، ایسا راستہ جس میں وہ تقلید، نقل، غلو اور انتہا پسندی سے بالاتر نظر آئے اور ظاہری اشکال، مظاہر اور سطحی نقطۂ نظر سے بلند ہو، حقائق اور وسائل، قوت اور مغز کی طرف متوجہ ہو اور اس کے ظاہری خول میں نہ الجھے۔

عالم اسلام کا مرد کامل

ایسا مرد کامل اور عبقری (GENIUS) جو اپنے ملک اور اپنی قوم کے لئے ایک ایسی نئی شاہراہ کھولے جس میں ایک طرف وہ ایمان ہو جو محض نبوت کا فیض ہے، وہ دین ہو جو اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اس امت کو عطا کیا،

دوسری طرف وہ علم ہو جو کسی خاص ملک یا قوم یا زمانہ کے ساتھ مخصوص نہیں، وہ دین سے نیک خواہشات اور جذبات اخذ کرے جو انسانیت کی خدمت اور تہذیب کی تشکیل و تعمیر کے لئے سب سے بڑا ذخیرہ اور سب سے بڑی دولت ہے، وہ صحیح اور صالح مقاصد حاصل کرے جو صرف آسمانی مذہب اور صحیح دینی تربیت سے حاصل ہو سکتے ہیں، اس کے ساتھ مغربی تہذیب کے وہ پیدا کردہ وسائل اور آلات حاصل کرے جو اس کو طویل علمی سفر اور مسلسل اور سخت جد و جہد کے بعد حاصل ہوئے ہیں، لیکن ایمان اور ان نیک مقاصد کے فقدان کی وجہ سے ان سے صحیح فائدہ نہیں اٹھایا جا سکا بلکہ اس کو انسانیت کشی اور تہذیب دشمنی یا بہت حقیر مقاصد کے لئے استعمال کیا جاتا رہا ہے۔

وہ عالی دماغ، حوصلہ مند انسان جو مغربی تہذیب اور اس کے تمام نظریات انکشافات اور قوتوں کے ساتھ خام مال (RAW MATERIAL) کا سا معاملہ کرے اور اس سے ایک نئی اور طاقت ور تہذیب کی عمارت تعمیر کرے جو ایک طرف ایمان، اخلاق، تقویٰ، رحم دلی اور انصاف پر قائم ہو، دوسری طرف اس میں اس کی مخصوص ذہانت، قوتِ ایجاد اور جدتِ فکر جلوہ گر ہو، وہ مغربی تہذیب کو اس نظر سے نہ دیکھے کہ وہ تکمیل و ترقی کے آخری مراحل سے گزر چکی ہے اور اس پر آخری مہر لگ چکی ہے، اور اب اس میں کسی ترمیم واضافہ کی گنجائش نہیں ہے اور اس کو جوں کا توں اور اس کے سارے عیوب کے ساتھ قبول کرنے کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں ہے، بلکہ وہ اس پر علیحدہ علیحدہ اجزاء کی حیثیت سے نظر ڈالے جس چیز کو چاہے رد کرے اور جس چیز کو چاہے اختیار کرے، اور پھر اس سے زندگی کا ایک ایسا ڈھانچہ تیار کرے جو اس کے مقاصد، اس کے عقیدہ، اس کے مبادی اور اصول

اخلاق کے ساتھ ہم آہنگ ہو، اسلام نے اس کو زندگی کا جو ضابطہ، دنیا کا جو مخصوص نقطۂ نظر، بنی نوعِ انسان کے ساتھ معاملہ کرنے کے لئے جو خاص احکام، اور آخرت کے لئے مسلسل جد و جہد اور جہاد کا جو جذبہ عطا کیا ہے، اس پر مبنی ہو اور اس سے وہ زندگی وجود میں آئے جس کے متعلق قرآن نے شہادت دی ہے :۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى	جو شخص نیک عمل کرے گا مرد ہو یا عورت
وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً	اور وہ ایمان بھی رکھتا ہو تو ہم دنیا میں بھی
طَيِّبَةً ۚ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ	اس کی زندگی اچھی طرح بسر کرائیں گے اور
بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝	ان کو آخرت میں بھی ان کے بہترین اعمال
(النحل۔ ۹۷)	کا صلہ ضرور عطا فرمائیں گے۔

ایسا طریقِ حیات جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان اور اس عقیدہ پر مبنی ہو کہ وہ انسانیت کے لئے اسوۂ کامل، اس کے ابدی رہنما اور قائد، اور قیامت تک کے لئے قابلِ تقلید نمونہ اور محبوب آقا ہیں، ان کی لائی ہوئی شریعت زندگی کا دستور، قانون سازی کی بنیاد، اور وہ تنہا طریقِ زندگی ہے جس کے ذریعہ دنیا و آخرت کی کامیابی حاصل ہو سکتی ہے، اور اس کے علاوہ اللہ کو کوئی اور طریقِ زندگی قبول نہیں۔

وہ عالی دماغ اور حوصلہ مند انسان جو مغرب سے وہ علوم حاصل کرے جو اس کی قوم اور ملک کے لئے ضروری ہیں، جن کے اندر کوئی عملی افادیت ہے اور جن پر مغرب و مشرق کسی کی چھاپ نہیں، وہ محض تجربی اور عملی علوم (SCIENCES) کہے جا سکتے ہیں قرونِ مظلمہ اور دین سے بغاوت کے دور میں (جب یورپ اپنا دماغی توازن کھو چکا تھا، اور دینی حقائق پر ٹھنڈے دل سے غور کرنے کے قابل نہیں تھا) ان علوم و نظریات پر جو گرد

چڑھ گئی تھی اس کو وہ جھاڑ دے اور اس طرح ان کو صاف کر کے لے جس طرح خاک کے ڈھیر یا کیچڑ کے اندر سے کوئی ہیرا یا آبدار موتی حاصل کیا جاتا ہے، وہ مفید علوم کو الحاد، مذہب بیزاری اور ان غلط نتائج سے پاک اور آزاد کر کے حاصل کرے جو زبردستی ان کے ساتھ لگا دیئے گئے ہیں، وہ مغرب سے جن علوم و نظریات کو اخذ کرے ان میں ایمان کی روح پھونک دے اور ان کو دین کے گہرے رنگ میں غوطہ دے کر اپنا بنا لے اور ان سے عظیم اور انقلاب انگیز نتائج پیدا کرے جو انسانیت کے لئے زیادہ مفید اور بہتر ہوں اور ان نتائج سے کہیں زیادہ قیمتی ہوں جہاں اس کے مغربی استاد پہونچے تھے، اور جس کے آگے ان کے فکر و تخیل کی رسائی نہیں۔

وہ شخص، جو مغرب کو اپنا امام و رہنما اور خود کو اس کا مقلد اور شاگرد اور خوشہ چیں تسلیم نہ کرتا ہو بلکہ یہ سمجھے کہ وہ اس کا ایک رفیق سفر اور معاصر ہے، جو مخصوص حالات کی وجہ سے بعض مادی اور اقتصادی علوم میں اس سے سبقت لے گیا ہے، وہ اس کے ان تجربوں سے سبق لے لیکن نبوت نے جو روشنی اس کو عطا کی ہے اس کا اس میں اضافہ کرے اور یہ سمجھے کہ اگر اس کو مغرب سے بہت کچھ سیکھنے کی ضرورت ہے تو مغرب کو بھی اس سے بہت کچھ حاصل کرنے کی ضرورت ہے، بلکہ مغرب کو وہ جو دے سکتا ہے وہ اس سے کہیں افضل و بہتر ہے جو وہ خود مغرب سے لے سکتا ہے، وہ کوشش کرے کہ اپنی ذہانت اور مشرق و مغرب اور مادی و روحانی قوتوں کے اس حسین امتزاج سے ایک ایسی شاہراہ اور ایک ایسا مسلکِ زندگی پیدا کرے جس کا احترام اور اس کی تقلید کرنے پر مغرب بھی مجبور ہو اور مکاتب فکر اور تہذیبی دبستانوں میں ایک ایسے دبستان کا اضافہ کرے جو دنیا کے عظیم ترین مفکرین کو دعوتِ فکر و مطالعہ اور عظیم ترین قوموں کو دعوتِ عمل دے۔

یہ عالمِ اسلام یا کسی اسلامی ملک کے وہ عالی دماغ اور حوصلہ مند رہنما کا نمونہ ہے جو عالمِ اسلام میں (جہاں ہر طرح کے زعماء و قائدین کثرت کے ساتھ موجود ہیں) ابھی تک ناپید ہے، اور ایک حسین و دلکش خواب اور تخیل کی حیثیت رکھتا ہے، یہ وہ بلند قامت دیو پیکر ہستی ہے جس کے پہلو میں اگر عالمِ اسلام کے فرومایہ نقّال و مقلّد و غاشیہ بردار رہنما کھڑے کر دیئے جائیں تو نہایت حقیر انسان معلوم ہوں اور فکر و نظر، عزم و حوصلہ اور اپنی صلاحیتوں کے لحاظ سے بونے اور بالشتئے (PYGMIES) نظر آئیں، مشرق کے وہ زعماء و قائدین جو اس نصف صدی کے عرصہ میں سامنے آئے ہیں کوئی اس بلند معیار پر پورا نہیں اترتا اور کوئی اس ضرورت کو پورا نہیں کرتا جو عصرِ حاضر کی سب سے بڑی ضرورت بن گئی ہے، اقبالؔ نے صحیح کہا ہے کہ ؎

نہ مصطفےٰ، نہ رضا شاہ میں ہے اس کی نمود
کہ روحِ شرق بدن کی تلاش میں ہے ابھی

مسلم ممالک کا کردار اور تاریخ جدید کا سب سے بڑا کارنامہ

عصرِ جدید میں جبکہ مغربی تہذیب اپنے ارتقا کے آخری نقطہ پر پہونچ گئی ہے، اور مسلم ممالک اپنے مخصوص حالات اور تاریخ کی بنا پر اس میں مساویانہ حصہ نہیں لے سکتے اور اگر بالفرض ایسا ممکن ہو تو ان کے لئے اپنے عقیدہ، مسلکِ زندگی، مقاصد اور مخصوص نوعیت کی بنا پر ایسا کرنا ممکن اور جائز بھی نہیں یہ ان کی ملّی موت اور اجتماعی خودکشی کے مرادف ہے، اس حالت میں تقلید و پیروی اور انکار و سلبیت کے درمیان ایک محفوظ، بلند و باعزت راہ ہے، یہ نہ صرف ان ممالک کے منصب و مقام کے شایانِ شان ہے،

بلکہ یہ تاریخ جدید کا سب سے بڑا انقلاب انگیز اقدام اور وقت کا سب سے اہم اور مقدس کام ہے، یہ ہے خود تہذیبِ جدید کی رہنمائی، اس میں زندگی کی نئی روح پھونکنا، اس کو صالح مقاصد اور سفر کی صحیح منزل عطا کرنا، اس کو نبوت کی عطا کی ہوئی ایمان ومحبت کی دولت سے آشنا کرنا، اور اس کی اصلاح وتکمیل کی وہ خدمت جو صرف مسلم ممالک ہی انجام دے سکتے ہیں، اور جس کی اس عہد میں کوئی جرأت نہیں کر رہا ہے۔



حرفِ آخر

یہ بات کتنی ہی تلخ اور ناخوشگوار ہو، لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ موجودہ عالم اسلامی مجموعی طور پر خود شناسی، اور خود اعتمادی کی دولت سے محروم ہے، اس وسیع (اسلامی) دنیا میں جو ملک آزاد ہیں، (خواہ وہ صدیوں سے آزاد چلے آرہے ہوں یا انھوں نے ماضی قریب میں آزادی حاصل کی ہو) وہ بھی ذہنی اور علمی حیثیت سے مغرب کے اسی طرح سے غلام ہیں، جس طرح ایک ایسا پسماندہ ملک غلام ہوتا ہے جس نے غلامی ہی کے ماحول میں آنکھیں کھولیں، اور ہوش سنبھالا ہے، بعض اوقات ان ملکوں کے سربراہ سیاسی میدان میں قابل تعریف اور بعض اوقات خطرناک حد تک جرأت وہمت کی بات کرتے ہیں، اور بعض اوقات مہم جوئی، اور اپنے ملک کی بازی تک لگا دینے سے باز نہیں آتے، لیکن فکری، تہذیبی، اور تعلیمی میدان میں ان سے اتنی بھی خود اعتمادی، انتخاب کی آزادی، اور تنقیدی صلاحیت کا اظہار نہیں ہوتا، جتنی کہ کسی ایک عاقل بالغ انسان سے توقع کی جاتی ہے، حالانکہ فلسفۂ تاریخ کا یہ ایک مسلّمہ اصول ہے کہ فکری، تہذیبی اور تعلیمی غلامی، سیاسی غلامی سے زیادہ خطرناک، عمیق اور مستحکم ہوتی ہے، اور اس کی موجودگی میں ایک حقیقت پسند،

فاتح قوم کے نزدیک سیاسی غلامی کی ضرورت باقی نہیں رہتی، اس بیسویں صدی عیسوی کی آخری دہائیوں میں جب دنیا دو عظیم عالمگیر جنگوں سے گذر چکی ہے، اور تیسری جہاں سوز جنگ کے بادل امنڈ رہے ہیں، اور کسی ملک کا کسی ملک کو غلام بنانا اور اس کی مرضی کے خلاف اس پر قبضہ رکھنا ایک ناقابل فہم، اور ناممکن العمل سی بات سمجھی جانے لگی ہو[1]، دنیا کی بڑی طاقتیں اب روز بروز سیاسی اقتدار کے بجائے ذہنی و تہذیبی اقتدار، اور یکسانی و ہم رنگی پر قانع ہوتی چلی جائیں گی۔

مغرب کے اس ذہنی و تہذیبی اقتدار، اور اصولی و نظریاتی وحدت کو دنیا میں اگر کوئی طاقت و دعوت چیلنج کر سکتی تھی، اور اس کی راہ میں رکاوٹ بن سکتی تھی، تو صرف عالم اسلام کی جداگانہ شخصیت، اس کی دینی و اخلاقی دعوت، اور اس کا فلسفۂ زندگی تھا، لیکن ایک طرف ان تاریخی عوامل کی بناء پر جن کی ہم نے کسی قدر تفصیل کے ساتھ اپنی کتاب "انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر" میں تشریح کی ہے، عالم اسلام مغرب کی ابھرتی اور پھیلتی ہوئی طاقت سے آنکھیں ملانے کے قابل نہیں رہا تھا، اور جو طبقہ اس دورِ انقلاب میں اس کی قسمت کا مالک بنا ہوا تھا، وہ جیسا کہ ہم نے ایک پچھلے باب میں بیان کیا ہے، تمام تر مغرب کا نہ صرف خوشہ چیں بلکہ دایۂ مغرب کا شیر خوار بچہ تھا جس کا (ذہنی) گوشت پوست اسی کے دودھ اور اسی کے خونِ جگر سے تیار ہوا تھا، دوسری طرف ان اسلامی ملکوں کے عوام و جمہور میں ایمان و عقیدہ کا جو اثر، اخلاقی رکھ رکھاؤ، معاشرتی روایات کا احترام اور نفس کی ترغیبات کا مقابلہ کرنے کی جو بچی کھچی طاقت تھی (جس سے مغرب عرصہ ہوا محروم ہو چکا ہے) اس کو مغرب نے

---

[1] لیکن افغانستان پر روس کے فوجی تسلط نے اس کلیہ کو مجروح و مشکوک بنا دیا ہے۔

ان مختلف ذرائع سے، جن میں سے بعض بظاہر نہایت معصوم اور فیاضانہ ہیں اور بعض نہایت مسموم اور مجرمانہ ہیں ڈائنامیٹ کرنا شروع کر دیا ہے، تعلیمی میدان میں یونیسکو کی اعانت و سرپرستی، اور ماہرین فن کی منصوبہ بندی کے ذریعہ کبھی مغربی اساتذہ اور ماہرین تعلیم کے ذریعہ کبھی اس تشکیکی انتشار پسند اور ہیجان انگیز لٹریچر کے ذریعہ جو ایک سیلاب کی طرح عالم اسلام میں پھیلتا جا رہا ہے، کبھی معیار زندگی بلند کرنے، اور زندگی کو خوشگوار اور پر مسرت بنانے کے بہانے ٹیلی ویژن کو گھر گھر عام کرنے کے ذریعہ اس طاقت کو برابر مفلوج کیا جا رہا ہے، کبھی ان پسماندہ ملکوں کو جو فیاضانہ امدادیں دی جاتی ہیں، ان کی شرائط کے طور پر ان ملکوں کی حکومتوں سے ایسی تبدیلیوں اور اصلاحات کا مطالبہ کیا جاتا ہے، جو ان مسلم عوام کا مزاج، اور ان کا نظام معاشرت بدل دینے کے لئے ایک کارگر حربہ ثابت ہوتی ہیں، غرض مغرب نے دور رہتے ہوئے بھی ان ملکوں کے گرد ایسا گھیرا ڈال دیا ہے، اور ایسے حالات پیدا کر دیئے ہیں کہ غلامی کے کہنہ اور فرسودہ طریقوں سے کہیں زیادہ یہ آزاد ملک مغربی طاقتوں کے پنجۂ اقتدار میں گرفتار ہیں، اور اکبر مرحوم کے اس پرانے شعر کی ایک ایسی وسیع اور پر از حقیقت تشریح سامنے آ رہی ہے کہ شاید خود شاعر کے وہم و گمان میں نہ تھی ؎

کس رہے ہیں اپنے منقاروں سے حلقہ جال کا
طائروں پر سحر ہے صیاد کے اقبال کا

ان تبدیلیوں یا "اصلاحات" کے نفاذ میں ان ملکوں کے سربراہ جن میں سے بعض اسلام کا دم بھی بھرتے ہیں، بعض ایک عالمگیر اسلامی طاقت، اور اسلامی بلاک

کی باتیں بھی کرتے ہیں' اس طرح سرگرم اور مستعد نظر آتے ہیں' جس سے زیادہ خود مغرب کے تجدد پسند نہیں ہو سکتے' جس طرح بے چون وچرا امریکہ اور روس کے اصلاحی اور تعلیمی منصوبوں کو قبول کیا جا رہا ہے' جس طرح ان کے ماہرین فن کو ان ملکوں کے ذہن و مزاج کی تبدیلی کا نقشہ بنانے کی اجازت دی جا رہی ہے' جس جوش وخروش اور عزم وفیصلہ کے ساتھ ٹیلی ویژن کو (بغیر کسی بنیادی تبدیلی و اصلاح کے) گھر گھر پہونچانے کی کوشش کی جا رہی ہے' اور مختلف ذرائع سے اس کو زیادہ سے زیادہ قابل حصول بنایا جا رہا ہے' جس طرح مستشرقین کے بعض سعادت مند شاگردوں کو اسلامی معاشرہ میں تشکیک و انتشار پیدا کرنے کے وسائل اور مواقع فراہم کئے جا رہے ہیں' جس طرح مختلف ذرائع سے تفریح و تعیش کا رجحان پیدا کیا جا رہا ہے' عورتوں کی غیر محدود آزادی و بے پردگی' مخلوط تعلیم' فلم سازی کی صنعت کی ہمت افزائی اور سرپرستی کی جا رہی ہے' اس سے شبہ ہوتا ہے کہ یہ سربراہ ان مغربی طاقتوں کے (دانستہ یا نادانستہ) آلۂ کار' اور ان کے تخریبی مقاصد میں ہم نوا تو نہیں بن گئے ہیں' اور کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ وہ ان عوام کو اس دینی غیرت' اخلاقی شعور' خیر و شر کی تمیز' اور حیا و بے حیائی کے مفہوم ہی سے ناآشنا بنا دینا چاہتے ہیں' جو بعض اوقات ان کی انفرادی بے راہ روی' اور تجدد و مغرب پرستی کی راہ میں رکاوٹ بنتا رہتا ہے اور جو کسی وقت بھی ایک دینی انقلاب' اور نشأۃ ثانیہ بن کر ان کے اقتدار کے لئے خطرہ بن سکتا ہے' یہ صاف نظر آ رہا ہے کہ اگر تبدیلی یا "اصلاحات" کا یہ عمل چند برس اور جاری رہا' اور اخلاقی تخریب و انتشار کے ان وسائل کو کچھ عرصہ آزادی کے ساتھ اپنا کام کرنے کا موقع ملا' تو ان ملکوں کی وہ نسل جس میں نئے اثرات قبول کرنے کی پوری صلاحیت ہے اتنی متأثر ہو جائیگی کہ

وہ اس تجدد و مغربیت کی راہ میں کوئی قابل ذکر مزاحمت نہ کرسکے گی، جہاں تک اس نئی نسل کا تعلق ہے، جو اس ماحول میں پروان چڑھے گی تو اس کے یہاں کسی مخالفت یا اختلاف رائے کا کوئی سوال ہی باقی نہیں رہے گا، اس کا بھی قوی خطرہ ہے (اور اس کے آثار ظاہر ہونے شروع ہو گئے ہیں) کہ ان ممالک کا ایک بڑا طبقہ، بالخصوص مرفّہ الحال اور با اختیار طبقہ اس اخلاقی جذام میں مبتلا ہو جائے گا جس کا مغرب پوری طرح شکار ہو چکا ہے' اور پھر شاید پوری دنیا میں کوئی ایسا صحت مند معاشرہ ہی باقی نہیں رہے گا جس پر دنیا کی دوبارہ روحانی اور اخلاقی تطہیر کے کام میں اعتماد کیا جا سکے۔

جہاں تک مغرب کا تعلق ہے' وہ عالم اسلام کے بارے میں کبھی مخلص اور نیک نیت نہیں ہو سکتا، یہ اس پچھلی تاریخ کا بھی تقاضا ہے جس پر صلیبی جنگوں کے گھنے سائے پھیلے ہوئے ہیں' اور سلطنت عثمانیہ' اور مغربی ممالک کی طویل اور خوں ریز آویزش کی گہری چھاپ پڑی ہوئی ہے' یہ حقیقت پسندی' اور عقل عملی کا بھی تقاضا ہے کہ صرف عالم اسلام ہی میں مغرب کے عالمگیر اقتدار کو چیلنج کرنے' اور ایک ایسا نیا بلاک بننے کی صلاحیت پائی جاتی ہے جس کی بنیاد جداگانہ فلسفۂ زندگی' اور عالمگیر دعوت پر ہو' یہ ان قدرتی وسائل اور ذخائر کی قدر و قیمت کے احساس کا بھی نتیجہ ہے، جو عالم اسلام کے مختلف گوشوں میں بڑی افراط، اور فراوانی کے ساتھ پائے جاتے ہیں' اور جو مغرب کے صنعتی و تجارتی' نیز سیاسی اقتدار کے لئے بڑی اہمیت اور بعض اوقات فیصلہ کن حیثیت رکھتے ہیں' اور آخر میں یہ انسانی فطرت کی ایک کمزوری کا تقاضا بھی ہے کہ اکثر انسان جب ایک لاعلاج مرض میں مبتلا ہوتا ہے تو اس کو اس سے تسکین ہوتی ہے کہ دوسرے بھی اس کے شریک حال ہیں' اور تندرست و بیمار کے درمیان کوئی فرق باقی نہیں ہے' انسانی فطرت

کی اس کمزوری سے وہی لوگ محفوظ رہتے ہیں یا اس پر غالب آجاتے ہیں، جن کے اندر پیغمبروں کی تعلیم کے اثر سے سچی خدا ترسی، اور صحیح انسانیت دوستی پیدا ہو جاتی ہے اور بدقسمتی سے مغرب صدیوں سے اس دولت سے محروم ہو چکا ہے، مغربی اقتدار اور فتوحات کی تاریخ صاف بتاتی ہے کہ جن ملکوں کو اس کے زیر سایہ آنے کا موقعہ ملا، ان کو وہ اخلاقی چھوت ضرور لگ گیا، جو مغرب کے نقیبوں کے ساتھ ساتھ چلتا تھا، اور جیسا کہ بعض جری اور منصف مزاج مغربی مصنفین و ناقدین کا بیان ہے' مغرب کی سامراجی طاقتوں نے مشرقی ممالک میں اخلاقی انتشار پھیلانے اور تشکیک پیدا کرنے کی منظم کوششیں کیں، مسیحیت کا حلقہ بگوش مغرب مسیحیت کے بارے میں خواہ کتنا ہی متشکک وارتیابی (AGNOSTIC) واقع ہوا ہو، مسیحی عقائد کے بارے میں اس کی روشن خیالی و وسیع النظری خواہ الحاد و زندقہ کے حد تک پہونچی ہوئی ہو، لیکن مسلم اقوام اور عالم اسلام کے معاملہ میں وہ کٹر مسیحی واقع ہوا ہے' وہ اس کے معاملہ میں اپنے جنم دشمن اور خون کے پیاسے یہودیوں تک سے مصالحت کر سکتا ہے' اور ان کو مسلمانوں پر کھلی ترجیح دے سکتا ہے' اس مذہبی تعصب کے علاوہ جو اس کی گھٹی میں پڑا ہوا ہے' اور جو تقریباً اس کا مزاج بن چکا ہے' اس کو اپنا مفاد بہر حال ہر چیز سے عزیز ہے' یہ بارہا کا تجربہ ہے کہ کسی اسلامی طاقت کی جب کسی غیر اسلامی طاقت سے ٹکر ہوئی تو اس نے ہمیشہ غیر اسلامی طاقت کا کھل کر ساتھ دیا، یا اس کی در پردہ مدد کی، جون ۶۷ء کے عرب و یہود تصادم نے اس بات کو روز روشن کی طرح ثابت کر دیا کہ مسلمانوں کی کسی ملت یا جماعت کو کسی مغربی یا مشرقی بلاک سے کسی مخلصانہ مدد اور مکمل رفاقت کی امید نہیں رکھنی چاہیئے، اس کو ہر اقدام اور فیصلہ کے وقت خدا کے بعد اپنے ہی دست و بازو، اور اپنے ہی وسائل پر

اعتماد کرنا چاہئے۔

جہاں تک اسلامی ملکوں کے سربراہوں' اور رہنماؤں کا تعلق ہے' ان کو سمجھنا چاہئے کہ اس ادھا دھند تجدد و مغربیت' اور تشکیک و انتشار سے خواہ وقتی طور پر ان کو اور ان کے جانشینوں کو فائدہ پہونچے مجموعی طور پر ملت کو ایسا نقصان پہونچے گا، اور اس کی جڑیں اس طرح ہل جائیں گی کہ صدیوں تک اس کی تلافی نہ ہو سکے گی' ان قوموں میں اپنی ساری کمزوریوں اور خرابیوں کے باوجود وہ طاقتور ایمانی جذبہ' اللہ کے نام پر ایثار و قربانی کی صلاحیت' اطاعت اور انقیاد کا ولولہ اور خلوص و محبت کی گرم جوشی پائی جاتی ہے' جن سے تقریباً دنیا کی تمام مادہ پرست قومیں محروم ہو چکی ہیں' اسلامی ملکوں کے یہ عوام اپنی قابل افسوس جہالت اور پسماندگی کے باوجود وہ بہترین مواد خام ہیں جن سے بہترین انسانی نمونے اور موڈل تیار کئے جا سکتے ہیں' ان کی سب سے بڑی طاقت' ان کا ایمان و خلوص، اور ان کی سادگی و گرم جوشی ہے' اس طاقت نے بارہا محیر العقول کارنامے انجام دیئے ہیں' اور بعض اوقات ناممکن کو ممکن بنا دیا ہے' اور جب کبھی ان ملکوں پر کوئی نازک وقت آیا ہے' تو مسلم عوام کا یہی ایمانی جذبہ اور خلوص و سادگی کام آئی ہے، خالص حقیقت پسندی' اور واقعیت کی بنیاد پر بھی اس طاقت کی قدر کرنی چاہیئے، اور اس کو اپنے ملکوں کی حفاظت و استحکام، اور دنیا میں کوئی بڑا رول ادا کرنے کے لئے اپنا سب سے بڑا سہارا اور ذخیرہ سمجھنا چاہیئے لیکن اس تجدد و مغربیت کے اثر سے ان عوام کی اس طاقت کو وہ گھن لگتا جا رہا ہے' اور ان کے اندر ایک ایسا اخلاقی کینسر پیدا ہو رہا ہے' جو ناقابل علاج ہے۔

مغرب کے ناقابل انکار علمی و صنعتی تفوق کو سامنے رکھ کر جس سے آنکھیں بند کر لینا نہ عقل کا تقاضا ہے' نہ مذہب کی تعلیم' اور نہ عملاً ممکن' عالم اسلام کے سامنے صرف

دو راستے رہ جاتے ہیں، ایک تو یہ کہ اس سے مسحور ہو کر اس کے پورے فلسفۂ زندگی، اس کے تصورِ کائنات، اس کے مابعد الطبیعاتی عقائد و تصورات، اس کے عمرانی و اجتماعی نظریات، اس کے اخلاقی نقطۂ نظر، اور اس کے مسلکِ زندگی کو جوں کا توں قبول کر لیا جائے اور اپنی ہستی کو اس کے سانچے میں یکسر ڈھال دینے کی کوشش کی جائے، اس حقیقت سے قطع نظر کہ یہ ایک مکمل اور ہمہ گیر ارتداد اور روحانی و ذہنی خودکشی کے مرادف ہو گا، اور اس انسانیت کے ساتھ غدّاری اور بے وفائی جس کی آخری آس نبی خاتم کی اسی امت سے لگی ہوئی تھی، ایک ایسی غیر ضروری محنت اور سعی لاحاصل ہے جس کا نتیجہ طویل و خوں ریز ذہنی کشمکش، روحانی بے چینی، انسانی طاقتوں کے ضیاع، اور اضاعتِ وقت کے سوا کچھ نہیں، یہ ایک ایسی بنی بنائی مستحکم عمارت کی تخریب ہے جس کے ملبہ پر دوسری عمارت تعمیر کرنے کے لئے نہ مواد خام موجود ہے، نہ تعمیری صلاحیتیں، نہ آب و ہوا اور ماحول سے مناسبت، نہ ماضی سے ارتباط، عالم اسلام کے جن جن گوشوں، اور جن اسلامی ملکوں میں یہ کوشش کی گئی، ناکام رہی، اور جب بھی اس مصنوعی اور غیر طبعی اقتدار کی گرفت ڈھیلی ہوئی، اور عوام کو اپنی پسند اور ناپسند کے اظہار کا موقعہ ملا، انھوں نے فوراً اس جھول کو اتار پھینکا جو نہ ان کے جسم پر قطع ہوئی تھی اور نہ ان کے مزاج کے مطابق تھی آج ترکی میں یہی نظر آرہا ہے، اور مصر و شام میں بھی عنقریب یہی پیش آنے والا ہے۔

دوسرا راستہ یہ ہے کہ مغرب سے علم و صنعت، ٹکنالوجی اور سائنس اور ان علوم و تحقیقات میں جن کا تعلق تجربہ، حقائق و واقعات، اور انسانی محنت و کاوش سے ہے فراخ دلی کے ساتھ استفادہ کیا جائے، پھر ان کو ان مقاصد کے لئے اپنی خداداد ذہانت اور اجتہاد کے ساتھ ان اعلیٰ مقاصد کا تابع اور خادم بنایا جائے، جو آخری نبوت، اور آخری صحیفہ نے ان کو عطا کئے

اور جن کی وجہ سے ان کو خیر امت اور آخری امت کا لقب ملا ہے، وسائل اور مقاصد کا یہ خوشگوار امتزاج جس سے سردست مغرب بھی محروم ہے اور مشرق بھی کہ مغرب تنہا قاہر وسائل کا سرمایہ دار ہے، اور صالح مقاصد میں محض تہی دامن اور مشرق (اسلامی) صالح مقاصد کا واحد اجارہ دار ہے اور مؤثر وسائل سے یکسر محروم، مغرب کر سب کچھ سکتا ہے لیکن کرنا نہیں چاہتا، اور صحیح الفاظ میں کرنا نہیں جانتا، اسلامی مشرق کرنا سب کچھ چاہتا ہے، لیکن کر کچھ نہیں سکتا، یہ صحت مند و صالح امتزاج دنیا کی قسمت بدل سکتا ہے، اور اس کو خودکشی و خودسوزی کے راستہ سے ہٹا کر فلاح دارین، اور سعادت ابدی کے راستہ پر ڈال سکتا ہے، یہ ایسا کارنامہ ہوگا جو تاریخ کے دھارے اور دنیا کی قسمت کو بدل کر رکھ دے گا، یہ کارنامہ وہی امت انجام دے سکتی ہے، جو آخری پیغمبر کی جانشین، اور اس کی تعلیمات کی حامل و امین ہے اس بناء پر عالم اسلام کا حقیقی نعرہ جس سے اس کے دشت و جبل گونجنے چاہئیں، یہ ہے کہ ؎

عالم ہمہ ویرانہ ز چنگیزی افرنگ
معمار حرم باز بہ تعمیر جہاں خیز

مشرق کے ایک باہمت اور حوصلہ مند ملک جاپان نے اس اقدام کا ایک نہایت محدود، اور اسلامی نقطۂ نظر سے بہت پست معیار کا تجربہ کیا، اس نے مغرب سے علم و صنعت میں ایسا استفادہ کیا کہ استاد و شاگرد میں فرق کرنا مشکل ہوگیا، اسی کے ساتھ اس نے اپنے معتقدات، اور اپنے تہذیبی خصائص و روایات قائم رکھے، لیکن بدقسمتی سے اس کے مذہبی معتقدات اور اس کی تہذیب نہ زمانۂ حال سے کوئی مطابقت رکھتی ہے، نہ اس کے اندر افادیت اور انسانی خدمت کا کوئی پہلو ہے، نہ اس میں عالمگیر پیام بننے کی صلاحیت ہے یہ چند کہنہ اور فرسودہ معتقدات و روایات کا ایک مجموعہ ہے جس کو جدید جاپان اپنے سینہ سے لگائے

ہوئے ہے، اور یہ اس کی قوت ارادی، اور اپنے ماضی سے وابستگی کا کرشمہ ہے کہ اس نے
اس کو ابھی تک ترک نہیں کیا ہے لیکن اسلامی ممالک کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے،
ان کے پاس ایسا دین، ایسی شریعت اور ایسا قانون ہے جس کے لئے قدیم و جدید کی اصطلاح
بے معنی ہے، ایسی تہذیب جس کی اساس حقائق ابدی پر ہے، یہ ایک سدا بہار درخت ہے،
جو کسی وقت بھی نمو کی طاقت اور برگ و بار لانے کی صلاحیت سے محروم نہیں ہوتا، اس بناء
پر ان ممالک کے لئے جدید علم و صنعت، اور اپنے ابدی عقائد و حقائق کے درمیان اتحاد و
تعاون پیدا کرنے میں قطعاً کوئی زحمت پیش نہیں آسکتی، اور اس کے نتائج اس سے
کہیں زیادہ انقلاب انگیز، اور عالمگیر اثرات رکھنے والے نکل سکتے ہیں، جتنے کہ جاپان کے
اس تجربہ سے برآمد ہوئے، جاپان اور ہر روایت پرست ملک میں یہ کوشش شیشہ و آہن، اور
پنبہ و آتش کی باہم آمیزی کی کوشش کے مرادف ہے لیکن ایک مسلمان کے نزدیک اس میں
کوئی تضاد و تناقض نہیں ہے، اس کے نزدیک دین صحیح اور علم صحیح کا ٹکراؤ ممکن نہیں، اور
اس کے نزدیک حکمت مومن کا گم شدہ مال ہے، اور وہی اس کا حقیقی مالک ہے، اس کے
نزدیک وسائل کے خیر و شر ہونے کا فیصلہ اس پر منحصر ہے کہ وہ کن مقاصد کے ماتحت
استعمال ہوتے ہیں، اس کے نزدیک ہر طاقت، ہر تحقیق، ہر علم، ہر مؤثر ذریعہ اسی لئے ہے کہ
وہ خدا کے دین کے لئے استعمال ہو، اور مخلوق کے فائدے کے کام آئے، اس کا فرض
ہے کہ وہ اس کو غلط محل سے نکال کر صحیح محل میں استعمال کرے اور اس کو تخریب کے
بجائے تعمیر کا ذریعہ بنائے لیکن اس کام کے لئے وہ ذہانت "جرأت اندیشہ" اور وہ ایمان
و خلوص درکار ہے جو ہر تقلیدی رجحان، ہر چلتے ہوئے نعرے اور فیشن، اور ہر شخصی و جماعتی
مفاد کا مقابلہ کر سکے جس کے خاطر ہمارے اسلامی ملکوں کے سربراہ اس سب

ایثار و قربانی پر آمادہ ہوں جو اس کے لئے مطلوب ہے' اور جس کے نتیجہ یا انعام کے طور پر اولاً ان کو اپنے ملکوں میں محبوبیت کا وہ مقام حاصل ہوگا، جو اور کسی ذریعہ سے ان کو حاصل نہیں ہو سکتا، پھر ان کو اور ان کے ذریعہ ان کے ملکوں کو ہدایت و امامت کا وہ منصب رفیع میسر آئے گا، جس کا وہ ابھی خواب بھی نہیں دیکھ سکتے، مغربی تہذیب کو پورے طور پر گھن لگ چکا ہے' وہ اب محض اپنی صلاحیت' اور زندگی کے استحقاق کی بناء پر نہیں جی رہی ہے' بلکہ اس لئے کہ بدقسمتی سے کوئی دوسری تہذیب اس کی جگہ لینے کے لئے تیار نہیں' اس وقت جتنی تہذیبیں باقی دنیا میں ہیں' یا مغربی تہذیب کی لکیر کی فقیر' اور اس کی ایک روکھی پھیکی تصویر ہیں' یا اتنی کمزور اور شکست خوردہ ہیں کہ اس سے آنکھیں نہیں ملا سکتیں' اب اگر اسلامی ممالک' اور عالم اسلام مجموعی طور پر اس خلا کو پر کرنے کی صلاحیت پیدا کر سکے جو مغربی تہذیب کے خاتمہ سے عالم انسانی میں پیدا ہوگا تو اس کو دنیا کی امامت کا دوبارہ منصب تفویض کیا جا سکتا ہے' جو سنۃ اللہ کے مطابق ایک جری و قوی اور تازہ دم ملت یا قیادت کے سپرد کیا جاتا رہا ہے' اب ان قائدین کو یہ فیصلہ کرنا چاہئے کہ کیا مغرب کی دائمی غاشیہ برداری اور کشکول گدائی مناسب ہے' یا دنیا کی رہنمائی کا منصب عالی، اور عالم انسانی کی ہدایت کی مسند رفیع جس سے (نبوت کے بعد) بڑھ کر کوئی سرفرازی اور سربلندی نہیں' کیا اس کے لئے ظاہری نام و نمود، عہدہ و منصب لذت و راحت' اور مادی و جسمانی ترغیبات کی قربانی کوئی حقیقت رکھتی ہے؟ اگر اس کے لئے سو جانیں بھی قربان کی جائیں تو درحقیقت گھاٹے کا سودا، اور زیان و نقصان کا معاملہ نہیں ؎

اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں
اک جان کا زیاں ہے سو ایسا زیاں نہیں

اب دیکھنا یہ ہے کہ کون سا اسلامی ملک اس کارِ عظیم کی ہمت کرتا ہے جس سے زیادہ انقلاب انگیز، عہد آفریں، اور حیات بخش کوئی کام اس دور میں نہیں ہو سکتا اور جس کے سامنے یورپ کی نشأۃ ثانیہ کی تحریک (RENAISSANCE) انقلاب فرانس، اور روس کا فلسفۂ اشتمالیت اور مارکسی دعوت ذکر کرنے کے قابل بھی نہیں، اس میں ذہانت وجرأت کا جو عنصر اور حیات آفرینی وانقلاب انگیزی کی جو صلاحیت مضمر ہے، اور اس سے نہ صرف ان ممالک کو جن میں یہ تجربہ کیا جائے گا، بلکہ پورے عالم انسانی کو فکر وعمل کا جو نیا میدان ہاتھ آئے گا، اور راستی وسلامتی کی جو راہ ملے گی، اس کو سامنے رکھتے ہوئے وہ پچھلے انقلابات جن کا ہم نے نام لیا ہے، ایک جرأت رندانہ، اور ایک حرکت طفلانہ سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتے، یہ کارِ عظیم صرف وہی اقوام وملل، اور وہی جماعتیں وافراد انجام دے سکتے ہیں، جو ملت ابراہیمی کے حلقہ بگوش ہیں، اور جو تکمیل دین، اور ختم نبوت کے انعام ومژدہ سے سرفراز ہو چکے ہیں آج عالم اسلام کے تمام قائدین کے لئے وہی "سرود ازلی" ہے جس سے قرن اول کے مسلمانوں کے کان آشنا ہوئے۔

وَجَاهِدُوا فِي اللَّهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ط	اور خدا (کی راہ) میں جہاد کرو جیسا جہاد کرنے
هُوَ اجْتَبٰكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي	کا حق ہے، اس نے تم کو برگزیدہ کیا ہے اور
الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ط مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ	تم پر دین (کی کسی بات) میں تنگی نہیں کی
هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ۙ مِنْ قَبْلُ	تمہارے باپ ابراہیم کا دین (پسند کیا) اسی نے
وَفِيْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا	پہلے (یعنی پہلی کتابوں میں) تمہارا نام مسلمان
عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ۚ	رکھا تھا اور اس کتاب میں بھی (وہی نام رکھا
فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ	ہے تو جہاد کرو) تاکہ پیغمبر تمہارے بارے میں شاہد

وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ ؕ هُوَ مَوْلٰىكُمْ ۚ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ ۝ (الحج - ۷۸)

ہوں اور تم لوگوں کے مقابلہ میں شاہد ہو اور نماز پڑھو اور زکوٰۃ دو اور خدا (کے دین کی رسی) کو پکڑے رہو، وہی تمہارا دوست ہے اور خوب دوست اور خوب مددگار ہے۔

INDEX

اشاریہ

(انڈکس: "مسلم ممالک میں اسلامیت و مغربیت کی کشمکش")

مرتبہ

محمد غیاث الدین ندوی

شخصیات

م

اقوام وقبائل۔ طبقات اور ملتیں

کتابیات

اخبارات ورسائل

مقامات

متفرقات

جامعات اور درس گاہیں:

اکیڈمیاں، کتب خانے، نشریاتی ادارے:

تحریکات ونظریات:

کانفرنسیں، سوسائٹیاں، سیاسی انجمنیں اور ادارے:

روایات، معاشرے اور تہذیبیں:

زبان

علوم

معابد

سلطنتیں اور مشہور عہد و اقتدار

جنگ و معرکے اور حوادث:

دیگر متفرقات:

انسانی دنیا پر مسلمانوں کے
عروج وزوال کا اثر

مولانا ابوالحسن علی ندوی مدظلہٗ کی وہ شہرۂ آفاق کتاب

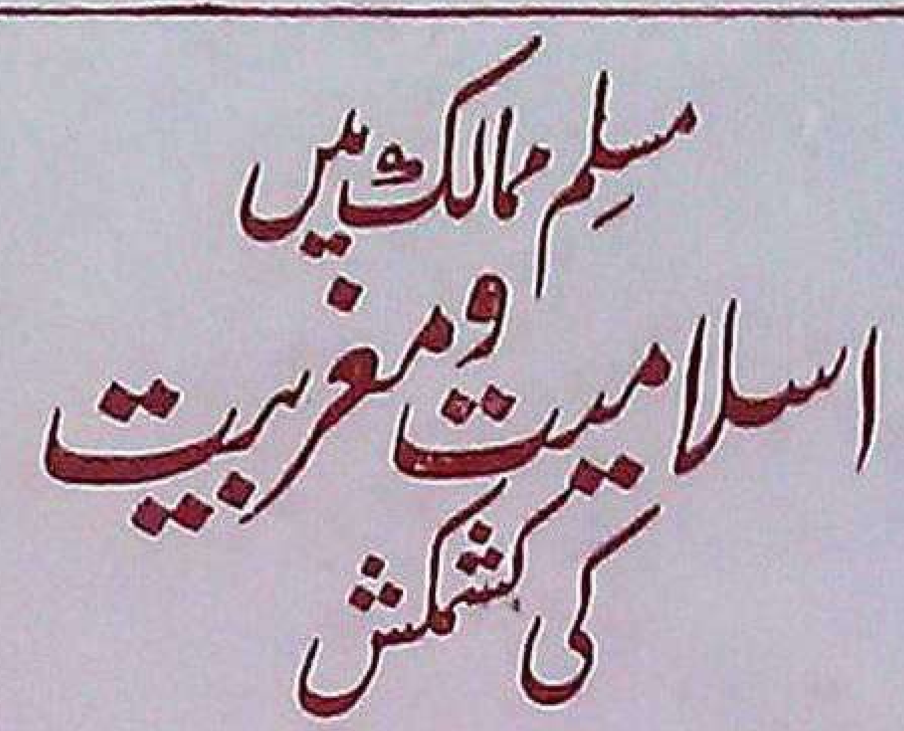
جو اس وقت دنیا کی چھ زبانوں (عربی، انگریزی، فرنچ، اردو، فارسی، ترکی) میں پڑھی جارہی ہے، اور جس کے متعلق مشہور مستشرق پروفیسر سارجنٹ (کیمبرج یونیورسٹی) کو کہنا پڑا کہ "اگر برطانیہ میں کسی کتاب کی درآمد پر پابندی لگانے کا رواج ہوتا تو میری سفارش ہوتی کہ اس کتاب کے داخلہ پر پابندی عائد کی جائے اس لئے کہ اس کتاب میں صرف مغربی تہذیب کی مذمت کی گئی ہے"۔

جس کو پڑھ کر مغربی دنیا کے نامور فاضل لندن یونیورسٹی میں میڈل ایسٹ سکشن کے چیرمین ڈاکٹر بکنگھم نے ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا کہ "اس صدی میں مسلمانوں کی نشأۃ ثانیہ کی جو کوشش بہتر سے بہتر طریقہ پر کی گئی ہے، یہ اس کا نمونہ اور تاریخی دستاویز ہے"۔

جس کو پڑھ کر عالم اسلام کے نامور مفکر اور مشہور صاحب قلم سید قطب شہیدؒ نے ان الفاظ میں داد دی کہ "اس موضوع پر تمام قدیم وجدید لٹریچر میں چند بہترین کتابیں جو میری نظر سے گزری ہیں ان میں یہ کتاب خاص مقام رکھتی ہے، یہ کتاب تاریخ نویسی کا ایک کامیاب نمونہ ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مسلمان کو یورپ کے اسلوب نگارش سے بے نیاز ہو کر تاریخی مباحث پر کس طرح قلم اٹھانا چاہیئے، اور کس انداز سے اس کو مرتب کرنا چاہیئے"۔

جس کو مشرق وسطی کی عظیم تحریک اخوان المسلمین نے اپنے تربیتی کورس میں داخل کیا اور سعودی عرب کی وزارت تعلیمات نے اپنے کالجوں کے نصاب میں جگہ دی۔

جو مشرق کے لئے ایک تازیانہ اور مغرب کے لئے ایک چیلنج ہے۔



"ہر مصنف کی طرح اس کتاب کے مصنف کا دل بھی کتاب کی اشاعت و مقبولیت سے قدرتی طور پر مسرور اور مالکِ حقیقی کے شکر کے جذبہ سے معمور و مخمور ہے، ہر مصنف کو شاعر کی طرح (جس کو اپنی ہر غزل عزیز ہوتی ہے) اپنی ہر تصنیف اہم اور مفید معلوم ہوتی ہے، لیکن اس کے کہنے میں کوئی باک نہیں کہ اس کی نظر میں یہ کتاب بہت اہم، فکر انگیز اور توجہ طلب ہے اس لئے کہ وہ ایک ایسے مسئلہ پر لکھی گئی ہے جو وقت کا اہم ترین اور نازک ترین مسئلہ ہے، طبع اول کے حرف آغاز میں لکھا گیا تھا کہ:-

"میرے نزدیک یہی اس وقت مسلم ممالک کا سب سے بڑا اور حقیقی مسئلہ ہے.... اور اسی سوال (کہ مغربی تہذیب کے بارے میں یہ ممالک کیا رویہ اختیار کرتے ہیں اور اپنے معاشرہ کو موجودہ زندگی سے ہم آہنگ بنانے اور زمانہ کے قاہر تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے کون سی راہ اختیار کرتے ہیں اور اس میں کس حد تک ذہانت و جرأت کا ثبوت دیتے ہیں؟) کے جواب پر اس بات کا انحصار ہے کہ دنیا کے نقشے میں ان قوموں کی نوعیت کیا قرار پاتی ہے اور ان ملکوں میں اسلام کا کیا مستقبل ہے؟"

بہت سے اہلِ ذوق واہلِ نظر کا احساس ہے کہ فکر و نظر اور مسلمانوں میں احساسِ خودی پیدا کرنے اور ان کی شخصیت کو ابھارنے کے جس سلسلہ کا آغاز "انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر" سے کیا گیا تھا، اس کی اس کتاب (مسلم ممالک میں اسلامیت و مغربیت کی کشمکش) کے ذریعہ تکمیل کی گئی، اس طرح وہ اس سلسلہ کی پہلی اور یہ اس کی دوسری کڑی ہے۔

مصنف کی کتابوں میں اس کتاب کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ ہر ایڈیشن کے وقت اس پر نظر ثانی اور ان ممالک کی تبدیلیوں کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے، جن کا اس کتاب میں ذکر آیا ہے اس لئے کہ یہ ممالک ابھی سفر میں ہیں، تبدیلی و ارتقا کا عمل ان میں جاری ہے، نئی تحریکیں اور کوششیں، طاقتور فکری اور سیاسی عوامل (FACTORS) کام کرتے رہتے ہیں...... چنانچہ ان تغیر پذیر ممالک پر ضروری نوٹس لکھوا کر ان پر نظر ڈال کر ان کو کتاب میں شامل کیا، اور اب اس کو یہ اطمینان ہو گیا کہ یہ کتاب ان ممالک کے بارے میں اپٹوڈیٹ (UPTO DATE) ہے" ولعل اللہ یحدث بعد ذلک أمرا!"

(از مقدمۂ مصنف)

مجلس تحقیقات و نشریات اسلام پوسٹ بکس ۱۱۹ لکھنؤ